



یہ کتاب برقی شکل میں نشر ہوئی ہے اور شبکہ الامامین الحسنین (علیہما السلام) کے گروہ علمی کی نگرانی میں تنظیم ہوئی ہے

تفسیر نمونہ جلد ۱۰ ہشتم

تفسیر نمونہ، آیہ اللہ العظمیٰ مکارم شیرازی (مدظلہ العالی) کی ۱۵ سالہ زحمات کا نتیجہ ہے جس کو معظم لہ نے اہل قلم کی ایک جماعت کی مدد سے فارسی زبان میں تحریر فرمایا، اس کا اردو اور عربی زبان میں ترجمہ ہو کر شایع ہو چکا ہے۔

تعداد جلد: ۱۵ جلد

زبان: اردو

مترجم: مولانا سید صفدر حسین نجفی (رح)

تاریخ اشاعت: ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ

مصارف زکوٰۃ اور اس کی تفصیلات

اس سلسلے میں تاریخ اسلام میں دو دور نمایاں دکھائی دیتے ہیں ایک مکہ کے قیام کا زمانہ جس میں رسول اکرم او مسلمانوں کی توجہ افراد کی تعلیم و تربیت اور تبلیغ پر لگی ہوئی تھی۔

دوسرا مدینہ منورہ کا ہے جس میں رسول الہ نے حکومت اسلامی کی تشکیل اور تعلیمات اسلامی کو اس صالح حکومت کے ذریعے عملی صورت دینے اور جاری کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

اس میں شک نہیں کہ حکومت کی تشکیل کے وقت ایک ابتدائی اور نہایت ضروری مسئلہ بیت المال کی تشکیل ہے تاکہ اس کے ذریعے حکومت کی اقتصادی ضروریات پوری ہوتی رہیں اور یہ وہ بنیادی ضروریات ہیں جن کا ہر ایک حکومت کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔

البتہ جیسا کہ ہم انشاء الہ اس کے بعد اشارہ کریں گے کہ زکوٰۃ کا حکم پہلے مکہ مکرمہ میں بھی نازل ہوا تھا۔ لیکن اس میں زکوٰۃ کی رقم کا بیت المال میں جمع کرنا واجب نہ تھا۔ بلکہ لوگ اسے خود ادا کرتے تھے۔ لیکن مدینہ منورہ میں اسے جمع کرنے اور مرکزیت دینے کا حکم خداوند عالم کی طرف سے سورہ توبہ کی آیت ۱۰۳ میں نازل ہوا۔

زیر بحث آیت جس کے بارے میں یہ تسلیم شدہ ہے کہ وہ زکوٰۃ حاصل کرنے کو واجب قرار دینے والی آیت کے بعد ہے (اگرچہ قرآن میں اس کا ذکر پہلے بھی کیا گیا ہے) زکوٰۃ کے مختلف مصارف بیان کرتی ہے۔

قابل توجہ یہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں لفظ ”انما“ ہے جو حصر پر دلالت کرتا ہے اور اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بعض خود غرض اور جاہل یہ امید رکھتے تھے کہ وہ استحقاق کے بغیر زکوٰۃ میں سے کچھ حصہ وصول کر لیں مگر لفظ ”انما“ نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ پہلے کی دو آیتوں سے یہی معنی نکلتے ہیں کہ بعض لوگ رسول اللہ پر اعتراض کرتے تھے کہ آپ زکوٰۃ کا کچھ حصہ ہمارے اختیار میں کیوں نہیں دیتے؟ یہاں تک کہ وہ محرومی کی صورت میں آگ بگولہ ہو جاتے لیکن اس کے ملنے پر خوشی کا اظہار کرتے۔

بہر حال مندرجہ بالا آیت واضح طور پر زکوٰۃ کے واقعی اور حقیقی مصارف بیان کر کے تمام بے جا توقعات کو ختم کر رہی ہے اور ان مصارف کی آٹھ قسمیں مقرر کرتی ہے:

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ﴾۔

”عالمین“ زکوٰۃ جمع کرنے والے ﴿وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا﴾۔

یہ جماعت اس عملہ اور کارکنان کی ہے جو زکوٰۃ جمع کرتے اور اسلامی بیت المال کا انتظام و انصرام کرتے ہیں۔ جو کچھ ان کو دیا جاتا ہے وہ درحقیقت ان کی مزدوری ہے۔

”مولفہ قلوبہم“ یعنی وہ لوگ جس میں اسلام کی ترقی کے لئے کوئی مضبوط روحانی جذبہ نہیں ہے لیکن مالی تشویق کے ذریعے ان کی تالیفِ قلوب ہو سکتی ہے ان کی محبت حاصل کی جا سکتی ہے۔ ﴿وَالْمُؤَلَّفَةُ قُلُوبُهُمْ﴾ کی مزید توضیح بعد میں آئے گی۔ ﴿وَفِي الرِّقَابِ﴾۔

یعنی زکوٰۃ کا ایک حصہ ایک غلامی کے خلاف جہاد کرنے اور اسکے خلاف انسانیت کام کو ختم کرنے کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ نیز جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ غلاموں کے بارے میں اسلام کا پروگرام ان کی تدریجی آزادی ہے۔ جس کا آخری نتیجہ تمام غلاموں کو آزادی دلانا ہے۔ بغیر اس کے کہ معاشرے کی طرف سے کوئی ناپسندیدہ ردِ عمل کیا جائے یہ بھی اسی پروگرام کا ایک حصہ ہے کہ زکوٰۃ کا ایک حصہ اس مقصد کے لئے مختص کیا جاتا ہے۔ ﴿وَالْعَارِمِينَ﴾

﴿وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾۔

جیسا کہ ہم مذکورہ آیت کے آخر میں اشارہ کریں گے کہ اس سے مراد تمام راستے ہیں جن سے دین الہی کو وسعت ملتی ہو اور تقویت ملتی ہو، مثلاً جہاد اور تبلیغ وغیرہ۔

﴿وَابْنِ السَّبِيلِ﴾۔

۱۔ فقراء: سب سے پہلے واضح کرتی ہے ”صدقات و زکوٰۃ فقیروں کے لئے“ ۲۔ مساکین ۳۔ ۴۔ ۵۔ غلاموں کو آزاد کرنے والے کے لئے ۶۔ ایسے قرض داروں کے قرض کی ادائیگی جو کسی جرم و خطا کے بغیر قرض کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور اسے ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ۷۔ خدا کے راستے میں ۸۔ وہ جو سفر میں محتاج ہو جائیں یعنی ایسے مسافر جو کسی وجہ سے راستے میں رہ جائیں اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے حسب ضرورت زادِ راہ اور سواری رکھتے ہوں۔

اگرچہ وہ فقیر اور نادار نہ ہوں۔ مگر وہ چوری، بیماری یا مال گم ہونے یا کسی اور سبب سے اس حالت میں مبتلا ہوں۔ اس قسم کے افراد کو زکوٰۃ سے اس قدر رقم دی جائے کہ وہ اطمینان سے منزل مقصود تک پہنچ سکیں۔

آیت کے آخر میں تاکید کے عنوان سے گزشتہ مصارف کے بارے میں فرمایا گیا ہے یہ اللہ کی طرف سے فرض ہے

﴿فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ﴾۔

اس میں شک نہیں کہ یہ فریضہ انتہائی چچا تلا ہے جو فرا اور معاشرے دونوں کی بہتری کے لئے جامع ہے کیونکہ خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ ”فقیر“ اور ”مسکین“ میں فرق:

مفسرین میں اس امر کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ فقیر اور مسکین کا ایک ہی مفہوم ہے۔ اس لئے تاکید کے طور پر مذکورہ بالا آیت میں دو الفاظ آئے ہیں۔ اس بنا پر مصارف زکوٰۃ سات ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ دونوں الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں۔

اکثر مفسرین اور فقہاء نے دوسرے احتمال کو مانا ہے اور اس نظریہ کے طرفداروں نے بھی ان دونوں لفظوں کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے لیکن جو زیادہ قرین نظر معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ فقیر وہ شخص ہے جو زندگی کو تنگی ترشی سے گذارتا ہو باوجود اس کے کہ کوئی کام کاج بھی کرتا ہو اور کبھی کسی سے سوال نہ کرتا ہو لیکن مسکین وہ شخص ہے جو زیادہ ضرورت مند ہو اور کوئی کام بھی نہ کر سکتا ہو اس لئے ہر ایک سے سوال کرتا ہو۔

شاید یہ بات مسکین کی بنیادی معنی سے لی گئی ہے یہ لفظ ”سکون“ کے مادہ سے ہے۔ یعنی اس قسم کا فرد شدید ناداری کی وجہ سے زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان دونوں لفظوں کے استعمال کو قرآن مجید میں دیکھنے سے اسی معنی کی تائید ہوتی ہے چنانچہ ہم سورہ بلد کی آیت ۱۶ میں پڑھتے ہیں: ﴿اَوْ مَسْكِيْنَ ذَا مِرْبَةٍ﴾ یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلائے۔

سورہ نساء کی آیت ۸ میں ہے: ﴿وَ اِذَا خَضَعَ الْقِسْمَةُ اُولَآ الْقَرْبٰی وَاِلْتَمٰی الْمَسٰكِيْنَ فَارْزُقُوْهُمْ﴾ “جس وقت رشتہ دار، یتیم اور مسکین ورثے کے وقت موجود ہو تو اس میں سے کچھ نہ کچھ انھیں دے دو۔ اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ مساکین سے مراد سوالی ہیں جو کبھی کبھی ایسے موقع پر آنکلتے ہیں۔

سورہ قلم کی آیت ۲۴ میں ہے: ﴿اِنْ لَا يَدْ خَلٰنِهَا الْيَوْمَ عَلٰیْكُمْ مَسْكِيْنَ﴾

آج کوئی مسکین تمہاری کھیتی باڑی کے احاطہ میں داخل نہ ہونے پائے۔

جو سوال کرنے والوں کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح ”اطعام مسکین“ یا ”طعام مسکین“ کی تعبیر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ہے جو نشاندہی کرتی ہے کہ مساکین وہ بھوکے لوگ ہیں جو کھانے کے ایک وعدہ تک کہ محتاج ہیں۔

جبکہ فقیر کا لفظ جن جن آیات قرآنی میں آیا ہے ان سے بخوبی یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ ان آبرو مند لوگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو نادار تو ہیں مگر کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے۔
مثلاً سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۳ میں ہے :-

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أَحْصَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسِبُهُمُ الْجَاهِلُ اغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ﴾۔

ایسے فقروں پر خرچ کرنا چاہیے جو خدا کے راستے میں گرفتار ہوئے ہیں اور اپنی ظاہری حالت ایسی اچھی رکھتے ہیں کہ جاہل ان کی عزتِ نفس کو دیکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ وہ مالدار اور خوشحال ہیں۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر کرتے ہوئے اس روایت میں جو محمد بن مسلم نے حضرت امام صادق علیہ السلام یا امام محمد باقر علیہ السلام نے نقل کی ہے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت - سے ”فقیر“ اور ”مسکین“ کے بارے میں سوال کیا گیا، تو آپ نے فرمایا: الفقیر الذی لایسئل و المسکین الذی هو اجهد منه الذی یسئل۔

فقیر وہ ہے جو لوگوں سے سوال نہیں کرتا ہے اور مسکین کی حالت اس سے زیادہ سخت ہوتی ہے وہ ایسا شخص ہے جو لوگوں سے سوال کرتا ہے اور مانگتا ہے۔^(۱)

یہی مضمون ایک دوسری حدیث میں ابو بصیر کے ذریعے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے اور ہر دو احادیث مفہوم مذکورہ بالا کی تصریح کرتی ہیں۔

البتہ کچھ قرائن اس کے خلاف بھی گواہی دیتے ہیں لیکن اگر تمام قرائن پیش نظر رکھیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ حق وہی ہے جو اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔

۲۔ کیا زکوٰۃ آٹھ حصوں میں برابر تقسیم کی جائے گی؟

بعض مفسرین اور فقہاء کا یہ نظریہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کا مال آٹھ حصوں میں مساوی تقسیم کیا جائے اور ہر ایک حصہ اپنے ہی مصرف میں خرچ کیا جائے مگر یہ کہ مالِ زکوٰۃ کی مقدار اتنی کم ہو کہ وہ آٹھ حصوں میں نہ بانٹا جاسکے۔ لیکن فقہاء کی بہت بڑی اکثریت اس نظریہ کی حامی ہے کہ مندرجہ بالا آٹھ اصناف ایسی ہیں کہ جن میں زکوٰۃ کو صرف کیا جاسکتا ہے لیکن ان میں تقسیم کرنا واجب نہیں ہے۔

حضرت رسول اکرم، آئمہ اطہار - اور ان کے اصحاب کی سیرت قطعی بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے علاوہ ازیں چونکہ اسلامی مالیات میں سے ایک مالیہ ہے اور اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اسے رعایا سے وصول کرے اور اس کے نفاذ کا

مقصد بھی یہی ہے کہ اس سے اسلامی معاشرے کی گوناگوں ضروریات پوری ہوں اس لئے فطرتاً اس کے مصرف کی کیفیت آٹھوں مصارف میں سے ایک طرف اجتماعی ضروریات سے وابستہ ہے اور دوسری طرف اسلامی حکومت کی فکر و نظر سے۔

۳۔ زکوٰۃ کس وقت وجب ہوئی تھی؟

قرآن کی مختلف آیات مثلاً اعراف ۱۵۶، نمل ۳، لقمان ۴، سورہ حم السجده آیت ۷ سے جو سب کی سب ملکی ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ وجوب زکوٰۃ کا حکم مکہ مکرمہ میں نازل ہوا اور مسلمان اس اسلامی فرض کی بجا آوری کے پابند تھے لیکن جب رسول اللہ مدینہ منورہ میں تشریف لائے اور اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی تو فطری طور پر بیت المال کے قیام کی ضرورت پڑی چنانچہ خداوند عالم کی طرف سے آپ کو حکم ملا کہ آپ مسلمانوں سے خود زکوٰۃ وصول کریں (نہ کہ وہ خود اپنے رائے اور مرضی سے اسے صرف کریں) آیہ شریفہ:- ﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً﴾

ان کے مال سے زکوٰۃ لو (توبہ - ۱۰۳) اسی موقع پر نازل ہوئی۔

اور مشہور یہ ہے کہ یہ حکم ہجرت کے دوسرے سال میں آیا تھا اس کے بعد زکوٰۃ کے مصارف جزئیاتی تفصیل کے ساتھ اس آیت میں نازل ہوئے جس پر ہم بحث کر رہے ہیں۔ یعنی سورہ توبہ کی آیت ۶۰ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ زکوٰۃ لینے کا حکم آیت ۱۰۳ میں آیا ہے اور اس کے مصارف کا تذکرہ ہجرت کے نویں سال آیت ۶۰ میں ہوا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آیات قرآن کو جمع ترتیب، تاریخ نزول قرآن کے مطابق نہیں ہے بلکہ حکم رسول سے ہر ایک آیت مناسب مقام پر رکھی گئی ہے۔

۴۔ ”مولفۃ قلبہم“ سے مراد کون لوگ ہیں؟

جو کچھ ”مولفۃ قلوبہم“ کی تعبیر سے سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ مصارف زکوٰۃ میں سے کچھ روپیہ ان اشخاص پر خرچ کیا جاتا ہے کی تالیف قلب مقصود ہوتی ہے لیکن کیا ان سے مراد وہ کافر اور غیر مسلم، ہیں جن کو جہاد میں مدد پر آمادہ کرنے کے لئے زکوٰۃ دی جاتی ہے؟ یا اس میں ضعف الایمان مسلمان بھی شامل ہیں؟

جس طرح ہم فقہی مباحث میں کہہ چکے ہیں کہ یہ آیت اور اسی طرح چند ایک روایات جو اس سلسلے میں ہیں ایک وسیع مفہوم رکھتی ہیں۔ اور یہ ان تمام لوگوں کے بارے میں ہیں جن کو مال دینے سے اسلام اور اہل اسلام کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور اس کے صرف کافروں کے لئے ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

۵۔ اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت اور اثر:-

اس امر کے پیش نظر کہ اسلام صرف اخلاقی یا فلسفی اور اعتقادی مکتب فکر کی صورت میں ظاہر نہیں ہوا۔ بلکہ وہ ایک ایسے جامع دستور و آئین کے طور پر ظہور میں آیا ہے جس میں تمام مادی اور روحانی ضروریات کا خیال رکھا گیا ہے۔ نیز جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام نے پیغمبر کے عہد سے ہی حکومت کی بنیاد رکھی، اسی طرح السام محروم لوگوں کی حمایت اور طبقاتی فاصلوں سے جنگ آزمائی پر خاص توجہ دیتا ہے تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ بیت المال اور زکوٰۃ کی کس قدر اہمیت ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ بیت المال کی آمدنی کا ایک سرچشمہ ہے اور یہ اس سلسلے میں اہم ترین کردار کرنے والے امور میں سے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر معاشرے میں ایسے بیکار، بیمار، یتیم، لاوارث اور محتاج و معذور افراد ہوتے ہیں جن کی امداد کرنا از بس ضروری ہے۔

نیز دشمن کے حملے کے وقت سرفروش مجاہدین کی ضرورت ہے جن کے اخراجات حکومت برداشت کرتی ہے۔ اسی طرح اسلامی حکومت کے ملازمین عدلیہ، نشر و اشاعت کے وسیلوں اور دینی مراکز میں سے بھی ہر ایک کے لئے سرمایے کی ضرورت پڑتی ہے جو منظم اور اطمینان بخش مالی وسائل کے بغیر نہیں چل سکتے۔

اسی بنا پر اسلام میں زکوٰۃ جو مالی وسائل کی ایک قسم ہے اور جو آمدنی، تولید مال اور منجمد دولت پر لاگو مالیات میں شمار ہوتی ہے، ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں تک کہ یہ اہم ترین عبادت کے ہم پلہ قرار پائی ہے اور بہت سے مواقع پر اس کا ذکر نماز کے ساتھ ہوا ہے۔ حدیہ ہے کہ زکوٰۃ کو قبولیت نماز کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ روایات اسلامی حکومت کسی شخص یا چند افراد سے زکوٰۃ کا مطالبہ کرے اور وہ حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیں تو وہ شمار ہوں گے اور ان پر پند و نصائح کا کوئی اثر نہ ہو تو ان کے خلاف فوجی کارروائی کرنا بھی جائز ہے۔

چنانچہ ایک روایت میں حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:-

”من منع قیراطاً من الزکوٰۃ فلیس ہو بمؤمن ، ولا مسلم ، ولا کرامة“

جو شخص مال زکوٰۃ سے ایک قیراط (جو کہ چار رتی دانوں کے برابر وزن ہے) نہ دے تو وہ مؤمن ہے اور نہ مسلمان اور نہ

اس کی کوئی قدر و قیمت ہے۔ (۲)

قابل توجہ امر یہ ہے کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں زکوٰۃ کی حدود اس کی مقدار ایسی حکمت کے ساتھ مقرر کی گئی ہے کہ اگر تمام مسلمان مالِ زکوٰۃ کی صحیح اور مکمل ادائیگی کریں تو اسلامی حکومت میں کوئی شخص فقیر اور نادار نہیں رہے گا۔ چنانچہ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ولو ان الناس ادوا زکوٰۃ اموالهم ما بقى مسلم فقيرا محتاجا و ان الناس ما فتقروا، ولا احتاجوا ولا جاعوا، ولا عروا، الا بذنوب الاغنياء

اگر تمام لوگ اپنے مال کی زکوٰۃ دیں تو کوئی مسلمان فقیر و محتاج نہ رہے گا اور لوگ مالداروں کے گناہوں کی وجہ سے ہی فقیر، محتاج اور بھوکے ننگے ہوتے ہیں۔^(۳)

نیز روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی اصل ملکیت کی حفاظت اور اس کی بنیادوں کی مضبوطی کا سبب ہے

اسی طرح اگر لوگ اس اہم بنیادی اسلامی فریضہ کو بھلا دیں تو مختلف گروہوں کے درمیان اس قدر دوری ہو جائے گی کہ اہل ثروت کا مال خطرے میں پڑ جائے گا

حضرت موسیٰ بن جعفر - فرماتے ہیں: حصنوا اموالکم بالزکوٰۃ اپنے مال کی زکوٰۃ دے کر محفوظ کر لو۔^(۴)

یہی مضمون حضرت پیغمبر اکرم اور امیر المومنین علیہ السلام سے بھی دوسری احادیث میں منقول ہے۔ مزید معلوم مات کے لئے وسائل الشیعہ کی چھٹی جلد کے ابواب ایک، تین، چار، اور پانچ کی طرف رجوع فرمائیے۔

۶۔ ”لام“ اور ”فی“ کا فرق:- آخری نکتہ جس کی طرف توجہ ضروری ہے کہ آیت میں چار گروہوں کے ساتھ لفظ ”لام“ لگایا گیا ہے

۱۔ وسائل الشیوہ جلد ۶ ص ۱۴۴ ابواب مستحقین زکوٰۃ باب ۱ حدیث ۲۔

۲۔ وسائل الشیعہ ج ۶، ص ۲۰ باب ۴ حدیث ۹۔

۳۔ وسائل الشیعہ ج ۶ ص ۴ (باب ۱ حدیث ۶ ابواب زکوٰۃ)

۴۔ وسائل ج ۶ ص ۶ (باب ۱ حدیث ۱۱ ابواب زکوٰۃ)

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ﴾۔

یہ عام طور پر ملکیت کی نشانی ہے۔

دوسرے چار گروہوں کے لئے لفظ ”فی“ آیا ہے ﴿وَفِي الرِّقَابِ وَالْعَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَإِنِ السَّبِيلِ﴾۔ یہ ”فی“ زیادہ مصرف کے بیان کے لئے ہے۔^(۱)

مفسرین میں اس اختلاف تعبیر کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ بعض کا نظریہ ہے کہ پہلے چار گروہ زکوٰۃ کے مالک ہیں اور دوسرے چار گروہ مالک نہیں صرف جائز ہے کہ زکوٰۃ ان پر صرف کی جائے۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ تعبیر کا یہ اختلاف ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دوسرے چار گروہ زیادہ مستحق ہیں کیونکہ لفظ ”فی“ ظرفیت کے بیان کے لئے ہے۔ یعنی یہ چار زکوٰۃ کے ظرف ہیں اور زکوٰۃ ان کی مظروف ہے جبکہ پہلے گروہ ایسے نہیں ہیں لیکن ہم نے یہاں ایک اور احتمال کو انتخاب کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ چھ گروہ فقراء، مساکین، عاملین، مولفہ قلوبہم، غارمین اور ابن سبیل جن کا ذکرفی کے بغیر ہے۔ برابر ہیں اور ایک دوسرے پر عطف ہیں اور دوسرے دو گروہ جو کہ ”فی الرقاب“ اور ”فی سبیل اللہ“ ہیں اور جو لفظ ”فی“ کے ساتھ ہیں وہ ایک مخصوص شکل رکھتے ہیں۔ شاید یہ تعبیر کا فرق اس لحاظ سے وہ کہ چھ گروہ تو مالک زکوٰۃ ہو سکتے ہیں اور خود اور خود انھیں زکوٰۃ دی جا سکتی ہے (یہاں تک کہ ایسے مقروض لوگ جو اپنا قرض ادا نہ کر سکیں البتہ اس صورت میں جبکہ یہ اطمینان ہو کہ وہ اسے اپنے قرض کی ادائیگی خرچ کریں گے) لیکن باقی دونوں زکوٰۃ کے مالک نہیں ہوں گے۔ اور نہ خود انھیں دی جائے گی بلکہ ان کے لئے خرچ کی جائے گی۔ مثلاً غلاموں کو مال زکوٰۃ سے خرید کر آزاد کیا جائے۔ واضح ہے کہ اس طرح زکوٰۃ کے مالک نہیں ہوں گے۔۔ اسی طرح وہ موقع کہ جو ”فی سبیل اللہ“ کے مفہوم میں آتے ہیں۔ مثلاً جہاد کا ساز و سامان اور اسلحہ مہیا کرنا یا مسجد بنانا اور دینی مراکز قائم نہں۔ اس قسم کے امور میں کوئی بھی زکوٰۃ کا مالک نہیں ہے بلکہ وہ اس کے مصرف ہیں۔ غرضیکہ تعبیر کا یہ فرق اس بات کو بخوبی واضح کرتا ہے کہ قرآنی تعبیرات کس قدر چچی تلی ہیں۔

۱۔ خیال رہے کہ دو مقامات پر ”فی“ صراحت کے ساتھ ہے اور دو جگہ محجور ”فی“ پر عطف ہے۔ جیسے ”لام“ کا ایک جگہ پر ذکر ہے اور باقی اسی پر عطف ہے۔

آیت ۶۱

۶۱- ﴿وَمِنْهُمْ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ قُلْ أُذُنٌ خَيْرٌ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾۔

ترجمہ

۶۱- ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو پیغمبر کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ خوش باور اور ہمہ تن گوش ہیں۔ کہہ دو کہ اس کا خوش فہم ہونا تمہارے فائدے میں ہے (لیکن جان لو) وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے اور (صرف) مومنین کی تصدیق کرتا ہے اور تم میں سے ان لوگوں کے لئے رحمت ہے جو ایمان لائے ہیں۔ جو لوگ اللہ کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

یہ خوبی ہے عیب نہیں

آیت مذکورہ کی کئی ایک شانِ نزول بیان کی گئی ہے۔ جو ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ آیت منافقین کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ لوگ ایک دوسرے کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت رسول اکرم کے متعلق نازیبا اور ناپسندیدہ باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا ”ایسا کرو“ کیونکہ ہمیں یہ خوف ہے کہ کہیں یہ باتیں محمد کے کان تک نہ پہنچ جائیں اور کہیں وہ ہمیں جرابھلا نہ کہے (اور لوگوں کو ہمارے خلاف نہ ابھارے) ان میں سے ایک نے جس کا نام ”جلّاس“ تھا کہا کہ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے ہم جو چاہیں گے اور اگر اس کے کانوں تک یہ بات پہنچ گئی تو ہم اس کے پاس جائیں گے اور انکار کر دیں گے اور وہ ہماری بات قبول کر لیں گے کیونکہ محمد خوش باور اور قول کو تسلیم کرنے والا ہے اور جو شخص جو بات بھی کہے اسے قبول کر لیتا ہے۔ اس وقت آیت بالا نازل ہوئی اور اس کے ذریعے انھیں جواب دیا گیا۔

تفسیر

اس آیت میں جیسا کہ اس کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے ایک یا کئی افراد کے بارے میں گفتگو ہے جو پیغمبر اکرم کو اپنی باتوں سے تکلیف پہنچاتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ خوش باور اور قول کا اعتبار کرنے والا ہے ﴿وَمِنْهُمْ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ﴾۔

”اذن“ اصل میں کان کے معنی میں ہے ان لوگوں کو جو دوسروں کی باتیں بڑی توجہ سے سنتے ہیں اور اصطلاحاً (فارسی میں) انھیں ”گوشی“ کہتے ہیں ان کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔^(۱)

وہ لوگ حقیقت میں رسول اکرم کی ایک خوبی کو جس کا ایک رہبر میں ہونا نہایت ضروری ہے، ایک برائی کے لباس میں پیش کرتے تھے اور وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ ایک محبوب رہبر کے لئے ضروری ہے کہ انتہائی لطف و محبت کا مظاہرہ کرے اور جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو عذر اور معذرت کو قبول کرے اور ان کے عیب چھپائے۔ مگر وہاں نہیں جہاں اس کا برا اثر پڑے۔ اسی لئے قرآن اس کے فوراً بعد فرمایا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اگر پیغمبر تمہاری باتوں کی طرف کان دھرتا ہے اور تمہارے عذر قبول کرتا ہے اور تمہارے گمان میں ہمہ تن گوش اور جلدی اعتماد کرنے والا ہے، تو یہ بات تمہارے فائدے میں ہے ﴿فَلْأَذُنُ حَیْرٍ لَّكُمْ﴾۔ کیونکہ اس طرح وہ تمہاری عزت و آبرو کی حفاظت کرتا ہے اور تمہارے وقار کو ٹھیس نہیں لگاتا اور تمہارے خیالات و جذبات کو مجروح نہیں کرتا اور اس طریقے سے تمہاری محبت، اتحاد اور وحدت کے لئے کوشاں ہے۔

کیونکہ اگر وہ فوراً پردہ اٹھا دیتا اور جھوٹوں کو ذلیل و رسوا کرتا تو تمہارے لئے بڑی کٹھن صورت حال ہوتی۔ علاوہ ازیں اگر ایک جماعت کے عزت و آبرو ختم ہو جاتی تو پھر اس کے لئے توبہ اور بازگشت کا راستہ بند ہو جاتا۔ اور وہ گنہ گار لوگ جو ہدایت کے قابل تھے بدکاروں کی صف میں جا کھڑے ہوتے اور پیغمبر کے پاس سے دور ہوتے جاتے۔

ایک ہمدرد اور مہربان قائد کو جبکہ وہ پختہ کار اور دانا بھی ہے، ان سب باتوں کو سمجھنا چاہیے لیکن ایسی بہت سی چیزوں کو زبان پر نہیں لانا چاہیے تاکہ وہ افراد جو تربیت کی اہلیت رکھتے ہیں انکی تربیت ہو جائے اور اس کے مکتب سے نہ بھاگیں اور لوگوں کے اسرار بھی ظاہر نہ ہوں۔ اس کا آیت کے معنی میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ خدا عیب جوئی کرنے والوں کے جواب میں کہتا ہے:

”ایسا نہیں ہے کہ وہ سب کی باتوں کو قابل اعتنا سمجھتا ہے بلکہ سمجھتا ہے بلکہ وہ ایسی باتوں پر کان دھرتا ہے جو تمہارے فائدے میں ہوں یعنی خدا کی وحی کو سنتا ہے، مفید تجویز پر کان دھرتا ہے اور لوگوں کی عذر خواہی ایسے مواقع پر قبول کرتا ہے جبکہ وہ ان کے اور معاشرے کے مفاد میں ہو“^(۲)

اس کے بعد اس وجہ سے کہ عیب جوئی کرنے والے کہیں اس بات سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں اور اسے سند قرار نہ دے لیں یہ اضافہ فرماتا ہے: وہ خدا اور اس کے احکامات پر ایمان رکھتا ہے اور سچے مومنوں کی باتوں پر کان دھرتا ہے، انھیں قبول کرتا اور ان پر اقدام کرتا ہے ﴿يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾۔

یعنی حقیقت میں پیغمبر دو قسم کے پروگرام رکھتے ہیں ایک ظاہر کی محافظت اور پردہ دری سے اجتناب اور دوسرا عمل کا مرحلہ۔ پہلے مرحلے میں آپ سب کی باتوں کو سنتے ہیں اور بظاہر انکار نہیں۔ لیکن عمل کے مقام میں ان کی توجہ صرف احکاماتِ خدا اور سچے مومنین کی تجاویز اور باتوں کی طرف ہوتی ہے اور حقیقت پسند قائد کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ معاشرے کے مفادات کا تحفظ اس طریقے کے بغیر ممکن نہیں اس لئے خداوندِ عالم بلا فاصلہ فرماتا ہے: وہ تم میں سے مومنین کے لئے رحمت ہے ﴿وَرَحْمَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ﴾۔

اس مقام پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ہم چند آیات میں پڑھتے ہیں کہ پیغمبر رحمۃ للعالمین ہیں (سورہ انبیاء ۱۰۷) لیکن مذکورہ آیت کہتی ہے کہ آپ صرف مومنین کے لئے رحمت ہیں۔ کیا وہ عمومیت اس تخصیص کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے؟ مگر ایک نکتہ کی طرف توجہ دینے دے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ رحمت کے کئی درجات اور مراتب ہیں جن میں ایک مرتبہ قابلیت اور استعداد ہے اور دوسرا مرتبہ فعلیت ہے۔ مثلاً بارش اللہ کی رحمت ہے یعنی یہ قابلیت اور اہلیت اس کے سبب قطروں میں پائی جاتی ہے کہ وہ خیر و برکت، نشو و نما اور حیات کا سبب بنیں۔ لیکن یہ تسلیم شدہ ہے کہ اس رحمت کے آثار کا ظہور صرف انہی زمینوں پر ہوتا ہے جو اس کے قابل ہوں اس وجہ سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بارش کے سبب قطرے ”رحمت“ ہیں اور یہ کہنا بھی درست ہے کہ بارش کے یہ قطرے اہل اور قابل زمینوں کے لئے باعثِ رحمت ہیں۔ پہلا جملہ اہلیت اور قابلیت کی طرف اور دوسرا جملہ وجود اور فعلیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی طرح حضرت پیغمبر اکرم قابلیت اور استعداد کی رو سے تمام جہانوں کے لئے رحمت ہیں لیکن آپ عملی طور پر مومنین کے لئے مخصوص ہیں۔

اب یہاں پر ایک چیز باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگ رسول اللہ کو اپنی باتوں سے اذیت و تکلیف پہنچاتے ہیں اور ان کی عیب جوئی کرتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ سزا سے بچ جائیں گے یہ ٹھیک ہے کہ حضرت رسول اکرم ان کے بارے میں ایک ذمہ داری رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ بزرگانہ اور فرخاندانہ برتاو کریں اور انھیں رسوا نہ کریں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے اعمال کی سزا نہ پائیں گے۔ لہذا آیت کے آخر میں قرآن فرماتا ہے: وہ لوگ جو رسولِ خدا

کو اذیت و تکلیف پہنچاتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾۔

۱۔ اردو میں اسے ”ہمتن گوش“ بھی کہا جاتا ہے۔ (مترجم)

۲۔ در حقیقت تفسیر اول کی بنا پر ”اذن خیر“ جو کہ مضاف مضاف الیہ ہے، صفت موصوف کی طرف اضافت کی قسم سے ہے اور دوسری تفسیر کی بنا پر وصف کی طرف اجافت کے قبیل سے ہے۔ پہلے احتمال کی بنا پر عبارت کے معنی اس طرح ہوں گے ”وہ تمہارے لئے بات کو قبول کرنے والا اور اچھا سخن پذیر ہے اور دوسرے احتمال کی بنا پر اس کا مفہوم یہ ہے ”وہ اچھی باتوں کو تمہارے فائدے اور نفع کے لئے سنتا ہے“۔

آیات ۶۲، ۶۳

۶۲۔ ﴿يَخْلُقُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيُرْضَوْكُمْ وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضَوْهُ إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ﴾۔

۶۳۔ ﴿أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّهُ مَنْ يُخَادِدُ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَأَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا ذَلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ﴾۔

ترجمہ

۶۲۔ وہ تمہارے سامنے خدا کی قسم کھاتے ہیں تاکہ تمہیں کو رکھیں حالانکہ زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کو راضی کریں اگر (وہ سچ کہتے ہیں اور) ایمان رکھتے ہیں۔

۶۳۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ جو شخص خدا اور اس کے رسول کے ساتھ دشمنی کرے، اس کے لئے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا یہ ایک بڑی رسوائی کی بات ہے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر نظر دونوں آیتیں گذشتہ آیت کی تکمیل کرتی ہیں اور یہ طبعاً اور فطرتاً اسی سلسلے میں نازل ہوئی ہیں۔ لیکن مفسرین کی ایک اور جماعت نے ان دونوں آیات کے بارے میں ایک اور شانِ نزول نقل کی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب جنگِ تبوک کی مخالفت کرنے والوں اور پیچھے رہ جانے والوں کی مذمت میں آیات نازل ہوئیں تو منافقوں میں سے ایک نے کہا: خدا کی قسم! یہ لوگ ہمارے بزرگ اور اشراف ہیں اور جو کچھ محمد ان کے بارے میں کہتا ہے سچ ہے تو پھر یہ چوپایوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔

ایک مسلمان نے یہ بات سن کر کہا: خدا کی قسم! جو کچھ آنحضرت کہتے ہیں وہ حق ہے اور تو چوپائے سے بھی بدتر ہے۔ جب یہ بات رسول اکرم کے پاس پہنچی تو آپ نے کسی کو اس منافق کو بدلانے کے لئے بھیجا اور اس سے پوچھا کہ تو نے یہ بات کیوں کہی ہے؟ تو اس نے قسم کھا کر کہا: میں نے یہ بات نہیں کہی۔

وہ مرد مومن جو اس کے خلاف تھا اسی نے یہ بات جا کر حضور سے کہی تھی اس نے دعا کی:۔ تو خود سچے کی تصدیق اور رجھوٹے کی تکذیب فرما۔

اس وقت یہ آیات مندرجہ بالا نازل ہوئیں اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔

منافقین کی ایک نشانی

منافقین کی ایک اور کھلی نشانی اور عمل بد یہ ہے جس کی طرف قرآن اشارہ کر رہا ہے کہ وہ اپنی بدکرداری کو چھپانے کے لئے اپنی بہت سی کرتوتوں کا انکار کر دیتے ہیں اور چاہتے ہیں اور چاہتے تھے کہ جھوٹ موٹ قسموں کے ذریعے لوگوں کو دھوکا دیتے رہیں اور انھیں اپنے آپ سے راضی رکھیں۔

مندرجہ بالا آیتوں میں ایک طرف قرآن اس بر عمل سے پردہ اٹھا کر ان کو ذلیل کرتا ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کو بت ا دیتا ہے کہ وہ ان کی جھوٹی قسموں میں نہ آئیں۔ پہلے کہتا ہے: وہ تمہارے سامنے خدا کی قسم کھاتے ہیں تاکہ تمہیں خوش رکھیں ﴿يَخْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ﴾۔

ظاہر ہے کہ ان قسموں سے ان کا مقصد حقیقت بیان کرنا نہیں ہے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ مکرو فریب سے حقیقت کا چہرہ تمہاری نظروں میں مسخ کر دیں اور اپنا مقصد حاصل کر لیں۔ اگر ان کا نصب العین اور مقصد یہ ہوتا کہ واقعاً سچے مومنین کو اپنے سے راضی کریں تو اس سے زیادہ ضروری یہ تھا کہ وہ خدا اور اس کے پیغمبر کو راضی کر لیں۔ حالانکہ انھوں اپنے کردار اور عمل سے خدا و رسول کو سخت ناراض کیا ہے۔ لہذا قرآن کہتا ہے: اگر وہ سچ کہتے ہیں اور ایماندار ہیں تو مناسب یہ ہے کہ وہ خدا اور پیغمبر کو راضی کریں ﴿وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ﴾۔

قابل غور امر یہ ہے کہ اس جملے میں چونکہ خدا اور اس کے رسول کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے تو قاعدے کے لحاظ سے میر کو تثنیہ ہونا چاہئیے لیکن اس کے باوجود ضمیر ”واحد“ استعمال ہوئی ہے (مراد میر ضوہ کی ضمیر ہے) حقیقت میں اس تعبیر کا اشارہ اس طرف ہے کہ پیغمبر کی رضا اور خدا کی رضا جدا جدا نہیں ہے اور رسول اسی چیز کو پسند کرتے ہیں جسے خداوند عالم پسند کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ”توحید افعالی“ کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ رسول اللہ خدا کے مقابلے میں اپنی طرف سے استقلال نہیں رکھتے۔ ان کی خوشی اور ناراضی سب خدا کے لئے ہے۔ ان کا سب کچھ اس کے لئے اور اس کی راہ میں ہے۔

چند ایک روایات میں ہے کہ پیغمبر اکرم کے زمانے میں ایک شخص نے اثنائے گفتگو میں یوں کہا:

من اطاع الله ورسوله فقد فاز و من عصا هما فقد غوى

جس نے خدا اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کی وہ کامیاب ہوا اور جس نے ان دونوں کی مخالفت کی وہ گمراہ ہوا

جب پیغمبر نے یہ بات سنی کہ اس نے خدا اور پیغمبر کو ایک درجے میں رکھا ہے اور تثنیہ کی ضمیر استعمال کی ہے تو آپ

پریشان ہو گئے اور فرمایا: بئس الخطيب انت هلا قلت من عصى الله ورسوله

تم برے خطیب ہو تم نے اس طرح کیوں نہیں کہا کہ جو شخص خدا اور اس کے پیغمبر کی نافرمانی کرے (بلکہ تم نے تثنیہ کی ضمیر استعمال کی ہے اور کہا ہے کہ جو ان دونوں کو حکم نہ مانے)۔^(۱)

اس کے بعد کی آیت میں قرآن ایسے منافقوں کو سخت دھمکی دیتا ہے اور کہتا ہے: ”کیا وہ نہیں جانتے کہ جو خدا اور اس کے رسول کی مخالفت اور دشمنی کرے اس کے لئے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا ﴿أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّهُ مَن يُحَادِدِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَأَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا﴾۔ اس کے بعد تاکید کے طور پر فرماتا ہے: یہ بڑی ذلت و رسوائی ہے ﴿ذَلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ﴾۔

”محادو“ محادۃ کے مادہ سے ہے اور ”حد“ کی اصل سے ہے جو کنارہ، طرف اور کسی چیز کی انتہا کے معنی میں آتا ہے۔ چونکہ مخالفت اور دشمنی افراد ایک دوسرے کے مد مقابل ہوتے ہیں اس لئے یہ ”محادۃ“ کا مادہ عداوت اور دشمنی کا مفہوم رکھتا ہے جیسا کہ ہم روزمرہ کی گفتگو میں لفظ ”ظرفیت“ مخالفت اور دشمنی کے معنی میں بولتے ہیں۔

۱۔ تفسیر ابو الفتح رازی، آیہ مذکورہ کے ذیل میں۔

آیات ۶۴، ۶۵، ۶۶

۶۴۔ ﴿يَخَذِرُ الْمُنَافِقُونَ أَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ قُلْ اسْتَهِزُّوا إِنَّ اللَّهَ مُخْرِجٌ مَا تَحْذَرُونَ﴾۔

۶۵۔ ﴿وَلَيْنَ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ﴾۔

۶۶۔ ﴿لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ إِنَّ نَعْفَ عَنْ طَائِفَةٍ مِنْكُمْ يُعَذِّبُ طَائِفَةٌ بَأْتَهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ﴾۔

ترجمہ

۶۴۔ منافقین اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی آیت کے خلاف نازل نہ ہو جائے جو ان کے دلوں کے بھیدوں کی انہیں خبر دے دے۔ کہہ دیجئے کہ آستہزاء اور مذاق کر لو۔ جس کا تمہیں ڈر ہے خدا اسے ظاہر کرے گا۔

۶۵۔ اگر تم ان سے پوچھو (کہ تم یہ برے کام کیوں کرتے ہو) تو وہ کہتے ہیں کہ ہم مذاق کرتے ہیں تو کہہ دو کہ کیا تم خدا، اس کی آیات اور اس کے پیغمبر کا مذاق اڑاتے ہو؟

۶۶۔ (کہہ دو) معذرت نہ کرو (کیونکہ وہ فضول ہے اس لئے کہ) تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے ہو۔ اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو (توبہ کرنے کی وجہ سے معاف کر دیں تو دوسرے گروہ کو عذاب میں مبتلا کریں گے کیونکہ وہ مجرم تھے۔

شان نزول

مذکورہ بالا آیتوں کی مختلف شان نزول نقل ہوئی ہے ان سب کا تعلق جنگ تبوک کے بعد منافقوں کی حرکتوں اور شرارتوں سے ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ منافقوں کی ایک جماعت نے خفیہ میسنگ میں حضرت رسول اکرم کے قتل کی سازش کی۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ جنگ تبوک سے واپسی پر راستے کی ایک گھاٹی میں چپکے سے صورت بدل ک گھات میں رہیں گے اور جب رسول اللہ اپنی اونٹنی پر گزریں گے تو اونٹنی کو بدکائیں گے اور رسول اللہ کو قتل کر دیں گے۔ خدا نے اپنے پیغمبر کو اس سازش کو اطلاع کر دی۔

آپ نے حکم دیا کہ مسلمانوں کا ایک گروہ نگرانی کرے اور ان لوگوں کو تتر بتر کر دے جب حضرت رسول اکرم اس گھاٹی پر پہنچے تو آپ کی اونٹنی کی مہار حضرت عمار کے ہاتھ میں تھی اور حذیفہ اسے پیچھے سے ہانک رہے تھے۔ رسول اللہ نے حذیفہ سے فرمایا کہ ان کی سواریوں کے منہ پر (چابک) مارو اور انہیں بھگا دو۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ جب آپ گھاٹی سے صحیح سلامت نکل آئے تو حضرت نے حذیفہ سے فرمایا تو نے انہیں پہچانا نہیں؟ تو اس نے عرض کیا ”نہیں میں نے تو ان میں سے کسی کو نہیں پہچانا۔ اس کے بعد حضرت پیغمبر ان سب کے نام گنوائے۔ حذیفہ نے عرض کیا جب صورت

حال یہ ہے تو آپ ایک گروہ کو کیوں یہ حکم نہیں دیتے کہ وہ جا کر انھیں قتل کر دے۔ آپ نے فرمایا: میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ عرب یہ کہیں کہ محمد اپنے ساتھیوں پر کامیاب ہو گیا تو انھیں قتل کرنا شروع کر دیا۔

یہ شان نزول حضرت امام محمد باقرؑ سے نقل ہوئی ہے اور حدیث و تفسیر کی بہت سی کتابوں میں آئی ہے۔ ایک دوسری شان نزول یہ لکھی ہے کہ جب منافقوں نے جنگ تبوک میں دشمن کے مقابلے میں حضرت کی جگہ دکھی تو مذاق کے طور پر کہنے لگے کہ یہ شخص گمان کرتا ہے کہ شام کے محل اور شامیوں کے مضبوط قلعے فتح کرے گا، یہ تو قطعی طور پر محال ہے۔

خداوند عالم نے اپنے پیغمبر کو اس واقعہ کی خبر دی تو آپ نے حکم دیا کہ اس گروہ کا راستہ بند کر دیا جائے اس کے بعد آپ نے انھیں بلایا اور لعنت ملا مت کی اور فرمایا کہ تم نے لوگوں سے یہ باتیں کی ہیں انھوں نے معافی مانگی کہ اس سے ہمارا کوئی خاص مقصد نہ تھا ہم تو مذاق کر رہے تھے اور اس بات پر قسم کھائی۔

منافقین کا خطرناک پرگرام

گذشتہ آیات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ منافق کس طرح قوت کے اسباب کو کمزوری کے ذرائع سمجھتے تھے اور مسلمانوں میں تفرقہ اور اختلاف ڈالنے کے لئے پروپیگنڈے کرتے تھے۔ جن آیات پر بحث کی جا رہی ہے ان میں ان کے منصوبوں اور طریق کار کے ایک اور حصے کی طرف اشارہ ہے پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا پیغمبر اکرم کو منافقوں کی سازشوں سے بچانے کے لئے بعض اوقات ان کے اسرار سے پردہ اٹھا دیتا ہے اور ان سے مسلمانوں کی جماعت کو آگاہ کر دیتا تھا تاکہ وہ چوکے ہو جائیں اور ان کے دھوکے میں نہ آئیں اور وہ بھی اپنی حیثیت کی طرف متوجہ رہیں اور اپنے دست و پا سمیٹ کر رکھیں۔ اس وجہ سے منافق اکثر اوقات خوف زدہ اور حیران و پریشان رہتے تھے۔ چنانچہ قرآن ان کی اس حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

منافق ڈرتے ہیں کہ ان کے خلاف کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو اس سے انھیں (مسلمانوں کو) آگاہ کر دے

﴿يَخْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَنْ تُنْزَلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ﴾۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ پھر بھی انتہائی دشمنی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے پیغمبر کے کاموں کا مذاق اڑانے سے باز نہیں آتے تمسخر اڑانے کا سلسلہ ترک نہیں کرتے لہذا خدا اس آیت کے آخر میں اپنے پیغمبر سے فرماتا ہے: ان سے کہہ

دو تم سے جتنا ہو سکے مذاق اڑاؤ، لیکن جان لو کہ جس چیز کا تمہیں خوف ہے خدا اسے ظاہر کر دے گا اور تمہیں ذلیل و رسوا کر کے رہے گا ﴿قُلْ اسْتَهِزُّوْا اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ﴾۔

البتہ استہزؤا“ (ہنسی مذاق اڑاؤ) تہدید کی قبیل سے فعل امر ہے جیسے انسان اپنے دشمن سے کہتا ہے۔ جس قدر دکھ تکلیف تو پہنچا سکتا ہے پہنچا لے ہم اس کا ایک ہی مرتبہ جواب دیں گے۔ اس قسم کی باتیں دھمکی کے موقع پر کی جاتی ہیں۔ ضمنی طور پر توجہ دیکھئے تو اوپر والی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ منافق دل میں پیغمبر کی دعوت کی سچائی کو اچھی طرح جانتے تھے اور خدا سے آنحضرت کے ارتباط سے وہ خوب واقف تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہٹ دھرمین اور دشمنی کی وجہ سے ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی بجائے مخالفت کرتے تھے۔ اسی وجہ سے قرآن کہتا ہے: منافقوں کو اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں ان کے خلاف قرآنی آیات نازل ہوں اور ان کے دلوں میں چھپے ہوئے رازوں کو طشت ازبام کر دیں۔

اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ ”﴿تَنْزِلٌ عَلَيْهِمْ﴾“ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس قسم کی آیتیں منافقین پر نازل ہوتی تھیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ ان کے بارے اور ان کے خلاف تھیں اگرچہ حضرت رسول اکرم پر نازل ہوتی تھیں۔ خدا اس کے بعد میں آنے والی آیت میں منافقین کے ایک اور منصوبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:-

”اگر ان سے پوچھو کہ تم نے اس قسم کی غلط بات کیوں کی ہے اور اس قسم کی غلط حرکت کیوں کی ہے؟ تو کہتے ہیں کہ ہم دل لگی اور ہنسی مذاق کرتے تھے اور اس سے ہماری کوئی غرض نہ تھی ﴿وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ﴾۔“^(۱)

اصل میں یہ ایک انوکھی راہ فرار تھی۔ سوچ سمجھ کر سازشیں کرتے تھے اور زہریلی باتیں اس ارادے سے کرتے کہ ان کا راز ظاہر نہ ہو اور ان کا منحوس مقصد پورا ہو گیا تو اپنی دلی مراد پالیں گے اور اگر بھانڈا پھوٹ گیا تو اپنے آپ کو ہنسی مذاق کے پردے میں چھپالیں گے اور جھوٹ موٹ بہانہ بازیاں کر کے رسول اکرم اور لوگوں کی طرف سے سزا اور رد عمل سے بچ جائیں گے۔

اس زلے کے منافق بلکہ ہر زمانے کے منافقوں کے منصوبے ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں اس طریقے سے وہ بہت سے فائدے اٹھاتے ہیں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جن مقاصد کے وہ سختی سے پابند ہوتے ہیں انہیں عام مذاق

اور دل لگی کے لباس میں پیش کرتے ہیں اگر اپنا مقصد پایا تو کیا کہنے ورنہ مذاق اور خوش طبعی کے بہانے سزا کے چنگل سے بچ جاتے ہیں۔

لیکن قرآن ابھی یقینی سزا دینے کا اعلان کرتا ہے اور رسالت مآب کو حکم دیتا ہے کہ ان سے کہہ دو کیا تم خدا، اس کی آیتوں اور اس کے رسول کا مذاق اڑاتے ہو اور اس سے استہزا اور دل لگی کرتے ہو ﴿قُلْ أَلَا لِلّٰهِ آيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ﴾۔ یعنی کیا ہر ایک سے مذاق کیا جاسکتا ہے، یہاں تک کہ خدا، پیغمبر اور آیات قرآن کے ساتھ بھی؟ کیا پختہ ترین اسلامی اصول بھی ہنسی مذاق کے لائق ہیں؟ کیا حضرت رسول کرام کی اونٹنی ک و بدکانا اور بھگانا اور اس خطرناک گھاٹی میں پیغمبر کا گرنا۔ ایسی چیزیں ہیں جن کو مذاق کے پردے میں چھپایا جاسکے؟

یا آیات خداوندی کا مذاق اڑانا اور پیغمبر کی آئندہ کامیابیوں کی پیش گوئیوں پر پھبتیاں کسنا بھی مزاح سمجھا جاسکتا ہے یہ سب باتیں گواہی دیتی ہیں کہ وہ خطرناک ارادے رکھتے تھے جنہیں ان پردوں میں چھپانا چاہیے تھے۔ اس کے بعد خداوند عالم نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا ہے ہ منافقوں سے صراحت کے ساتھ کہہ دو کہ ”ان فضول اور جھوٹے حیلے بہانوں سے باز آ جاو“ ﴿لَا تَعْتَذِرُوا﴾۔

”کیونکہ تم نے ایمان کے بعد کفر کی راہ اختیار کر لی ہے ﴿قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ﴾۔

اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ بالا گروہ سے منافقوں کی صف میں نہ تھا بلکہ یہ لوگ کمزور ایمان رکھنے والوں کی صف میں تھے لیکن مندرجہ بالا واقعہ کے بعد انھوں نے کفر کا راستہ اختیار کر لیا۔

مندرجہ بالا جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ جماعت اس سے پہلے بھی منافقوں کے صف میں داخل تھی لیکن کیونکہ ان سے ظاہر بظاہر کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی اس لئے پیغمبر اور مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ ان سے مومنوں کا سا سلوک کریں لیکن جب جنگ تبوک کے واقعہ کے بعد ہٹا اور ان کا کفر و نفاق ظاہر ہو گیا تو انھیں اس امر سے خبردار کیا گیا کہ تم آئندہ مومنین کی صف میں شمار نہ ہو گے۔ آخر کار آیت کو اس جملے پر ختم کیا گیا ہے: اگر ہم تم سے ایک جماعت کو بخش دیں تو دوسرے گروہ کو اس بنا پر کہ وہ مجرم ہے سزا دیں گے ﴿إِنْ نَعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا

مُجْرِمِينَ﴾۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ ہم ایک گروہ کو ان کے جرم و خطا کی پاداش میں سزا دیں گے یہ اس بات کی دلیل ہے ایسے لوگ قابل معافی ہیں جنھوں نے گناہ اور جرم کی نشانیوں کو توبہ کے پانی سے دھو ڈالا ہے۔ آئندہ آیات مثلاً آیات مثلاً آیہ ۷۴ میں بھی اس بات کا قرینہ پایا جاتا ہے۔ اس آیت کے ضمن میں بہت سی روایتیں ہیں جو اس امر کی حمایت کرتی ہیں کہ

ان منافقوں میں سے جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہو چکا ہے بعض اپنے کئے پر پشیمان ہوئے اور انھوں نے توبہ کی۔ لیکن کچھ دوسرے منافقو اپنے طریقے پر ڈٹے رہے۔ مزید وضاحت کے لئے تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۲۳۹ ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ ”خوض“ (بروزن ”خوض“) جیسا کہ کتب لغت میں ہے، آہستہ آہستہ پانی میں داخل ہونے کے معنی میں ہے بعد ازاں بطور کنایہ مختلف کاموں میں داخل ہونے کے معنی میں بولا جانے لگا لیکن قرآن میں زیادہ تر ہر کام شروع کرنے یا قبیح اور بری باتوں کا سلسلہ شروع کرنے کے مفہوم میں آیا ہے۔

آیات ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰

۶۷- ﴿الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾-

۶۸- ﴿وَعَدَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا هِيَ حَسْبُهُمْ وَلَعْنَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ عَذَابٌ مُقِيمٌ﴾-

۶۹- ﴿كَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَ أَكْثَرَ أَمْوَالاً وَ أَوْلَاداً فَاسْتَمَعُوا بِخِلَافِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخِلَافِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخِلَافِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوا أُولَئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾-

۷۰- ﴿أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَقَوْمِ إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَاتِ أَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾-

ترجمہ

۶۷- منافق مرد اور عورتیں سب ایک ہی گروہ سے ہیں وہ برے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور اچھے کاموں سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو (سخاوت اور بخشش سے) باندھ لیتے ہیں انھوں نے خدا کو فراموش کر دیا ہے اور خدا نے ان کو بھلا دیا ہے (اس نے اپنے رحمت ان سے منقطع کر لی ہے) یقیناً منافق فاسق ہیں۔

۶۸- خدا نے منافق مردوں اور عورتوں اور کافروں کے لئے جہنم کی آگ کا وعدہ کیا ہے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہی ان کے لئے کافی ہے اور خدا نے انھیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور ان کے لئے ہمیشہ کا عذاب ہے۔

۶۹- (تم منافق لوگ) ان افراد کی طرح ہو جو تم سے پہلے تھے (اور انھوں نے نفاق کا راستہ اختیار کیا تھا) وہ تم سے زیادہ طاقتور تھے اور مال اور اولاد کے لحاظ سے تم سے بڑے تھے۔ انھوں نے (دنیا میں ہوا و ہوس اور گناہ کے ذریعے) اپنے حصے سے استفادہ کیا۔ تم نے بھی (اسی طرح) اپنے حصے سے استفادہ کیا ہے جیسا کہ انھوں نے استفادہ کیا تھا تم (کفر، نفاق اور مومنین کا مذاق اڑانے میں) مگن ہو جیسے وہ مگن تھے (لیکن آخر کار) ان کے اعمال دنیا اور آخرت میں بلیا میٹھ و گئے اور وہ خسارہ میں ہیں۔

۷۰۔ کیا انھیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے تھے۔ قومِ نوح۔، عادِ ثمود اور براہیم کی قوم اور اصحابِ مدین (قومِ شعیب) اور وہ شہر جو تہ و بالا ہوئے تھے (قومِ لوط) کہ جن کے پیغمبر ان کی طرف روشن اور واضح دلیلوں کے ساتھ آئے تھے (لیکن انھوں نے پیغمبروں کی کوئی بات نہ مانی) خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں خود اپنے آپ پر ظلم کیا۔

منافقوں کی نشانیاں

ان آیتوں میں بھی اسی طرح منافقین کے چال چلن اور نشانیوں کے بارے میں بحث ہے۔ پہلی زیر بحث آیت میں خداوند عالم ایک امر کلی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ ہو سکتا ہے کہ نفاق کی روح مختلف شکلوں میں ظاہر ہو اور مختلف چہروں میں دکھائی دے ہو سکتا ہے شروع شروع میں متوجہ نہ کرے۔ خاص طور پر ہو سکتا ہے کہ روحِ نفاق کا اظہار ایک مرد کی نسبت ایک عورت میں مختلف طرح سے ہو۔ لیکن نفاق کے چہروں کے تغیر و تبدل سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے بلکہ غور و فکر کرنے سے بخوبی یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ وہ سارے صفات کے ایک ہی سلسلے میں جو ان کے قدر مشترک سمجھی جاتی ہے، شریک ہیں۔ اس لئے قرآن کہتا ہے: منافق مرد اور منافق عورتیں ایک ہی قماش کے ہیں ﴿الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ﴾۔

اس کے بعد ان کی پانچ صفات کا ذکر فرمایا گیا ہے:

پہلی اور دوسری صفت یہ ہے کہ وہ لوگوں کو برائیوں پر ابھارتے ہیں اور نیکیوں سے روکتے ہیں ﴿يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ﴾۔

یعنی بالکل سچے مومنین کے الٹ جو ہمیشہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے طریقے سے معاشرے کی اصلاح اور اسے نجاست اور گناہ سے پاک کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ منافق ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہر جگہ پر فساد پھیل جائے اور معروف اور نیکی معاشرے سے ختم ہو جائے تاکہ وہ اس قسم کے ماحول میں اپنے برے مقصد بہتر طریقے سے حاصل کر سکیں۔

تیسری صفت یہ ہے کہ وہ دینے والا ہاتھ نہیں رکھتے بلکہ اپنے ہاتھوں کو باندھے ہوئے ہیں نہ وہ راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور نہ محروم اور بے کس لوگوں کی مدد کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے رشتہ دار اور دوست آشنا بھی ان کی مالی مدد سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے ﴿وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ﴾۔

واضح ہے کہ چونکہ وہ آخرت پر اور نفاق کے نتیجے اور جزا پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس لئے مال خرچ کرنے میں بہت ہی بخیل ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے برے اغراض و مقاصد تک پہنچنے کے لئے زیادہ مال خرچ کرتے ہیں یا ریاکاری اور دکھاوے کے طور پر سخاوت اور بخشش کرتے ہیں لیکن وہ خدا کے نام خلوص دل سے کبھی کوئی نیک کام نہیں کرتے۔

چوتھی صفت یہ ہے کہ ان کے تمام کام، گفتار اور کردار بتاتے ہیں کہ وہ خدا کو بھول چکے ہیں، نیز ان کے طرز زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ ”خدا نے بھی ان کو اپنی برکات، توفیقات، اور نعمات سے فراموش کر دیا ہے“ اور ان دونوں فراموشیوں کے آثار ان کی زندگی سے آشکار ہیں ﴿نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ﴾۔

واضح ہے کہ ”نسیان“ کی نسبت خدا کی طرف واقعی اور حقیقی بھلا دینے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کے ساتھ بھال دینے والے شخص کا سا سلوک کرتا ہے۔ یعنی انہیں اپنی رحمت اور توفیق سے دور رکھتا ہے۔

یہ معاملہ روزمرہ کی زندگیوں میں بھی پایا جاتا ہے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ چونکہ تو اپنی ذمہ داری کو بھول چکا ہے لہذا ہم بی مزدوری او ر بدلے کے وقت تجھے بھول جائیں گے یعنی مزدوری اور بدلہ نہیں دیں گے یہی مفہوم روایات اہل بیت - میں بارہا بیان ہوا ہے - (۱)

پانچویں صفت یہ ہے کہ یہ منافق فاسق ہوتے ہیں اور طاعت خداوندی کے دائرے سے خارج ہیں ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾۔

جو کچھ مندرجہ بالا آیت میں منافقین کی مشترکہ صفات کے بارے میں کہا جا چکا ہے وہ ہر زمانے میں دیکھا جاتا ہے ہمارے زمانے کے منافق اپنے خود ساختہ نئے اور جدید چہروں کے باوجود مذکورہ اصولوں کی رو سے گزشتہ صدیوں کے منافقوں کی طرح ہیں وہ برائی اور فساد کی طرف ابھارتے ہیں اور اچھے کاموں سے روکتے ہیں بخیل اور کنجوس بھی ہیں اور اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں میں خدا کو بھول چکے ہیں وہ قانون شکن اور فاسق بھی ہیں اور نرالی بات یہ ہے کہ ان تمام خوبیوں کے باوجود خدا پر ایمان اور دینی اصولوں اور اسلامی بنیادوں پر یقین محکم کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اس کے بعد آیت میں ان کی سخت اور دردناک سزا اس مختصر سے جملے میں بیان کی گئی ہے: خدا منافق مردوں، منافق عورتوں، تمام کافروں اور بے ایمان افراد کے لئے جہنم کی آگ کا وعدہ کرتا ہے ﴿وَعَدَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ﴾۔

وہ جلانے والی آگ کہ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے ﴿خَالِدِينَ فِيهَا﴾

اور یہی ایک سزا جو طرح طرح کے عذاب لئے ہوئے ہے ان کے لئے کافی ہے ﴿هِيَ حَسْبُهُمْ﴾۔
 دوسروں لفظوں میں انھیں کسی سزا کی ضرورت نہیں کیونکہ جہنم میں ہر قسم کا جسمانی اور روحانی عذاب موجود ہے۔
 اور آیت کے آخر میں یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ ”خدا نے انھیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور ہمیشہ کا عذاب ان کے نصیب میں ہے“ ﴿وَلَعَنَهُمُ اللَّهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ﴾۔

بلکہ یہ خدا سے دوری خود عظیم ترین عذاب اور دردناک ترین سزا شمار ہوتی ہے۔
 تاریخ کا ذکر اور درس عبرت اس آیت میں منافقین کی جماعت کو بیدار کرنے کے لئے ان کے چہرے کے سامنے تاریخ کا آئینہ رکھ دیا گیا ہے اور ان کی زندگی کا گزشتہ باغی منافقوں سے مقابلہ اور موازنہ کر کے موثر درس عبرت دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ ”تم گزشتہ منافقوں کی طرف ہو اور اسی برے راستے اور بدسر نوشت کے پیچھے پڑے ہوئے ہو“ ﴿كَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾۔ انہی لوگوں کی طرح جو قوت و طاقت میں تم جیسے زیادہ اور مال و دولت کی رو سے تم سے بہت آگے تھے ﴿كَانُوا أَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَ أَكْثَرَ أَمْوَالًا وَ أَوْلَادًا﴾۔

دنیا میں وہ اپنے حصہ میں سے شہوتِ نفسانی، گندگی، گناہ، فتنہ فساد اور تباہ کاریوں سے بہرہ ور ہوتے ہوئے۔ تم بھی جو اس امت کے منافق ہو گزرے ہوئے منافقین کی طرح ہی حصہ دار ہو ﴿فَاسْتَمِعُوا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتِعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ﴾۔

”خلق“ لغت میں نصیب اور حصہ کے معنی میں ہے جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے یہ ”خلق“ سے لیا گیا ہے (یعنی اس جہت سے انسان اپنا نصیب اپنے خلق و خو کے مطابق اس دنیا میں حاصل کرتا ہے) اس کے بعد فرمایا گیا ہے: تم کفر و نفاق میں اور مومنین کا مذاق اڑاے میں مگن ہو جیسا کہ ان امور میں وہ لوگ ڈوبے ہوئے تھے ﴿وَحُضِّنْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوا﴾۔ (۲)

آخر میں عہد پیغمبر کے منافقوں اور دنیا کے سب منافقوں کو بیدار کرنے کے لئے گزرے ہوئے منافقین کا انجام دو جملوں میں بیان کیا گیا ہے۔

پہلا یہ کہ وہ ایسے لوگ ہیں جن کے دنیا و آخرت میں سب اعمال تباہ و برباد ہوئے ہیں اور برباد ہوں گے اور انھیں اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں ملے گا ﴿أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾۔
 دوسرا یہ کہ وہ اصلی اور حقیقی نقصان اٹھانے والے ہیں ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾۔

ممکن ہے کہ وہ اپنے منافقہ عمل سے وقتی اور عارضی محدود فائدے حاصل کریں لیکن اگر ہم صحیح طور پر توجہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ اس طریقے سے نہ دنیا میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور نہ آخرت میں انھیں کوئی فائدہ ہوگا۔

جیسا کہ اقوام گذشتہ کی تاریخ اس حقیقت کو واضح کر رہی ہے کہ کس طرف نفاق کی بد بختیاں ان سے وابستہ ہو کر رہ گئیں اور انھیں زوال اور نیستی کی طرف لے گئیں اور ان کے برے انجام اور بری عاقبت نے عالم آخرت میں ان کی بد بختی ظاہر اور واضح کر دی۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ باوجود تمام وسائل اور مال اولاد کے ہوتے ہوئے کامیابی تک نہ پہنچ سکے اور ان کے سب اعمال بے بنیاد ہونے کی وجہ سے اور نفاق کے زیر اثر نابود ہو گئے تو پھر تم جو کہ قوت اور طاقت کے لحاظ سے کمتر ہو اس قسم کی بد قسمتی اور بد انجامی میں اور بھی بر طرح سے پھنسو گے۔

اس کے بعد خداوند عالم پیغمبر اسلام کی طرف بات کا رخ موڑتے ہوئے استفہام انکاری کے طور پر یوں فرماتا ہے:

کیا منافقوں کا یہ گروہ گذشتہ امتوں قوم نوح، عاد، ثمود اور قوم ابراہیم اور اصحاب مدین (قوم شعیب) اور قوم لوط کے ویران و برباد شہروں کے حال سے باخبر نہیں ہے؟ ﴿أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَقَوْمُ إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَاتِ﴾ (۳)۔

یہ قویں جن کا ایک عرصہ تک دنیا کے اہم حصوں پر اقتدار تھا۔ ان میں سے ہر ایک تباہ کاری، نافرمانی، سرکشی، بے انصافی، طرح طرح کے ظلم و ستم اور فساد کی وجہ سے کسی نہ کسی عذاب الہی میں گرفتار ہوئی۔

قوم نوح طوفان کی تباہ کن موجوں سے اور قوم عاد (قوم ہود) نیز اور وحشت ناک آندھیوں کے ذریعے، قوم ثمود (قوم صالح) ویران گر زلزلوں سے، قوم ابراہیم گونا گوں نعمتوں کی محرومی سے، اصحاب مدین (قوم شعیب) آگ کے برسانے والے بادل سے اور قوم لوط اپنے شہروں کے زیر و زبر ہونے سے تباہ و برباد ہوئی۔ صرف ان کے بے جان جسم او ربوسیدہ ہڈیاں مٹی کے نیچے یا پانی کی موجوں میں باقی رہ گئیں۔

یہ وہ دل دہلانے والے واقعات ہیں جن کا مطالعہ اور آگاہی ہر اس انسان کو جو ذرا سا بھی احساس رکھتا ہے جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

اگرچہ خدا نے کبھی بھی انھیں اپنے لطف و کرم سے محروم نہیں رکھا اور ان کے نبیوں کو واضح دلیلوں کے ساتھ ان کی ہدایت کے لئے بھیجا ﴿أَتْنٰهُمْ رُسُلَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ﴾۔ لیکن انھوں نے ان خدا رسیدہ بزرگوں کے کسی موعظہ اور نصیحت پر کان نہ دھرے اور مخلوق خدا کی نصیحت و ہدایت کی راہ میں ان کی ناقابل برداشت تکلیفوں کو ذرہ برابر اہمیت نہ دی۔

اس بنا پر خدا نے کبھی ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود اپنے آپ پر ظلم و جور روا رکھا۔ ﴿فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾۔

۱ تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۲۳۹، ۲۴۰ ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ ”کالذی خاصوا“ دراصل ”کالذی خاصوافیہ“ ہے یا دوسرے لفظوں میں آج کل کے منافقین کے فعل کی تشبیہ گذرے ہوئے منافقین کے فعل سے ہے جیسے کہ گذشتہ جملے میں ان کے نعمات الہی سے راہ شہوت و خواہشات میں فائدہ اٹھانے کو گذرے ہوئے منافقوں کے طرز عمل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس بنا پر یہ ایک شخص سے تشبیہ نہیں ہے کہ ہم مجبور ہو کر ”الذی“ کو ”الذین“ (یعنی مفرد کی جمع) کے معنی میں لیں بلکہ عمل کو عمل سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۳۔ مؤتفکات ”اتفاک“ کے مادہ سے انقلاب، تبدیلی اور زیر و زبرہ ورنے کے معنی میں ہے۔ یہ قوم لوط کے شہروں کی طرف اشارہ ہے جو زلزلہ کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئے تھے۔

آیات ۷۱، ۷۲

- ۷۱- ﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ -
- ۷۲- ﴿وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسَاكِينَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ -

ترجمہ

- ۷۱- ایماندار مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے ولی (دوست اور مددگار) ہیں وہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور خدا و رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ خدا عنقریب ان پر رحمت کرے گا بے شک خدا توانا و حکیم ہے۔
- ۷۲- خدا مومن مردوں اور عورتوں سے ایسے جنت کے باغوں کا وعدہ کیا ہوا ہے جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں جاری ہیں وہ ہمیشہ ان ہی میں رہیں گے اور عدن کی جنتوں میں (ان کے لئے) پاکیزہ مساکن ہیں اور خدا کی رضا (اور خشنودی ان سب سے) برتر و بہتر ہے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

سچے مومنوں کی نشانیاں

گذشتہ آیتوں میں منافق مردوں اور عورتوں کی مشترکہ علامتیں بیان کی گئیں تھیں۔ جن کا خلاصہ پانچ حصوں میں ہوتا ہے۔

۱۔ بری چیزوں کا حکم دینا،

۲۔ اچھی چیزوں سے روکنا،

۳۔ کنجوسی اور بخیلی،

۴۔ خدا کو بھول جانا اور

۵۔ حکم خدا کی نافرمانی۔

ان آیات میں مومن مردوں اور عورتوں کی نشانیاں بتائی گئی ہیں اور وہ بھی پانچ حصوں ہی میں ہیں اور بالکل منافقوں کی صفات کے مقابلے میں ہیں آیت یہاں سے شروع ہوتی ہے:-

”ایماندار مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے دوست و ملی اور مددگار ہیں ﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾“۔

قابل توجہ یہ بات ہے کہ منافقین کے لئے لفظ ”اولیاء“ نہیں آیا بلکہ ”﴿بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ﴾“ ہے جو بظاہر بہر غرض و غایت کی وحدت اور صفات و کردار کی یکسانیت کی دلیل دکھائی دیتا ہے یہ اس طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اگرچہ منافق ایک ہی صفت میں ہیں اور ان کے مختلف گروہ ایک ہی قسم کے منصوبوں اور پروگراموں میں مصروف ہیں پھر بھی ان میں محبت، مودت اور ولایت کی روح موجود نہیں۔ جب ان کی شخصی اغراض خطرے میں پڑ جاتی ہیں تو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بھی بے ایمانی کرتے ہیں۔ اسی بنا پر سورہ حشر کی آیت ۱۴ میں پڑھتے ہیں:- ”﴿تَحْسِبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّى﴾“

تم انہیں متفق اور متحد سمجھتے ہو، حالانکہ ان کے دل پر اکندہ اور مختلف ہیں
خداوند عالم اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد مومنین کی صفات کی جزئیات کی تشریح کرتا ہے۔

۱۔ پہلے فرماتا ہے: وہ لوگوں کی نیکی کی طرف بلا تے ہیں ﴿يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ﴾۔

۲۔ لوگوں کو بدی، برائی اور گناہ سے روکتے ہیں ﴿وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾۔

۳۔ وہ منافقوں کے برخلاف جنہوں نے خدا کو بھلا رکھا تھا ”نماز قائم کرتے ہیں“ اور خدا کو یاد کرتے ہیں اور اس کی عبادت اور ذکر سے دل کو روشن اور عقل کو بیدار اور خبردار کئے ہوئے ہیں ﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ﴾۔

۴۔ وہ منافقوں کے برخلاف جو کنجوس اور بخیل لوگ تھے، اپنے مال کا ایک حصہ راہِ خدا میں اور خلقِ خدا کی فلاح و بہبودی اور معاشرے کی تشکیل نو کے لئے خرچ کرتے ہیں ﴿وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ﴾۔

۵۔ منافق، فاسق اور سرکش ہیں اور خداوند علام کے حکم کی پیروی نہیں کرتے لیکن مومن خدا اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرتے ہیں

﴿وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾۔

اس آیت کے آخر میں خداوند عالم نتیجے اور بدلے کے طور پر مومنوں کے پہلے امتیاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: خدا عنقریب ان پر اپنی رحمت نازل کرے گا ﴿أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ﴾۔

لفظ ”رحمت“ جس کا ایک مقام پر ذکر ہوا ہے ایک بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے جو دین و دنیا کی ہر قسم کی خیر و برکت اور نیکی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ لفظ اصل میں منافقین کی حالت کی ضد ہے یعنی خدا نے ان پر لعنت کی ہے اور انھیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔

بے شک مومنین سے خدا کا وعدہ رحمت یقینی اور اطمینان بخش ہے کیونکہ وہ قدرت رکھتا ہے اور دانا و حکیم بھی ہے نہ وہ کسی سبب کے بغیر وعدہ کرتا ہے اور نہ ہی جب وعدہ کرتا ہے تو اس کے پورا کرنے سے عاجز ہے ﴿إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾۔

بعد والی آیت خدا کی اس وسیع رحمت کے ایک حصہ کی جو ایماندار لوگوں کے لئے ہے۔ تشریح کرتی ہے۔ اس میں اس رحمت کے مادی اور روحانی دونوں پہلوؤں کا تذکرہ ہے۔ شروع میں فرماتا ہے: خدا ایمان دار مردوں اور عورتوں سے ایسے بہشت کے باغوں کا وعدہ کرتا ہے جن درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں ﴿وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾۔

اس عظیم نعمت کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ زوال، فنا اور جدائی کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہمیشہ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے ﴿خَالِدِينَ فِيهَا﴾۔

ان پر اللہ کا دوسرا احسان یہ ہو گا کہ خدا انھیں بہشتِ عدن کے مرکز میں پاکیزہ مسکن اور شاندار مکان عطا فرمائے گا ﴿وَمَسَاكِينَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ﴾۔

لغت میں ”عدن“ کے معنی مکان اور جگہ میں ٹھہرنے اور زندگی گزارنے کے ہیں۔ اس لئے ”معدن“ کسی خاص مواد کی بقاء کی جگہ کے معنی میں بولا جاتا ہے اس بنا پر ”عدن“ کا مفہوم و مطلب خلود (ہمیشگی) کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے لیکن کیونکہ گزشتہ جملہ میں خلود کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے تو اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ”جنتِ عدن“ پروردگار کی بہشت کا ایک خاص مقام ہے۔ جو دیگر سبب بہشتوں سے ممتاز ہے۔

اسلامی حدیثوں اور مفسرین کی تفسیر میں یہ امتیاز مختلف شکلوں میں بیان ہوا ہے چنانچہ پیغمبر اسلام کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: عدن دار اللہ الی لم ترها عین ولم یخطر علی قلب بشر، لا یسکنها غیر ثلاثة النبیین و الصدیقین و الشہداء

”عدن خدا کا وہ گھر جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ اس خیال کسی دل و دماغ میں آیا ہے اور اس میں صرف تین گروہ سکونت پذیر ہوں گے۔ انبیاء صدیقین (وہ جنہوں نے انبیاء کی تصدیق کی ہے اور ان کی حمایت کی ہے) اور شہداء۔“

(۱)

کتاب خصال تل میں حضرت رسول اکرم سے اس طرح مروی ہے:-

من سرہ ان یحیا حیاتہ و یموت مماتہ ویسکن جنتہ التی و اعدنی اللہ ربی ، جنات عدن فلیوال عبی بن ابی طالب علیہ السلام و ذریئہ علیہم السلام من بعد ہ۔

”جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس زندگی مجھ جیسا اور موت بھی مجھ جیسی ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ علی بن ابی طالب اور ان کی اولاد سے محبت کرے۔“ (۲)

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ جنات عدن بہشت بریں کے ایسے باغات ہیں جن میں رسالت مآب اور ان کے خاص پیروکاروں کی ایک جماعت مقیم ہوگی۔

یہ مضمون ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام سے بھی منقول ہے کہ جنات عدن پیغمبر اسلام کی قیام کا مقام ہے۔

اس کے بعد خداوند عالم ان کی روحانی نعمتوں اور جزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: خدا کی رضا اور خوشنودی جو ان سچے مومنوں کی نصیب ہوگی سب سے برتر اور عظیم ہے ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَکْبَرُ﴾۔

کوئی اس روحانی لذت اور خوشی کے احساس کی جسے ایک انسان خدا کی طرف متوجہ ہونے سے پاتا ہے، تعریف و توصیف نہیں کر سکتا۔ بعض مفسرین کے قول کے مطابق اس روحانی لذت کا ایک گوشہ سب بہشتوں اور ان کی گونا گون نعمتوں اور بے پایاں آسائشوں سے برتر اور بالاتر ہے۔ البتہ ہم اس دنیا کے قفس میں اور اس کی محدود زندگی میں اس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتے۔ چہ جائیکہ اس عظیم روحانی اور معنوی نعمت کو سمجھ سکیں۔

البتہ اس دنیا کے روحانی اور مادی فرق کی ایک دھندلی سی تصویر کھینچ سکتے ہیں مثلاً جو لذت مسلسل فراق و جدائی کے بعد ایک مخلص اور مہربان دوست کی ملاقت سے ملتی ہے یا ایک خاص روحانی خوشی جو لگاتار کئی ماہ و سال صرف کرنے کے بعد کسی پیچیدہ مسئلہ کے حل ہونے سے حاصل ہو۔ وہ کسی مادی غذا اور مادی لذتوں سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔

یہاں ایک بات یہ بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ لوگ جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مومنین اور نیک لوگوں کی جزا اور ثواب بیان کرتے وقت صرف مادی نعمتوں کا ذکر کرتا ہے اور معنوی جذبات کا اس میں کوئی ذکر اور خبر نہیں ہے وہ

اشتباه اور غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ کیونکہ مندرجہ بالا جملے میں خدا کی رضا جو خصوصیت کے ساتھ لفظ ”نکمرہ“ کے ساتھ بیان کی گئی ہے، خداوند عالم کی خوشنودی کے ایک خاص گوشے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہ بہشت کی تمام مادی نعمتوں سے افضل و اعلیٰ ہے اور یہ چیز اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ معنوی جزا کس قدر قیمتی اور اہم ہے۔

البتہ اس کی برتری کا سبب واضح اور روشن ہے کیونکہ حقیقت میں روح ایک گوہر کی مانند ہے اور جسم صدف کی طرح ہے، روح حاکم ہے اور جسم محکوم، روح کا ارتقاء اصلی اور بنیادی مقصد ہے جب کہ جسم کی تکمیل وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر روح کی تمام شعائیں جسم سے زیادہ وسیع ہیں اور روحانی لذتوں کا قیاس جسمانی لذتوں پر نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح روحانی مصیبتیں اور تکالیفیں جسمانی آلام و مصائب کے مقابلے میں بدرجہا دردناک ہیں۔

آیت کے آخر میں تمام مادی اور روحانی نعمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ بہت ہی بڑی کامیابی ہے

﴿ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾۔

۱۔ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ نور الثقلین ج ۲ ص ۲۴۱ بحوالہ کتاب خصال۔

آیت ۷۳

۷۳- ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَنِيسَ الْمَصِيرُ﴾ -

ترجمہ

۷۳- اے پیغمبر! کافروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کرو، ان پر سختی کرو، ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور ان کا انجام کیسا برا ہے۔

کافروں اور منافقوں سے جنگ

آخر کا اس آیت میں کافروں اور منافقوں کے مقابلے میں شدت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اے پیغمبر! کفار و منافقین کے ساتھ جہاد کرو ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ﴾۔ ”اور ان کے مقابلے میں سخت اور شدید طریقہ اختیار کرو“ ﴿وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾۔

یہ تو ان کی بنیادی سزا ہے اور آخرت میں ان کے رہنے کی جگہ دوزخ ہے۔ جو بدترین انجام اور برا ٹھکانا ہے ﴿وَمَا أَوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَنِيسَ الْمَصِيرُ﴾۔

البتہ کافروں کے مقابلے میں جہاد کا طور طریقہ تو بالکل واضح ہے اور وہ ہر پہلو سے جہاد ہے۔ خصوصاً مسلح جہاد۔ لیکن منافقوں سے جہاد کے طریقوں میں اختلاف ہے۔ کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ رسول اکرم منافقوں سے مسلح جہاد نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ منافق وہ شخص ہے جو ظاہری طور پر مسلمانوں میں صف میں ہو اور بظاہر تمام آثار اسلام کا پابند ہو۔ اگرچہ باطنی طور پر اسلامی احکام کی خلاف ورزی کرتا ہو۔ چنانچہ ہم بہت سے لوگوں کو جانتے ہیں کہ وہ ایمان حقیقی نہیں رکھتے لیکن کیونکہ وہ اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں اس لئے ہم ان سے غیر مسلموں کا سا برتو نہیں کر سکتے۔ بنا بریں جس طرح اسلامی روایات اور مفسرین کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے منافقوں سے جہاد کرنے سے مراد اور طرح کی جنگ ہے جو مسلح جنگ کے علاوہ ہے۔ مثلاً مذمت، سرزنش، تہدید اور انہیں رسوا کرنا۔ شاید ”﴿وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾“ اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ہاں آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ جب تک منافقوں کی حقیقت اور ان کے خفیہ منصوبے منظر عام پر نہ آجائیں ان کے بارے میں مسلمانوں سے متعلق احکام پر عمل کیا جائے گا۔ لیکن جب ان کی حالت اچھی طرح معلوم ہو جائے تو پھر ان پر کفار حربی کا حکم لاگو ہو جائے گا اور اس صورت میں ان سے مسلح جنگ بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن

جوابات اس احتمال کو کمزور کرتی ہے وہ ہے کہ اس حالت میں ”منافق“ کے لفظ کا اطلاق اس پر درست نہیں ہے۔ بلکہ اب وہ کافر عربی کی صف میں ہے جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ منافق وہ ہے جس کا ظاہر اسلام ہو اور باطن کفر۔

آیت ۷۴

۷۴- ﴿يَخْلُقُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهُمْ بِمَا لَمْ يَنَالُوا وَمَا نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ فَإِنْ يَتُوبُوا يَكُنْ خَيْرًا لَهُمْ وَإِنْ يَتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ﴾۔

ترجمہ

۷۴- منافق خدا کی قسمیں کھاتے ہیں کہ (پیغمبر کے پس پشت) انھوں نے (تکلیف وہ) باتیں نہیں کیں۔ حالانکہ یقیناً انھوں نے کفر آمیز باتیں کی ہیں اور اسلام لانے کے بعد وہ کافر ہو گئے اور انھوں نے (ایک خطرناک کام کا) ارادہ کیا تھا جسے وہ نہ کر سکے وہ صرف اس بات کا انتقام لے رہے ہیں کہ خدا اور اس کے رسول نے صرف اپنے فضل (اور کرم) سے بے نیاز کر دیا ہے (اس کے باوجود) اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے لئے بہتر ہے، اور اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو خدا انھیں دنیا و آخرت میں دردناک سزا دے گا اور وہ روئے زمین پر نہ کوئی ولی و حامی رکھتے ہیں اور نہ ہی یار و مددگار۔

شان نزول

اس آیت کی شان، فزول کے بارے میں مختلف روایتیں نقل ہوئی ہیں جو سب کی سب یہ ظاہر کرتی ہیں کہ بعض منافقوں سے اسلام اور پیغمبر کے بارے میں تکلیف دہ باتیں کی تھیں اور اپنے راز فاش ہونے کے بعد انھوں نے جھوٹی قسم کھائی تھی کہ ہم نے کچھ نہیں کہا۔ غرض انھوں نے اسلام کے خلاف جو سکیم بنائی تھی وہ ناکام ہو گئی۔ ان کی باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ منافقوں میں سے جلاس نامی ایک شخص نے جنگ تبوک کے موقع پر نبی اکرم کے بعض خطبے سن کر ان کا سختی سے انکار کر دیا تھا اور آپ کو جھٹلایا تھا۔

مدینہ میں آنے کے بعد ایک شخص عامر بن قیس جس نے یہ باتیں سنی تھیں، پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا اور اجلاس کی باتیں بیان کیں، لیکن جب وہ خود مدینہ میں آیا تو اس نے اس کے بارے میں صاف انکار کر دیا۔ اس پر حضرت رسالتاً نے دونوں کو حکم دیا کہ وہ مسجد میں منبر کے پاس کھڑے ہو کر قسم کھائیں کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہے۔ دونوں نے قسم کھائی۔ مگر عامر نے عرض کیا کہ اے خدا! اپنے پیغمبر پر آیت نازل فرما! اور جو شخص سچا ہے اس کی سچائی کو ظاہر کر دے اور اس پر پیغمبر اور مومنین نے آمین کہی جبرئیل نازل ہوئے اور مندرجہ بالا آیت پیغمبر کی خدمت میں لائے جس وقت ”

فان یتوبو ایک خیر اٰلہم“ (اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے لئے بہتر ہے) کا جملہ آیا تو ”جلاس“ نے کہا: اے خدا کے رسول! پروردگار نے مجھ سے چاہی ہے اور میں گناہ پر پچھتا رہا ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔ حضور نے اس کی توبہ قبول کر لی۔

نیز جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں مفسرین نے نقل کیا ہے کہ منافقوں کے ایک گمراہ کو پکا ارادہ کیا ہوا تھا کہ جنگ تبوک سے واپسی پر راستے میں ایک درے سے گذرتے ہوئے پیغمبر کی اونٹنی کو بدکائیں گے تا کی پیغمبر اکرم پہاڑ کے اوپر سے درے میں گر جائیں، لیکن آنحضرت وحی کے ذریعے اس واقعہ سے آگاہ ہو گئے اور ان کی سازش کو نقش بر آب کر کے رکھ دیا۔ ناقہ کی مہار عمار کے ہاتھ میں دی اور ”حذیفہ“ پیچھے سے ناقہ کو ہانک رہے تھے تاکہ سواری پورے طور قابو میں رہے۔ یہاں تک کہ آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ دوسرے راستے سے آئیں تاکہ منافق نہ لوگوں کے ہجوم میں چھپ سکیں اور نہ اپنی سازش پر عمل کر سکیں۔ جس وقت آپ نے اس رات کی تاریکی میں کچھ لوگوں کی اپنے پیچھے درے سے آنے کی آواز سنی تو آپ اپنے بعض ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ فوراً ان منافقوں کو پلٹا دیں وہ تقریباً بارہ یا پندرہ افراد تھے اور ان میں سے بعض نے اپنے منہ چھپا رکھے تھے۔ جن انھوں نے کہ ہم اپنے منصوبہ کو عملی جامعہ نہیں پہناسکے تو وہ چھپ گئے لیکن پیغمبر نے انھیں پہچان لیا اور ایک ایک کر کے سب کے نام اپنے صحابہ کرام کو گنوائے۔ ۱

لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ یہ آیت منافقوں کے کارناموں کی طرف اشارہ کر رہی ہے ایک ان کی نامناسب گفتگو اور دوسرا ان کی ناکام سازش اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں شانِ نزل ایک ساتھ صحیح ہیں۔

۱۔ اقتباس از تفسیر مجمع البیان، تفسیر المنار، تفسیر روح المعانی اور دیگر تفاسیر۔

خطرناک سازش

اس آیت کا گزشتہ آیات تک ساتھ تعلق بخوبی واضح ہے کیونکہ یہ سب آیتیں منافقوں کے بارے میں ہیں البتہ اس آیت میں ان کے ایک اور عمل سے پردہ اٹھا لیا گیا ہے کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے راز فاش ہو رہے ہیں تو واقعات کا انکار کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اپنی بات سچ ثابت کرنے کے لئے جھوٹی قسمیں کھا لیتے ہیں۔

پہلے خدا فرماتا ہے: منافقین قسم کھاتے ہیں کہ انھوں نے اس قسم کی باتیں پیغمبر کے بارے میں نہیں کہیں ﴿يَخْلِفُونَ﴾

بِاللّٰهِ مَا قَالُوا۟۔

حالانکہ انھوں نے یقینی طور پر کفر آمیز باتیں کہیں ﴿وَلَقَدْ قَالُوا۟ كَلِمَةَ الْكُفْرِ﴾۔ اس طرح انھوں نے اسلام قبول کرنے اور اس کا اظہار کرنے کے بعد کفر کا راستہ اختیار کیا ﴿وَكَفَرُوا۟ بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ﴾۔ البتہ وہ پہلے بھی مسلمان نہیں تھے کہ اب کافر ہو گئے ہیں بلکہ صرف ظاہری طور پر ہی مسلمان تھے۔ جسے انھوں نے کفر کا اظہار کر کے توڑ ڈالا۔ اس ظاہری اور دکھلاوے کے اسلام کو بھی انھوں نے کفر کا اظہار کر کے درہم برہم کر دیا ہے اس سے بھی بڑھ کر وہ خطرناک ارادہ لئے ہوئے تھے جن تک نہیں پہنچ سکے ﴿وَهُمْوَا بِمَا لَمْ يَنَالُوا۟﴾۔

ہو سکتا ہے کہ ان کا یہ ارادہ ”لیلۃ العقبة“ پیغمبر کو شہید کرنے کا ہو جس کی تشریح شان فزول میں ہو چکی ہے یا ان کے تمام کاموں کی طرف اشارہ ہو جنہیں وہ اسلامی معاشرے کے تباہ و برباد کرنے اور فساد و نفاق پیدا کرنے اور پھوٹ ڈالنے کے لئے انجام دیتے تھے لیکن انھیں کبھی بھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ مختلف حوادث میں مسلمانوں کی تیاری اور بیداری کے سبب منافق اور ان کے منصوبے پہچانے جاتے تھے۔ مسلمان ہمیشہ ان کی تاک میں لگے رہتے تھے تاکہ ان سے کوئی بات سنیں اور اس کی پیش بندی اور ضروری کاروائی کے لئے حضور کی خدمت میں عرض کر دیں۔ یہ بیداری اور بر محل اقدامات اور ان کے ساتھ ساتھ فزول آیات اور خدا کی تصدیق منافقوں کی رسوائی اور ان کی سازشوں کی ناکامی کا سبب بنتی تھی۔

بعد والے جملہ میں اس لئے کہ منافقوں کے کرتوت اور نمک حرامی کا گھٹیا اور برائی پوری طرح واضح ہو جائے، مزید فرمایا گیا ہے:- اصل میں انھوں نے پیغمبر سے کوئی غلبہ کام نہیں دیکھا تھا نہ اسلام انھیں کوئی نقصان پہنچایا تھا بلکہ اس کے برعکس وہ حکومت اسلامی کے سایہ میں طرح طرح کی مادی اور روحانی نعمتوں سے بہرہ ور ہوئے تھے۔ اس بنا پر وہ

اصل میں ان نعمتوں کا انتقام لے رہے تھے جو خدا اور اس کے پیغمبر نے اپنے فضل و کرم سے انہیں استغناء کی حد تک دی تھیں ﴿وَمَا نَقْمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾۔^(۱)

اس میں شک نہیں کہ خدا کے فضل اور رسول اکرم کی انتہائی مہربانی سے انہیں بے نیاز کر دیا، پھر ان کی ضرورتوں اور حاجتوں کا پورا کرنا کوئی ایسی چیز نہ تھی جو منافقوں کو اس پر ابھارے کہ وہ اس اچھے برتاؤ کو انتقام لیں بلکہ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ حق شناسی اور شکرگزاری سے کام لیتے لیکن ان بے وفا اور کمینے لوگوں نے خدمت و نعمت کا جواب جرم اور زیادتی سے دیا۔ یہ بڑی خوب صورت اور بہترین تعبیر ہے جو بہت سی باتوں اور تحریروں میں استعمال ہوتی ہے جیسے ایک شخص کی ہم نے سا لہا سال تک کی خدمت کی ہو اور اس کے بعد وہ خیانت کرے اس موقع پر کہتے ہیں کہ ہمارا گناہ صرف یہ ہے کہ ہم نے تجھے پناہ دی، تیری حفاظت کی اور بہت زیادہ محبت کی۔

اس کے بعد جیسا کہ قرآن کی سیرت ہے، لوٹ آنے کا راستہ ان کے لئے کھلا رکھتے ہوئے کہتا ہے: اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے لئے بہتر ہے ﴿فَانِ يَتُوبُوا يَكْ خَيْرًا لَّهُمْ﴾۔

یہ اسلام کی حقیقت بینی، تربیت کے اہتمام اور ہر قسم کی سختی اور نامناسب سلوک کے خلاف جنگ کی نشانی ہے۔ یہاں تک کہ ان منافقوں کے لئے جنہوں نے رسول اللہ کو ختم کرنے کی کوشش کی اور کفر آمیز باتیں کیں اور تکلیف وہ توہین کی نہ صرف صلح اور توبہ کی راہ کھلی رکھی ہے بلکہ انہیں توبہ کی دعوت دے رہا ہے۔ یہ اصل میں اسلام کا حقیقی چہرہ ہے لیکن وہ لوگ کہتے ہیں جو اسلام کے اس خوبصورت اور حقیقی چہرے کا تعارف دباؤ اور سختی کے دین کے ساتھ کراتے ہیں۔

کیا آج کی دنیا میں کوئی مہربان اور نرم خو حکومت مل سکتی ہے جو اپنے خلاف سازش کرنے والوں کے ساتھ ایسی مہربانی اور محبت کرنے کو تیار ہے جیسا کہ ہم شان نزول میں پڑھ چکے ہیں کہ نفاق انگیز منصوبہ بنانے والوں میں ایک نے یہ بات سن کر توبہ کر لی اور پیغمبر نے اس کی توبہ قبول کر لی۔

اس کے باوجود اس بنا پر کہ کہیں وہ لوگ اس نرمی کو کمزوری پر محمول نہ کریں انہیں تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر ”وہ اپنی روش باز نہ آئے اور توبہ سے منہ نہ پھیر لیا تو خدا انہیں دنیا و آخرت میں دردناک سزا دے گا ﴿وَإِنْ يَتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمْ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾۔

اگر وہ یہ سوچتے ہیں کہ ہو سکتا ہے خدا کی سزا کے مقابلے میں کوئی ان کی مدد کرے گا تو وہ انتہائی غلطی پر ہیں کیونکہ وہ روئے زمین پر کسی اپنا ولی، سرپرست اور یار و مددگار نہ بنائیں گے ﴿وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ﴾۔

البتہ ان کی اضرت کی سزا اور عذاب تو واضح ہے باقی رہا انکے لئے دنیاوی عذاب تو وہ رسوائی، خواری اور بد بختی وغیرہ ہے۔

۱۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا جملے میں اگرچہ خدا اور پیغمبر دونوں کے فضل کے متعلق ذکر ہے: ”من فضله“ لیکن اس میں ضمیر واحد استعمال ہوئی ہے نہ کہ تنیہ کی شکل میں۔ اس تعبیر کا سبب وہی ہے جس کی طرف ہم گزشتہ چند آیتوں میں اشارہ کر چکے ہیں۔ اس قسم کی تعبیریں حقیقت توحید کو ثابت کرنے کے لئے ہیں اور یہ کہ تمام کام اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اگر حضرت رسول اکرم کام کرتے ہیں تو وہ کوئی کام کرتے ہیں تو وہ بھی اس کے حکم سے ہے اور ان کا کام اس کے ارادے اور مشیت سے الگ نہیں ہے۔

آیات ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸

۷۵- ﴿وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللَّهَ لَئِنْ آتَانَا مِنْ فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ الصَّالِحِينَ﴾۔

۷۶- ﴿فَلَمَّا آتَاهُمْ مِنْ فَضْلِهِ بَخِلُوا بِهِ وَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُعْرِضُونَ﴾

۷۷- ﴿فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ إِلَى يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ﴾

۷۷- ﴿لَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ وَأَنَّ اللَّهَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ﴾۔

ترجمہ

۷۵- ان میں سے کچھ لوگ ایسے میں جنہوں نے خدا سے وعدہ کیا ہے کہ اگر خدا ہمیں اپنے فضل و کرم سے رزق دے تو ہم یقیناً صدقہ دیں گے اور شکر گزاروں میں سے ہوں گے۔

۷۶- لیکن جب اس نے اپنے فضل سے انہیں بخش دیا تو انہوں نے بخل کیا اور نافرمانی کی اور وہ روگرداں ہو گئے۔

۷۷- اس عمل نے ان کے دلوں میں نفاق (کی روح) کو اس دن تک کے لئے جب وہ خدا کے سامنے ہوں گے۔

۷۸- کیا وہ نہیں جانتے کہ خدا ان کے بھیدوں اور سرگوشیوں کو جانتا ہے خدا سب چھپی ہوئی باتوں سے آگاہ ہے۔

شان نزول

مفسرین میں مشہور ہے کہ یہ آیتیں ایک انصاری ثعلبہ بن حاطب کے بارے میں نازل ہوئی وہ ایک غریب آدمی تھا۔ روزانہ مسجد میں آیا کرتا تھا کہ اصرار تھا کہ رسول اکرم دعا فرمائیں کہ خدا اس کو مال مال کمر دے۔ حضور نے اس سے فرمایا:۔ قلیل تو دی شکرہ خیر من کثیر لا تطيقہ

مال کی تھوڑی مقدار کا تو شکر ادا کر سکے اس مال کی کثرت سے بہتر ہے جس کا تو شکر نہ ادا نہ کر سکے، کیا یہ بہتر نہیں کہ خدا کے پیغمبر کی پیروی کرے اور سادہ زندگی بسر کرے۔

لیکن ثعلبہ مطالبہ کر رہا اور آخر کار اس نے پیغمبر اکرم سے عرض کیا کہ میں آپ کو اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر خدا نے مجھے دولت عطا فرمائی تو میں اس کے تمام حقوق ادا کروں گا، چنانچہ آپ نے اس کے لئے دعا فرمائی۔

ایک روایت کے مطابق زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ان کا ایک چچا زاد بھائی جو بہت مال دار تھا، فوت ہو گیا اور اسے بہت سی دولت ملی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ اس نے ایک بھیڑ خریدی جس سے اتنی نسل بھی کہ جس کی دیکھ بھال مدینہ میں نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے انھیں مدینہ کے آس پاس کی آبادیوں میں لے گیا اور مادی زندگی میں اس قدر مصروف اور لگن ہو گیا کہ نما جماعت تو کیا جمعہ کی نماز میں بھی نہیں آتا تھا ایک مدت کے بعد رسول اکرم نے زکوٰۃ وصول کرنے والے خادم کو اس کے پاس زکوٰۃ لینے کے لئے بھیجا لیکن اس کم ظرف کنجوس نے نہ صرف خدائی حق کی ادائیگی میں پس و پیش کیا بلکہ شروع پر بھی اعتراض کیا اور کہا کہ یہ حکم جزیہ کی طرح ہے یعنی ہم اس لئے مسلمان ہوئے تھے کہ جزیہ سے بچ جائیں۔ اب زکوٰۃ دینے کی شکل میں ہم میں اور غیروں مسلمانوں میں کون سا فرق باقی رہ جاتا ہے۔ حالانکہ اس نے نہ جزیہ کا مطلب سمجھا تھا اور نہ زکوٰۃ کا اور اگر اس نے سمجھا تھا تو دینا پرستی اسے حقیقت کے بیان اور اظہار حق کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ غرض جب حضرت رسول اکرم نے اس کی باتیں سنیں تو فرمایا:-

یا ویح ثعلبه ! یا ویح ثعلبه !

”وائے ہو ثعلبہ پر ہلاکت ہو ثعلبہ پر“ اس وقت مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں

ان آیتوں کے لئے بھی شانِ نزول منقول ہیں جو کم و بیش ثعلبہ کی داستان سے ملتی جلتی ہیں۔ مذکورہ شانِ نزول اور آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ شخص یا اشخاص پہلے منافقوں کی صف میں شامل نہ تھے لیکن اس قسم کی اعمال اور کردار کی وجہ سے ان کی ساتھ مل گئے۔

منافق کم ظرف ہوتے ہیں

در اصل یہ آیتیں منافقوں کی ایک بڑی صفت کی نشاندہی کرتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ وہ بے بس، ناتواں اور فقیر و پریشانی کے وقت تو اس طرح ایمان کا دم بھرتے ہیں کہ کوئی شخص یہ باور ہی نہیں کر سکتا کہ وہ کسی دن منافقوں کی صف میں جا کھڑے ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ ان لوگوں کی جو وسیع ذرائع آمدنی اور وسائل رکھتے ہیں اس بات پر مذت کرتے ہیں کہ وہ اپنی وسائل سے محروم لوگوں کو کیوں فائدہ نہیں پہنچاتے۔ لیکن جب وہ خود صاحبِ ثروت ہو جاتے ہیں تو اپنے ہاتھ سمیٹ لیتے ہیں اور دنیا پرستی میں ایسے ڈوب جاتے ہیں کہ خدا کے ساتھ کئے ہوئے سب وعدوں کو بھول جاتے ہیں یعنی ان کی شخصیت بالکل بدل جاتی ہے اور ان کی سوچ میں یکسر تغیر آ جاتا ہے۔

اور یہی وہ کم ظرفی ہے جس کا نتیجہ دنیا پرستی، کنجوسی اور خود غرضی ہے۔ یوں روح نفاق ان کو اس طرح سے جکڑ لیتی ہے کہ ان کے لئے واپسی کا کوئی راستہ بھی نہیں چھوڑتی۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: بعض منافقین ایسے ہیں جنہوں نے خدا کے ساتھ عہد و پیمان باندھا کہ اگر وہ اپنے فضل و کرم سے ہمیں کچھ عطا فرمائے گا تو ہم یقیناً ضرورت مندوں کی مدد کریں گے۔ اور نیکوں میں سے ہو جائیں گے۔ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاہَدَ اللّٰہَ لَئِنْ آتَانَا مِنْ فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾

لیکن یہ باتیں وہ اس زمانے میں کیا کرتے تھے جب ان کا ہاتھ خالی تھا مگر وقت خدا نے اپنے فضل کرم سے انہیں مالا مال کر دیا تو انہوں نے بخل کیا اور نافرماں اور روگرداں ہو گئے ﴿فَلَمَّا آتَاهُمْ مِنْ فَضْلِهِ بَخِلُوا بِهِ وَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُّعْرِضُونَ﴾۔ اس پیمان اور بخل کا یہ نتیجہ نکلا کہ روح نفاق دائمی طور پر مضبوطی کے ساتھ ان کے دل میں راسخ ہو گئی اور اب وہ تاقیامت اور اس کے وقت تک جب وہ خدا سے ملیں گے باقی رہے گی ﴿فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِی قُلُوبِهِمْ اِلٰی یَوْمَ یَلْقَوْنَهُ﴾۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے جو وعدہ خداوند عالم سے کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی اس لئے کہ ہمیشہ جھوٹ بولتے رہے ﴿بِمَا اٰخَلَفُوا اللّٰہَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ﴾۔

آخر میں ان کی مذمت کو سرزنش کے طور پر کہا گیا ہے کہ کیا وہ نہیں جانتے کہ خدا انے بھیدوں کو جانتا ہے اور ان کی سرگوشیوں کو سنتا ہے اور وہ خدا سن سے غائب اور چھپے ہوئے امور کو جانتا ہے ﴿اَلَمْ یَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ وَاَنَّ اللّٰہَ عَلٰمُ الْغُیُوْبِ﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ ”﴿فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِی قُلُوبِهِمْ﴾“ سے بخوبی روشن ہے کہ بہت سے گناہوں اور برائیاں یہاں تک کہ کفر و نفاق ایک دوسرے کی علت اور معلوم ہیں کیونکہ مندرجہ بالا جملہ صراحت کے ساتھ بتاتا ہے کہ ان کا بخل اور وعدہ شکنی اس بات کا سبب بنی ہے کہ نفاق ان کے دلوں میں طرح طرح کی سازشوں اور فتنوں کا بیج بوئے۔ یہی صورت دوسرے گناہوں اور غلط کاموں کی ہے۔ اس لئے بعض کتب میں ہے کہ کبھی کبھی بڑے گناہوں کی وجہ سے انسان دنیا سے بے ایمان ہو کر اٹھتا ہے۔

۲۔ ”یوم یلقونہ“ جس کی ضمیر ”خدا کی طرف لوٹتی ہے، سے مراد قیامت کا دن ہے کیونکہ ”لقاء اللہ“ اور اسی قسم کی دوسری تعبیریں عام طور پر قرآن میں قیامت ہی کے بارے میں آتی ہیں یہ درست ہے کہ موت واقع ہونے کے ساتھ ہی عمل کا دور شروع ختم ہو جاتا ہے اور اچھے برے کاموں کا نامہ عمل بندہ وجاتا ہے لیکن ان کے آثار اسی طرح قیامت تک باقی رہیں گے۔

البتہ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ”یلقونہ“ کی ضمیر بخل کی طرف لوٹتی ہے یعنی جب تک وہ اپنے بخل کا نتیجہ دیکھیں گے سزا پائیں گے۔

اسی طرح یہ احتمال بھی ہے کہ پروردگار کی ملاقات سے مراد موت کا لمحہ ہے مگر یہ سب احتمالات آیت کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہیں اور ظاہری مفہوم وہی ہے جو ہم لکھ چکے ہیں۔

اس چیز کے بارے میں کہ پروردگار عالم کی ملاقات سے کیا مراد ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت ۴۶ کے ضمن میں جلد اول (ص ۱۸۳ اردو ترجمہ) میں ہم نے بحث کی ہے اسے ملاحظہ کیجئے۔

۳۔ زیر نظر آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وعدہ توڑنا اور جھوٹ بولنا منافقوں کی صفاست ہیں اور یہ منافق ہی ہیں جو خدا کے ساتھ اپنے وعدوں کی بڑی تاکید کے ساتھ باندھتے ہیں پھر انھیں پاؤں کے نیچے روند ڈالتے ہیں یہاں تک کہ اپنے پروردگار سے جھوٹ بولتے ہیں۔

ایک مشہور حدیث جو رسول اکرم سے منقول ہے بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہے۔ حضور نے فرمایا:

للمنافق ثلاث علامات اذا حدث كذب و اذا وعده خلف و اذا ائتمن خان

منافق کی تین علامتیں ہیں۔ ۱۔ جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔ ۲۔ جب وعدہ کرتا ہے تو اسے پورا نہیں کرتا۔ ۳۔ جب اس کے پاس امانترکھیں تو اس میں خیانت کرتا ہے۔^(۱)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا داستان (ثعلبہ کا واقعہ) میں تینوں نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ اس نے جھوٹ بولا، وعدہ توڑا اور اس مال میں سے جو خدا نے اپنی امانت کے طور پر دی اتھا خیانت بھی کی۔

مندرجہ بالا حدیث زیادہ تاکید کے ساتھ کتاب کافی میں حضرت امام جعفر صادق - ذریعے حضرت رسول اکرم سے مروی ہے، آپ فرماتے ہیں:-

ثلاث من كن فيه كان منافقاً و ان صام و صلى وزعم انه مسلم من اذا ائتمن خان اذا حدث كذب و اذا وعد اخلف

جس شخص میں یہ تین چیزیں ہوں وہ منافق ہے چاہے وہ روزہ اور نماز کا پابند ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھے۔ ۱۔ امانت میں خیانت کرے۔ ۲۔ بات کرے تو جھوٹ بولے اور ۳۔ وعدہ کر کے پھر جائے۔^(۱)

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کبھی کبھی ایسے گناہ بعض ایماندار لوگوں سے بھی ہوں مگر پھر وہ توبہ کر لیں۔ لیکن ان گناہوں کا تسلسل اور ہمیشگی روح، نفاق اور منافقت کی نشانی ہے۔

۴۔ اس نکتہ کو ذہن نشین کرنا بھی ضروری ہے کہ جو کچھ ہم نے مندرجہ بالا آیتوں میں پڑھا ہے وہ صرف ایک گزرے ہوئے زمانہ سے متعلق تاریخی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی اخلاقی اور اجتماعی حقیقت کا بیان ہے جس کے بے شمار نمونے ہر زمانے اور ہر معاشرے میں کسی استثناء کے بغیر پائے جاتے ہیں۔

اگر ہم اپنے آس پاس نگاہ ڈالیں (یہاں تک کہ ہم اپنے آپ کو دیکھیں) تو ”ثعلبہ بن ہاطب“ کے اعمال اور اس کی سوچ کے نمونے ہمیں مختلف مذہبی چہروں میں ملیں گے۔ کتنے ایسے لوگ ہیں جو عام حالات یا غربت میں پکے اور مخلص مومنین کی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں تمام مذہبی پرگراموں میں شرکت کرتے ہیں، ہر اصلاحی پرچم کے نیچے ماتم کرتے ہیں اور حق و صداقت کی آواز بلند کرنے والے کا ساتھ دیتے ہیں، نیک کام کرنے کی تڑپ رکھتے ہیں ہر فساد اور برائی کا مقابلہ کرنے کے لئے آواز بلند کرتے ہیں۔ لیکن جب دن بدلتے ہیں اور صاحب ثروت ہو جاتا ہے، کوئی عہدہ یا مقام انہیں حاصل ہو جاتا ہے تو اچانک ان کا چہرہ بدل جاتا ہے خدا و دین کے بارے میں ان کا شور اور عشق سوزاں مدھم پڑ جاتا ہے اور اب وہ اصلاحی اور تربیتی پروگراموں میں نظر نہیں آتے۔ نہ حق کے لئے گریبان چاک کرتے ہیں اور نہ اب وہ باطل کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔

پہلے جب ان کی حیثیت نہ تھی اور نہ معاشرے میں انہیں کوئی مقام حاصل تھا تو خدا اور مخلوق خدا کے ساتھ طرح طرح کے وعدے کرتے تھے کہ اگر کسی دن ہمیں وسائل مل گئے اور ہم کسی مقام پر پہنچ گئے تو یہ کمزوریں گے اور وہ کمزوریں گے۔ یہاں تک کہ وہ صاحب ثروت و اقتدار پر اپنے فرائض انجام نہ دینے پر ہزاروں اعتراض کرتے تھے لیکن جس روز جب خود ان کی حالت بدلی تو سب عہد و پیمان بھول گئے اور سب اعتراضات اور نکتہ چینیاں برف کی طرح پانی ہو گئیں۔

بے شک یہ کم ظرفی منافقوں کی ایک واضح صفت ہے۔ نفاق، دوزخی شخصیت اور دوغلو پن کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں۔ اس قسم کے لوگوں کی تاریخ حیات، شخصیت کی دورنگی اور دورخی کا بہترین نمونہ ہے۔ اصولی طور پر صاحب ظرف انسان میں دوغلو پن نہیں پایا جاتا۔ نیز اس میں شک نہیں کہ ایمان کی طرح نفاق کے بھی کئی مراحل ہیں۔ بعض لوگوں کی روح میں یہ بری عادت اس طرح راسخ ہو جاتی ہے کہ ان کے دل میں خدا پر ایمان کی طرح نفاق کے بھی کئی مراحل ہیں۔ بعض لوگوں کی روح یہ بری عادت اس طرح راسخ ہو جاتی ہے کہ ان کے دل میں خدا پر ایمان کوئی اثر باقی نہیں رہتا اگرچہ وہ اپنے آپ کو مومنین کی صف میں شامل سمجھتے ہیں۔

جو شخص ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے جبکہ ظاہراً وہ سچا ہے کیا وہ دو پہلو اور دو چہرے رکھنے والا منافق نہیں ہے۔ جو شخص ظاہری طور پر امین ہے اور ای وجہ سے لوگ اس کا اعتبار کرتے ہیں اور اپنی امانتیں اس کے سپرد کرتے ہیں لیکن در حقیقت وہ ان میں خیانت کرتا ہے کیا وہ دوزخی شخصیت کا حامل نہیں ہے اسی طرح وہ لوگ عہد و پیمان باندھتے ہیں لیکن کبھی اس کی پاسداری نہیں کرتے۔ کیا ان کا یہ عمل منافقوں کا سا نہیں ہے؟

انسانی معاشروں کے لئے ایک عظیم ترین مصیبت اور پس ماندگی کا ایک عامل ایسے منافقوں کا وجود ہے اگر ہم آنکھیں بند نہ کر لیں اور اپنے آپ سے جھوٹ نہ بولیں تو ایسے بہت سے ثعلبہ صفت منافقین ہمیں اپنے گرد و پیش اور اسلامی معاشروں میں نظر آئیں گے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ان سب عیوب، ننگ و عار اور اسلامی تعلیمات کی روح سے دوری کے باوجود ہم اپنی پس ماندگی کا گناہ اسلام کی گردن پر ڈالتے ہیں۔

۱ مجمع البیان۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

آیات ۷۹، ۸۰

۷۹- ﴿الَّذِينَ يَلْمِزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ -

۸۰- ﴿اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾ -

ترجمہ

۷۹- جو لوگ عبادت گذر مومنین کے صدقات کی عیب جوئی کرتے ہیں اور ان کا تمسخر اڑاتے ہیں جو (تھوڑی سی) مقدار سے زیادہ کی دسترس نہیں رکھتے خدا کا مذاق اڑاتا ہے (انھیں مذاق اڑانے والوں کی سزا دیتا ہے) اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے -

۸۰- ان کے لئے استغفار کرو یا نہ کرو (یہاں تک کہ) اگر ان کے لئے ستر مرتبہ استغفار کرو تو خدا انھیں ہرگز نہیں بخشے گا کیونکہ انھوں نے خدا اور اس کے رسول کا انکار کیا ہے اور خدا فاسقوں کے گروہ کو ہدایت نہیں کرے گا -

شانِ نزول

ان آیات کی شانِ نزول کے ضمن میں حدیث اور تفسیری کی کتابوں میں روایات نقل ہوئی ہیں - ان تمام روایات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے راہ کر رکھا تھا کہ دشمن کے مقابلے کے لئے (احتمالاً جنگ تبوک کے لئے) لشکر اسلام کو تیار کریں - اس لئے آپ کو لوگوں کے تعاون کی ضرورت تھی - جب آپ نے اپنے نظریے کا اظہار کیا تو جو لوگ توانائی رکھتے تھے انھوں نے زکوٰۃ یا بلا عوض مدد کے طور پر لشکر اسلام کی قابل قدر خدمت کی -

جو مسلمان مزدور پیشہ تھے ان کی آمدنی تھوڑی تھی - ان میں سے ابو عقیل انصاری یا سالم بن عمیر انصاری نے رات کے وقت کنوئیں سے پانی نکال کر اضافی طور پر مزدوری کی اور اس طرح دو من - ۱

کھجور جمع کیں - ان میں سے ایک من اپنے گھر رکھ دیں اور ایک من خدمت پیغمبر میں لے آئے - اس طرح انھوں نے ایک عظیم اسلامی مقصد کے لئے بظاہر معمولی سی خدمت انجام دی - اسی طرح اور مزدور پیشہ مسلمانوں نے لشکر اسلام کی خدمت کی -

عیب جو منافقین ان دونوں گروہوں پر اعتراض کرتے تھے جن لوگوں نے زیادہ خدمت کی تھی انہیں ریا کہتے تھے اور جنہوں نے ظاہراً تھوڑی مدد کی تھی ان تمسخر اڑاتے تھے کہ کیا اسلام کو اس قسم کی مدد کی ضرورت ہے؟ اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انہیں سخت دھمکی دی گئی اور عذابِ الہی سے ڈرایا گیا۔

۱۔ یہ ایران کے مرجہ اوزان کے لحاظ سے ہے۔ ایرانی من ہمارے ہاں کی نسبت کم مقدار کا ہوتا ہے (مترجم)

منافقین کی ایک اور غلط حرکت

ان آیات میں منافقین کی ایک عمومی صفت کی طرف اشارہ ہوا وہ یہ کہ وہ ہٹ دھرم، بہانہ جو، اور معترض اور کام بگاڑنے والے ہوتے ہیں، غیر مناسب جوڑ توڑ سے ہر مثبت کام کی تحقیر کرتے ہیں اور اسے برا کر کے پیش کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو نیک کام کی انجام دہی میں سست کریں اور دوسرا ان کے افکار و نظریات میں بدگمانی کے بیج بوئیں تاکہ اس طرح معاشرے میں اصلاحی اور مفید کاموں کا سلسلہ بند ہو جائے۔

قرآن مجید شدت سے ان کی اس غیر انسانی روش کی مذمت کرتا ہے اور مسلمانوں کو اس سے آگاہ کرتا ہے تاکہ لوگ ایسی بدگمانیوں کا شکار نہ ہوں اور منافقین کو بھی معلوم ہو جائے کہ اسلامی معاشرے میں ان کی سازشیں رنگ نہیں لاسکتیں۔

ارشاد ہوتا ہے: وہ جو نیک مومنین کے صدقات اور صدقِ دل سے کی گئی امداد میں سے عیب ڈھونڈتے ہیں اور خصوصاً جو ان نادار اہل ایمان کا مذاق اڑاتے ہیں جو تھوڑی سی مدد کے علاوہ طاقت نہیں رکھتے خدا ان کا مذاق اڑاتا ہے اور دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے ﴿الَّذِينَ يَلْمِزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾۔

”یلمزون“ ”لمز“ (بروزن ”طنز“) کے مادہ سے عیب جوئی کے معنی میں ہے اور ”مطوعین“ مادہ ”طوع“ (بروزن ”موج“) سے اطاعت کے معنی میں ہے لیکن عام طور پر یہ لفظ نیک لوگوں کے لئے اور ان کے لئے استعمال ہوتا ہے جو واجبات کے علاوہ مستحبات بھی بجالاتے ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ منافق کچھ لوگوں کی عیب جوئی کرتے تھے اور کچھ کا مذاق اڑاتے تھے۔ واضح ہے مذاق ان افراد کا اڑاتے تھے کہ جو لشکر اسلام کی صرف تھوڑی سی امداد کی طاقت رکھتے تھے اور یقیناً عیب جوئی ان افراد کی کرتے تھے جو ان کے برعکس بہت زیادہ امداد کرتے تھے۔ زیادہ امداد کرنے والوں کو ریاکاری کا الزام دیتے تھے اور کم امداد کر سکنے والوں کی تحقیر کرتے تھے۔

بعد الٰہی آیت میں ان منافقین کی سزا کے بارے میں بہت تاکید آئی ہے اور انھیں آخری وارننگ دی گئی ہے،۔
روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے:

ان کے لئے استغفار کرو یا نہ کرو یہاں تک کہ ستر مرتبہ بھی ان کے لئے استغفار اور طلبِ بخشش کرو تو بھی انہیں ہرگز نہیں بخشے گا (اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ)۔

کیونکہ انہوں نے خدا اور اس کے رسول کا انکار کیا ہے اور کفر کی راہ اختیار کی ہے اور اسی کفر نے انہیں نفاق کی پستی اور برے انجام سے دوچار کیا ہے (ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ)۔

اور واضح ہے کہ خدا کی ہدایت ایسے لوگوں کی میسر آئے گی جو حق طلبی کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں اور حقیقت کے متلاشی ہیں۔ لیکن خدا فاسق، گنہگار اور منافق افراد کو ہدایت نہیں کرتا ﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ کام کی اہمیت کیفیت سے ہے کمیت سے نہیں :-

آیاتِ قرآنی کو دیکھتے ہوئے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اسلام کسی مقام پر بھی ”کثرتِ عمل“ پر بھروسہ نہیں کرتا بلکہ اس سے ہر جگہ ”کیفیتِ عمل“ کو اہمیت دی ہے۔ اسلام کی نظریں خلوص اور پاک نیت کی بہت زیادہ قیمت ہے۔ مندرجہ بالا قرآن کی اس منطق کا ایک نمونہ ہیں۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ ایک مسلمان کارکن ایک چھوٹے کام کے لئے رات بھر نہیں سویا۔ اس کا دل عشقِ خدا، اخلاص اور احساسِ مسئولیت سے معمور تھا۔ اسی لئے وہ اسلامی معاشرے کی مشکلات کے حل کے لئے کام میں لگا رہا اور اس طرح اس نے اسلامی فوج کے لئے ایک من کھجور مہیا کی۔ اس نے حساس لمحات میں اسلام کی جو خدمت کی قرآن نے اسے بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور جو لوگ ایسے بظاہر چھوٹے اور در حقیقت بڑے اعمال کی تحقیر کرتے ہیں ان کی سخت مذمت کی ہے قرآن کہتا ہے :

”وَرَدْنَاكَ عَذَابِ انْ كَے انتظاریں ہے“

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ایک صحیح معاشرے میں مشکلات کے وقت سب لوگوں کو احساسِ ذمہ داری کا ثبوت دیا جائیے۔ ان مواقع پر صرف اہل اقتدار ثروت کی طرف نہیں دیکھنا چاہئے کیونکہ اسلام کا تعلق سب سے ہے اور سب کو چاہئے کہ اس کی حفاظت کے لئے دل و جان سے کوشش کریں۔

اہم بات یہ ہے کہ ہر شخص اپنی طاقت کے حساب سے دریغ نہ کرے مسئلہ زیادہ اور کم نہیں بلکہ احساسِ ذمہ داری اور اخلاص کا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرم سے سوال ہوا: ای الصدقة افضل
کونسا صدقہ افضل ہے۔

آپ نے فرمایا: جہد المقل
کم آمدنی والے اشخاص کی توانائی کی مقدار

۲۔ منافقین کی صفات ہر دور میں ایک جیسی ہیں:

مندرجہ بالا آیات میں زمانہ پیغمبر کے منافقین کے بارے میں ہم نے جو صفت پڑھی ہے۔
صفات کی طرح اسی زمانہ کے منافقین سے مخصوص نہیں ہے۔ یہ صفت ہر دور کے منافقین کی پست صفات میں سے
ایک ہے وہ اپنی بدنیتی کے مخصوص مزاج کے ساتھ کوشش کرتے ہیں کہ ہر مثبت کو غلط انداز میں پیش کر کے بے اثر
کریں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر نیک شخص کی کسی نہ کسی طرح حوصلہ شکنی کریں اور اسے کارِ خیر کی انجام دہی میں
سست کردیں۔ یہاں تک کہ وہ کم آمدنی والے افراد کی خدمت کی اہمیت کو کم کر کے پیش کرتے ہیں اور ان کی شخصیت کو
مجروح کرنے اور ان کی توہین کرنے کے لئے ان کے کام کا تمسخر اڑاتے ہیں وہ یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں تاکہ تمام
مثبت کارکردگیاں ختم ہو جائیں اور وہ اپنے برے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔

آگاہ اور ریدار مغز مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر زمانے میں ان کی قبیح سازش کی طرف متوجہ رہیں۔ ان کے بالکل
برعکس قدم اٹھائیں معاشرے کی خدمت کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں اور ایسی خدمت جو ظاہراً چھوٹی ہوں لیکن
خلوص دل سے انجام پائی ہوں ان کی زیادہ قدر دانی کریں تاکہ چھوٹا بڑا اپنے کام میں شوق و ذوق اور دلجمعی سے لگن رہے
۔ نیز سب مسلمانوں کو منافقین کی اس تباہ کن سازش سے آگاہ کرنا چاہیے تاکہ وہ ہمت نہ ہاریں۔

۳۔ ”﴿سخر الله منهم﴾“ کا مفہوم:

اس کا لفظی معنی ہے ”خدا ان سے تمسخر کرتا ہے“ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا بھی ان جیسے کام انجام دیتا
ہے بلکہ جیسا کہ مفسرین نے کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ استہزاء کرنے والوں کو سزا دے گا یا ان سے ایسا سلوک
کرے گا کہ تمسخر اڑانے والوں کی طرح ان کی تحقیر و تذلیل ہو۔

۴۔ ”سبعین“ سے مراد:

اس میں شک نہیں کہ ”سبعین“ (ستر) کا عدد زیر نظر آیت میں کثرت کے لئے ہے نہ کہ تعداد کے لئے۔ دوسرے لفظوں میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے لئے جتنی بھی استغفار کریں خدا انہیں نہیں بخشے گا۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے ایک شخص دوسرے سے کہے کہ اگر تم سو مرتبہ بھی اصرار کرو تو میں قبول نہیں کروں گا اس بات کہ یہ مطلب نہیں کہ اگر ایک سو ایک مرتبہ اصرار کرو تو پھر قبول کر لوں گا بلکہ مراد یہ ہے کہ بالکل قبول نہیں کروں گا۔

ایسی تعبیر فی الحقیقت تاکید مطلب کے لئے ہوتی ہے اسی لئے سورہ منافقون آیہ ۶ میں یہ بات نفی مطلق کی صورت میں ذکر ہوئی ہے، جہاں فرمایا گیا ہے: ﴿سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ﴾

اس میں کوئی فرق نہیں کہ تم ان کے لئے مغفرت طلب کرو یا نہ کرو خدا انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔

اس بات پر ایک اور شاید وہ علت ہے جو آیت کے ذیل میں ذکر ہوئی ہے اور وہ یہ کہ ”انھوں نے خدا اور اس کے رسول سے کفر کیا ہے اور خدا فاسقوں کو ہدایت نہیں کرتا“

واضح ہے کہ ایسے افراد کے لئے جتنی استغفار اور طلب بخشش کی جائے ان کی نجات کا سبب نہیں ہو سکتی۔

تعب کی بات ہے کہ اہل سنت کی طرق سے منقول متعدد روایات میں ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ نے فرمایا: لَا يَدْنِي فِي الْاِسْتِغْفَارِ لَهُمْ عَلَى سَبْعِينَ مَرَّةً : رَجَاءٌ مِنْهُ اَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ، فَنَزَلَتْ : سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ۔

خدا کی قسم! میں ان کے لئے ستر مرتبہ سے بھی زیادہ استغفار کروں گا اور اس امید پر کہ خدا انہیں بخش دے اور اس وقت (سورہ منافقوں کی) یہ آیت نازل ہوئی (جس میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے)

کچھ فرق نہیں چاہے ان کے لئے استغفار کرو چاہے نہ کرو خدا انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔ (۱)

مندرجہ بالا روایت کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ نے مندرجہ بالا آیت میں ستر کے عدد سے تعداد مراد لی لہذا فرماتا ہے کہ ”میں ان کے لئے ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار کروں گا۔“

حالانکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں زیر بحث آیت خصوصاً اس علت کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے جو اس کے ذیل میں آئی ہے ہمیں وضاحت سے سمجھاتی ہے کہ ستر عدد کثرت کے مفہوم میں آیا ہے اور یہ نفی مطلق کے لئے کنایہ ہے اور اس میں تاکید مضمّن ہے لہذا مذکورہ بالا روایات چونکہ قرآن کے مخالف ہیں لہذا ہرگز قابل قبول نہیں ہیں خصوصاً جبکہ ہماری نظر میں ان کی اسناد بھی معتبر نہیں ہیں۔

مذکرہ بالا روایات کی واحد توجیہ یہ کی جاسکتی ہے (اگرچہ خلافِ ظاہر ہے) کہ رسول اللہ مندرجہ بالا آیات کے فزول سے پہلے یہ جملہ فرمایا کرتے تھے اور جب یہ آیات نازل ہوئیں تو آپ نے ان کے لئے استغفار کرنے سے صرفِ نظر کر لیا۔ اس بارے میں ایک اور روایت نقل ہوئی ہے اور ممکن ہے کہ مذکورہ بالا روایات بنیادی ہی روایت ہو جو ”نقل المعنی“ کی وجہ سے غلط ملط ہو گئی ہو۔ روایت یہ ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:

لوعلمت انه لو زدت على السبعين مرة غفر لهم لفعلت

اگر مجھے معلوم ہو کہ میرے ستر بار سے زیادہ استغفار کرنے سے خدا انھیں بخش دے گا تو میں ایسا کرتا۔ اس کا مفہوم (خصوصاً لفظ ”لو“ کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو استناع کے لئے ہے) یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ خدا انھیں نہیں بخشے گا لیکن میرا دل بندگان خدا کی ہدایت اور ان کی نجات کے شوق سے اس قدر لبریز ہے کہ اگر بالفرض ستر مرتبہ سے زیادہ مرتبہ استغفار کرنے سے ان کی نجات ہو سکتی تو میں ایسا ہی کرتا۔ بہر حال مندرجہ بالا آیت کا مفہوم واضح ہے اور جو حدیث ان کے برخلاف ہو اس کی یا توجیہ و تاویل کرنا پڑے گی یا اسے پھینک دینا ہوگا۔

آیات ۸۱، ۸۲، ۸۳

۸۱- ﴿فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُولِ اللَّهِ وَكَرِهُوا أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوا يَفْقَهُونَ﴾۔

۸۲- ﴿فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾۔

۸۳- ﴿إِنْ رَجَعَكَ اللَّهُ إِلَى طَائِفَةٍ مِنْهُمْ فَاسْتَأْذِنُواكَ لِلْخُرُوجِ فَقُلْ لَنْ تُخْرَجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَنْ تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا إِنَّكُمْ رَضِيتُمْ بِالْفُتُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَافْعَدُوا مَعَ الْخَالِفِينَ﴾۔

ترجمہ

۸۱- (جنگ تبوک سے) کنارہ کشی کرنے والے جو رسول خدا کی مخالفت سے خوش ہیں اور وہ راہ خدا میں اپنے اموال اور جان سے جہاد کرنے کو ناپسند کرتے تھے (اور ایک دوسرے سے اور مومنین سے) کہتے ہیں کہ اس موسم گرما میں (میدان کی طرف) حرکت نہ کریں انھیں کہہ دو کہ جہنم کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے، اگر تم میں سمجھ ہے۔
۸۲ انھیں چاہیے کہ تھوڑا ہنسیں اور زیادہ روئیں یہ ان کا رکوردگیوں کی جزا ہے جو وہ کرتے تھے۔

۸۳- جب خدا تجھے ان کے کسی گمروہ کی طرف پلٹائے اور وہ تجھ سے (میدان جہاد کی طرف) خروج کی اجازت چاہیں تو ان سے کہہ کہ تم کبھی میرے ساتھ خروج نہیں کرو گے اور میری معیت میں کبھی دشمن کے ساتھ جنگ نہیں کرو گے۔

منافقین کی ایک اور غلط حرکت

ان آیات میں بھی منافقین کے افکار و اعمال کا اذخر جاری ہے تاکہ مسلمان واضح طور پر اس گمروہ کو پہچان لیں اور ان کے غلط منصوبوں اور سازشوں کا شکار نہ ہوں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ جنھوں نے (تبوک میں) جہاد میں شرکت نہیں کی اور بے ہودہ بہانے کر کے اپنے گھروں میں بیٹھے رہے اور اپنے گمان میں انھوں نے میدان جنگ میں خطرات پر سلامتی کو دی ترجیح دی، وہ رسول خدا کے خلاف اس عمل پر خوش ﴿فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُولِ اللَّهِ﴾۔

اور راہ خدا میں مال و جان سے جہاد کرنے اور مجاہدین کے عظیم اعزازات و افتخارات حاصل کرنے کا ناپسند کرتے ہیں ﴿وَكَرِهُوا أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾۔

انھوں نے میدان جہاد میں شرکت نہ کرنے پر قناعت نہیں کی بلکہ وہ شیطانی وسوسوں سے دوسروں کو بھی بدول کرنے یا پھر نے کی کوشش میں تھے۔ انھوں نے دوسروں سے کہا: موسم گرما کی اس جلا دینے والی گرمی میں میدان جنگ کی طرف نہ جاؤ ﴿وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ﴾۔

در حقیقت وہ ایک تو مسلمانوں کے ارادوں کو کمزور کرنا چاہتے ہیں اور دوسرا اپنے جرم میں بہت سے افراد کو شریک کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد قرآن پیغمبر اکرم کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انھیں دو توک الفاظ میں اور تنبیہ کرتے ہوئے ”کہہ دو کہ دوزخ کی جلا دینے والی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے اگر تم سمجھو ﴿قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوا يَفْقَهُونَ﴾۔

لیکن وہ کمزور ایمان اور نا سمجھی کی وجہ سے توجہ نہیں کرتے کہ کیسی جلا دینے والی آگ ان کے انتظار میں ہے، ایسی آگ کہ جس کی چھوٹی سی چنگاری دنیا کی ہر قسم کی آگ سے زیادہ جلا دینے والی ہے۔

بع دکی دو آیتیں اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ وہ اس گمان میں ہیں کہ انھیں کامیابی حاصل ہو گئی ہے، جہاد سے دور رہنے والے اور مجاہدین کے حوصلے پست کرنے سے وہ اپنے ہدف کو پہنچ گئے لہذا وہ قہقہے لگاتے ہیں جیسا کہ ہر دور کے منافقین کرتے رہے ہیں لیکن قرآن انھیں خطرے سے ڈراتے ہوئے کہتا ہے: انھیں تھوڑا ہنسنا چاہیے اور زیادہ رونا چاہیے ﴿فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا﴾۔

ہاں انھیں رونا چاہیے اپنے تاریک مستقبل پر اور ان دردناک سزاؤں پر جو ان کے انتظار میں ہیں انھیں رونا چاہیے اس بنا پر کہ وہ واپسی کے راستے کے تمام پلوں کو برباد کر چکے ہیں۔ انھیں رونا چاہیے کہ وہ اپنی تمام تر استعداد اور زندگانی کا سرمایہ دے کر اپنے لئے رسوائی اور بد بختی خرید چکے ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے۔ یہ ان کے اعمال کی سزا ہے جو وہ انجام دیتے تھے ﴿جَزَاءٌ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾۔ ہم نے جو کچھ کہا اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ اس جہان میں ہنسیں کم اور روئیں زیادہ۔ کیونکہ آگے ان کے لئے ایسی دردناک سزا ہے کہ اگر اس سے آگاہ ہو جائیں تو بہت روئیں اور ہنسیں بہت کم۔

لیکن بعض مفسرین نے اس جملے کے معنی کے متعلق ایک اور احتمال بھی ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جتنا بھی ہنسیں دیان کی عمر اتنی تھوڑی ہے کہ وہ پھر بھی کم ہے اور آخرت میں وہ اتنا روئیں گے کہ دنیاوی گریہ وزاری اس کے مقابلے میں بہت حقیر ہے۔

لیکب پہلی تفسیر ظاہر آیت سے اور تقریر و تحریر میں استعمال ہونے والی اس سے مشابہ تعبیرات سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے خصوصاً جب کہ دوسری تفسیر کا لازمہ یہ ہے کہ صیغہ امر اخبار کے معنی میں ہو اور یہ خلافِ ظاہر ہے۔ ایک مشہور حدیث میں کہ جسے بہت سے مفسرین نے پیغمبر اکرم سے نقل کیا ہے، آپ نے فرماتے ہیں:

”لَا تَعْلَمُونَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيلًا وَ لَبَكَيْتُمْ كَثِيرًا“

اگر اسے جو (قیامت کی ہولناک سزاؤں کے متعلق) جانتا ہوں تم بھی جانتے تو ہنستے کم اور روتے زیادہ۔ یہ حدیث بھی پہلے معنی پ را یک شاہد ہے (غور کیجئے گا)۔

زیر بحث آخری آیت میں منافقین کی ایک اور سچی سمجھی خطرناک روش کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ جب کسی غلط کام کو ظاہر بظاہر انجام دیتے ہیں تو اپنی برات کے لئے تلافی کرنے کے عزم ک اظہار کرتے ہیں اور اس طرح اپنی بدعات اور خلافِ اسلام حرکات کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آیت کہتی ہے: جس وقت خدا تجھے ان کے کسی گروہ کی طرف پلٹائے اور وہ تجھ سے جہاد کے دوسرے میدان میں شرکت کی اجازت چاہیں تو ان سے کہہ دو کہ تم میرے ساتھ کبھی میدان جہاد میں شرکت نہ کر سکو گے اور میری معیت میں کبھی کسی دشمن سے نہیں لڑو گے ﴿فَإِنْ رَجَعَكَ اللَّهُ إِلَى طَائِفَةٍ مِنْهُمْ فَاسْتَأْذِنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُلْ لَنْ تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَنْ تُفَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا﴾۔

یعنی رسول اللہ انھیں ہمیشہ کے لئے مایوس کر دیں اور واضح کر دیں کہ ان کی حنارنگ نہیں لانے گی اور کبھی کوئی ان کے فریب میں نہیں آئے گا اور کیا ہی اچھا ہو کہ وہ مکرو فریب کہ یہ جال کہیں اور لے جائیں کیونکہ یہاں اب کوئی ان کے دام فریب میں نہیں آئے گا۔

اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ”طائفۃ منہم“ (ان میں سے ایک گروہ) کے الفاظ نشانہ ہی کرتے ہیں کہ وہ سب ایسا کرنے کو تیار نہ تھے اور دوسرے جہاد میں شرکت پر آمادگی کا اظہار سے سب نے نہیں کیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے بعض اس قدر رسوا اور شرمندہ تھے کہ وہ اس رسول اللہ کی خدمت میں پیش ہو کر اپنی یہ تجویز ہی پیش نہیں کر سکتے تھے۔

اس کے بعد ان کی پیش کش قبول نہ کرنے کی دلیلیوں بیان کی گئی ہے: میدانِ جہاد سے کنارہ کشی کرنے اور گھروں میں بیٹھ رہنے پر تم پہلے بھی راضی ہو چکے ہو پھر اب بھی منہ موڑنے والوں کے ساتھ مل جاؤ اور ان کے ساتھ گھروں میں بیٹھ جاؤ ﴿إِنَّكُمْ رَضِيتُمْ بِالْقُعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوا مَعَ الْخَالِفِينَ﴾۔

چند توجہ طلب نکات

۱۔ دوسرے جہاد میں شرکت کی حقیقت:

اس میں شک نہیں کہ اگر یہ منافقین جہاد سے ایک مرتبہ منہ موڑنے کے بعد پشیمان ہوتے، توبہ کر لیتے اور اپنے سابقہ گناہوں کی تلافی کے لئے دوسرے جہاد میں شرکت کی پیش کش کرتے تو خدا تعالیٰ ان کی پیش کش قبول کر لیتا اور رسول اللہ ان کی درخواست رد نہ کرتے۔ اس بنا پر معلوم ہوتا ہے کہ پیش کش بھی ایک طرح کی شیطنت اور منافقت تھی۔ دراصل یہ اپنے مکروہ چہرے کو چھپانے اور سابقہ اعمال جاری رکھنے کی ایک تکنیک تھی۔

۲۔ لفظ ”خالف“ کا مفہوم:

یہ لفظ ’متخلف‘ کے معنی میں ہے جو کہ ایسے اشخاص کی طرف اشارہ ہے کہ جو عذرو معذرت کے ساتھ یا بغیر کسی عذر کے میدان جہاد میں شرکت نہیں کرتے تھے۔

بعض نے یہ بھی کہا کہ ”خالف“ مخالفت کے معنی میں ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ تم بھی چلے جاؤ اور مخالفوں کے ہم آواز بن جاؤ اس لفظ کا ایک مفہوم ”فاسد“ بھی بیان کیا گیا ہے کیونکہ ”خلف“ - ”فساد“ کے معنی میں ہے اور ”خالف“ لغت میں ”فاسد“ کے معنی میں آیا ہے۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں اس لفظ سے تمام مذکورہ معانی مراد ہوں کیونکہ منافقین اور ان کے ساتھی ان تمام صفات رذیلہ کے حامل تھے۔

۳۔ دور حاضر میں ہماری ذمہ داری اور منافقین کی روش:

اس امت کی ہم دوا برہ یاد دہانی ضروری سمجھتے ہیں کہ دور حاضر کے مسلمان بھی اپنے معاشرے کے منافقین جو گذشتہ ادوار کے منافقین کی روش پر گمازن ہیں کے بارے میں رسول اللہ کے اسی محکم طریقے کی پیروی کریں اور ایک دفعہ ان کے دام فریب میں آنے کے بعد دوسرے مرتبہ ان سے دھوکا نہ کھائیں اور ان کے مگر مجھ کے آنسوؤں کو کوئی اہمیت نہ دیں کیونکہ: ”کیونکہ ایک مسلمان ایک ہی جال میں دو مرتبہ نہیں پھنستا“۔

آیات ۸۵، ۸۴

۸۴- ﴿وَلَا تَصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَاسِقُونَ﴾ -

۸۵- ﴿وَلَا تَعْجَبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ﴾ -

ترجمہ

۸۴- ان میں سے جو بھی مر جائے اس کی نماز جنازہ نہ پڑھو اور اس کی قبر پر (دعا اور طلبِ بخشش کے لئے) کھڑا نہ ہو کیونکہ انھوں خدا اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور جب وہ دنیا سے گئے ہیں تو فاسق تھے۔

۸۵- ان کے اموال اور اولاد تیرے لیے باعثِ تعجب نہ ہوں (کیونکہ یہ ان کے لیے نعمت نہیں بلکہ) خدا چاہتا ہے کہ ان کے ذریعے انھیں دنیا میں عذاب کرے اور ان کی روحیں اس حالت میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔

منافقین کے بارے میں زیادہ اقدام

جب منافقین نے کھلے بندوں جہاد سے منہ موڑ کر خود پردے چاک کر دئے اور ان کا معاملہ واضح ہو گیا تو خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ وہ زیادہ صریح اور زیادہ مستحکم طریقے سے اقدام کریں تاکہ دوسروں کے دماغ سے ہمیشہ کے لئے نفاق اور منافق سازی کی فکر نکل جائے اور منافقین بھی جان لیں کہ اسلامی معاشرے میں ان کے لئے کوئی جگہ اور مقام باقی نہیں رہا۔

لہذا قرآن فرماتا ہے۔ (منافقین میں سے) جو کوئی بی مر جائے اس کی نامز کبھی نہ پڑھو ﴿وَلَا تَصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا﴾۔ اور کبھی بھی اس کی قبر کے پاس طلبِ بخشش کے لئے کھڑا نہ ہو ﴿وَلَا تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ﴾۔

فی الحقیقت یہ منافقین سے ایک قسم کی منفی اور موثر جنگ ہے کیونکہ ان وجوہ سے پاک کرنے کا حکم نہیں دے سکتے تھے لیکن انھیں کافی حد تک بے اعتبار کرنے، کنارہ کش کرنے اور اسلامی معاشرے سے نکال باہر پھینکنے کے لئے مقابلے کے ایسے منفی طریقے بہت موثر تھے۔

ہم جانتے ہیں کہ ایک سچا مومن زندگی میں بھی محترم ہے موت کے بعد بھی اس لئے اسلام نے اس کے غسل، کفن اور دفن کا حکم دیا ہے تاکہ اسے زیادہ اور خاص احترامات کے ساتھ سپرد خاک کیا جائے یہاں تک کہ اسے دفن کرنے کے بعد اس کی قبر کے پاس آکر اس کے احتمالی گناہوں اور لغزشوں کی خدا سے بخشش طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اب یہ مراسم اگر کسی شخص کے لئے انجام نہ دئے جائیں تو یہ گویا اسے اسلامی معاشرے سے باہر نکال کر پھینکنے کے مترادف ہے اور اگر اس شخص کو مسترد کر دینے والی شخصیت پیغمبر اکرم کی ہو تو اس مسترد شدہ شخص کے مقام پر ایک سخت ضرب ہوگی۔ درحقیقت یہ سرد جنگ اور مقابلے کا ایک چماتا طریقہ ہے۔ دور حاضر میں بھی منافقین کے بارے میں مسلمانوں کو ایسے طریقوں سے کام لینا چاہیئے یعنی جب تک کچھ افراد اظہار اسلام کرتے ہیں اور ظواہر اسلام کے پابند ہیں تو ان سے ایک مسلمان جیسا سلوک کیا جائے اگرچہ ان کا باطن کچھ اور ہو۔ لیکن اگر وہ خود پردے چاک کر دیں اور اپنا نفاق ظاہر کر دیں تو پھر ان سے اسلام سے بیگانہ افراد کا سا سلوک کرنا چاہیئے۔

آیت کے آخر میں ایک بار پھر اس حکم کی دلیل واضح کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے: ”یہ حکم اس بنا پر ہے کہ انھوں نے خدا اور اس کے رسول سے کفر اختیار کیا ہے“ ﴿إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾۔ ”اور جب یہ لوگ دنیا سے گئے ہیں تو فاسق اور فرمان خدا کے مخالف تھے“ وہ نہ اپنے کئے پر پشیمان ہوئے اور نہ ہی توبہ کے پانی سے انھوں نے اپنا گناہ آلودہ دامن دھویا ہے ﴿وَمَاتُوا وَهُمْ فَاسِقُونَ﴾۔

ملکین ہے اس مقام پر مسلمانوں سے یہ سوال کیا جائے کہ اگر منافقین سچ مچ رحمت الہی سے اس قدر ہیں اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ ان سے محبت اور لگاؤ رکھیں تو پھر خدا نے ان سے اس قدر اظہار محبت کیوں کیا ہے اور یہ سب مال اور اولاد (اقتصادی اور افرادی قوت) انھیں کیوں دی ہے۔

اگلی آیت میں روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے خدا تعالیٰ نے اسی سوال کا جواب دیا ہے: ان کے اموال و اولاد تمہیں کبھی بھی معلوم نہ ہوں ﴿وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ﴾۔ کیونکہ ظاہر بین لوگ انھیں خوش بختی کی علامت سمجھتے ہیں لیکن ”خدا چاہتا ہے کہ انھیں ان کے ذریعے دنیا میں سزا دے اور ول حالت کفر میں مریں“ ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِمَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ﴾۔

اس آیت کی نظیر اسی سورہ کی آیہ ۵۵ بھی ہے یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اقتصادی اور افرادی وسائل غیر صالح افراد کے ہاتھ میں ہوں تو نہ صرف سعادت بخش نہیں ہیں بلکہ اکثر اوقات دردِ سر، مصیبت اور بد بختی کا سبب بھی ہیں کیونکہ ایسے نہ اپنے مال کو بر محل صرف کرتے ہیں کہ ان سے مفید اور اصلاحی نفع حاصل کر سکیں اور نہ ہی ان کی اولاد صحیح راہ پر چلنے والی، صاحب ایمان اور تربیت یافتہ ہوتی ہے کہ جو ان کی آنکھوں کا نور بن سکے اور ان کی زندگی کی مشکلات حل کر سکے ان کے اموال زیادہ تر ہلاک کر دینے والی سرکش ہوا و ہوس کے لئے فتنہ و فساد پیدا کرنے کے لئے

اور ظلم کے ستونوں کو مستحکم کرنے کے لئے صرف ہوتے ہیں۔ یہ دراصل خدا فراموشی اور زندگی کے بنیادی مسائل سے غفلت کے سبب ہے ان کی اولاد بھی ظالموں اور فاسد لوگوں کی خدمت میں لگ جاتی ہے اور آخر کار مصیبت ہی کا باعث ہوتی ہے۔

البتہ جو لوگ دولت اور افرادی قوت کو بنیادی چیز خیال کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ اسے کس طرح صرف کرنا چاہیئے دور سے تو ان کی زندگی بڑی دلفریب معلوم ہوتی ہے لیکن اگر ان کی اصل زندگی کو ہم قریب سے دیکھیں اور اس حقیقت کی طرف بھی توجہ رکھیں کہ ان وسائل سے کس طرح استفادہ کیا جانا مقصود ہے تو ہم تصدیق کریں گے کہ وہ خوش بخت لوگ نہیں ہیں۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ شان نزول کی اختلافی روایات:

پہلی آیت کی شان نزول کے بارے میں تعدد روایات وارد ہوئیں ہیں جو باہم اختلاف رکھتی ہیں۔ ان میں سے کچھ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مشہور منافق عبد اللہ بن ابی مرگیا تو پیغمبر نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور اس کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر دعا کی۔ یہاں تک کہ اپنا پیرا ہن کفن کے طور اسے پہنایا تو آیت نازل ہوئی اور پیغمبر اکرم کو ایسے عمل کی تکرار سے روکا گیا۔

جب کہ دوسری روایات سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ رسول اللہ اس کی نماز جنازہ پڑھنا چاہتے تھے کہ جبریل نازل ہوئے اور آپ کے سامنے اس آیت کی تلاوت کی اور آپ کو اس کام سے منع کیا۔

کچھ اور روایات سے ظاہر ہوتا ہے نہ تو رسول اللہ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور نہ ہی آپ ایسا کوئی ارادہ رکھتے تھے بلکہ عبد اللہ کے خاندان کی تشویق کے لئے صرف اپنا پیرا ہن کفن کے طور بھیجا جب لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے یہ کام کیوں کیا ہے جبکہ وہ بے ایمان شخص ہے تو آپ نے فرمایا: میرا پیرا ہن اس لئے کہ عذاب الہی سے نجات کا باعث نہیں ہوگا لیکن مجھے امید ہے کہ اس عمل کی وجہ سے بہت سے لوگ مسلمان ہو جائیں گے۔

اور ایسا ہی ہوا کہ اس واقعہ کے بعد قبیلہ خزرج کے بہت سے افراد مسلمان ہو گئے

یہ روایات چونکہ آپس میں بہت اختلاف رکھتی ہیں اس لئے ہم ان سے شانِ نزول کی حیثیت سے صرف نظر کرتے ہیں خصوصاً جبکہ بعض مفسرین کے بقول عبداللہ بن ابی کی موت ۹ ھ میں واقع ہوئی اور زیرِ نظر آیات تقریباً ۸ ھ میں نازل ہوئیں۔ (المیزان جلد ۹ ص ۳۸۵)۔

لیکن جو بات قابلِ انکار نہیں ہے وہ یہ ہے کہ آیت کے لب و لہجہ سے یوں لگتا ہے کہ رسول اللہ اس کے نزول سے پہلے منافقین کی نماز جنازہ پڑھتے تھے اور ان کی قبر کے پاس کھڑے ہوتے تھے کیونکہ وہ ظاہراً مسلمان تھے۔
۲ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد بھی منافقین کی نماز جنازہ پڑھتے تھے مگر صرف چار تکبیریں کہتے تھے یعنی آخری تکبیر جو میت پر دعا کرنے سے مربوط ہے اس سے صرف نظر کر لیتے تھے۔
یہ روایت اس صورت میں قابلِ قبول ہو سکتی ہے کہ محلِ آیت میں ”لا تصل“ کا معنی ”دعا نہ کرو“ لیا جائے۔ لیکن اگر اس کا مطلب ہے ”نماز نہ پڑھو“ تو پھر یہ روایت مخالفِ قرآن ہے اس لئے قابلِ قبول نہیں ہے۔
اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ”لا تصل“ کا ظاہری معنی ”نماز نہ پڑھو“ ہی ہے لہذا ہم اسلامی حکم کی رو سے ایسے افراد کی نماز جنازہ نہیں پڑھ سکتے جن کا نفاق ظاہر ہو اور ایک ایک مہم روایت کی وجہ سے ہم مندرجہ بالا آیت سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔
مگر اس آیت کے نزول کے بعد یہ طریقہ بالکل متروک ہو گیا۔

۲۔ مومنین کی قبروں کے پاس کھڑے ہونا اور دعا کرنا:

زیرِ بحث آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنین کی قبروں کے پاس کھڑے ہونا اور ان کے لئے دعا کرنا جائز ہے آیت میں نہی منافقین کے ساتھ مخصوص ہے
اس بنا پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ مومنین کی قبور کی زیارت کرنا یعنی ان کی قبروں کے پاس کھڑے ہونا اور دعا کرنا جائز ہے۔

البتہ زیرِ بحث آیت مومنین کی قبور سے متوسل ہونے اور ان کی برکت سے خدا سے کسی حاجت کا تقاضا کرنے کے مسئلے میں خاموش ہے اگرچہ اس امر کا جائز ہو روایاتِ اسلامی کی نظر سے مسلم ہے۔

آیات ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹

۸۶- ﴿وَإِذَا أَنْزَلْتُ سُورَةً أَنْ آمَنُوا بِاللَّهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذِنَكَ أُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُنْ مَعَ الْقَاعِدِينَ﴾۔

۸۷- ﴿رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ﴾۔

۸۸- ﴿لَكِنَّ الرِّسُولَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْخَيَرَاتُ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾۔

۸۹- ﴿أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾۔

ترجمہ

۸۶- اور جب کوئی سورت نازل ہو کہ خدا پر ایمان لے آ اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو ان (منافقین) میں سے جو تو انائی رکھتے ہیں تجھ سے اجازت چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بیٹھ رہنے والوں (جن پر جہاد معاف ہے) کے ساتھ چھوڑ دیجئے۔

۸۷- وہ اس بات پر راضی ہیں کہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوں اور ان کے دلوں پ رہر لگادی گئی ہے لہذا وہ نہیں سمجھے۔

۸۸- لیکن رسول اور وہ افراد جو ان کے ساتھ ایمان لائے ہیں انھوں نے اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کیا ہے اور سب نیکیاں ان کے لئے اور وہی کامیاب ہیں۔

۸۹- اے ان کے لئے جنت کے باغات تیار کر رکھے ہیں کن درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ اس میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے اور یہ بہت بڑی اور عظیم کامیابی ہے۔

پست ہمت افراد اور سچے مومنین

ان آیات میں بھی منافقین کے بارے میں گفتگو ہے البتہ یہاں ان کی بد کاریوں کا سچے مومنین کے نیک کاموں سے موازنہ کیا گیا ہے اور اس سے ان کا انحراف اور بے چارگی زیادہ واضح ہوتی ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: جس وقت کوئی سورت جہاد کے بارے میں نازل ہوتی ہے اور لوگوں کو خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتی ہے (یعنی کہتی ہے کہ اپنے ایمان پر ثابت قدم رہو اور اسے مستحکم کرو) اور پیغمبر کے شامل کر جہاد کرو تو ایسے موقع پر صاحب قدرت منافقین کہ جو جسمانی اور مالی طور پر میدان جنگ میں شرکت کی استعداد رکھتے ہیں تجھ

سے اجازت چاہتے ہیں کہ میدانِ جہاد میں شرکت نہ کریں اور کہتے ہیں کہ ہمیں بیٹھ رہنے والوں (کہ جہاد میں شرکت سے معذور رہیں) کے ساتھ رہنے دیجئے ﴿وَإِذَا أَنْزَلَتْ سُورَةٌ أَنْ آمَنُوا بِاللَّهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا ذَرْنَا نْكُنْ مَعَ الْقَاعِدِينَ﴾۔

”طول“ (بروزن ”قول“) مالی وسائل کے معنی میں آیا ہے اس بنا پر ”اولوا الطول“ سے مراد وہ افراد ہیں جو میدانِ جنگ میں شرکت کے لئے کافی مادی طاقت رکھتے تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ چاہتے تھے کہ ان ناتوان افراد کے ساتھ رہ جائیں جو جنگ میں شرکت کے لئے مالی اور جسمانی طور پر کافی طاقت نہیں رکھتے تھے۔

اس لفظ کی اصل ”طول“ (بروزن ”پول“) ہے جو کہ ”عرض“ کی ضد ہے اور ان دونوں معانی کی آپس میں مناسبت واضح ہے۔ کیونکہ مالی اور جسمانی توانائی ایک طرح سے طاقت اور قدرت کی کشش دوام اور طول کو ظاہر کرتی ہے۔ اگلی آیت میں قرآن ان کی اس جملے کے ذریعے مذمت و ملامت کرتا ہے وہ چاہتے ہیں کہ پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ رہیں ﴿رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ﴾۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے ”خوالف“ ”خالفة“ کی جمع ہے اس کا مادہ ”خلف“ ہے جس کا منعی ہے پشت سر۔ اسی بنا پر عورتوں کو جو مردوں کے گھر سے باہر چلے جانے کے بعد گھر میں باقی رہ جاتی ہیں ”خالفة“ کہا جاتا ہے۔ زیر بحث آیت میں ”خوالف“ سے مراد تمام لوگ ہیں جو کسی وجہ سے میدانِ جنگ میں شرکت کرنے سے معذور ہیں چاہے وہ عورتیں ہوں یا بوڑھے مرد، بیمار ہوں یا بچے۔

بعض احادیث میں جو اس آیت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں وہ بھی اس مار کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: گناہ اور نفاق کے زیر اثر وہ اس مرحلہ تک پہنچ گئے ہیں کہ ان کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہے اسی بنا پر وہ کچھ نہیں سمجھتے ﴿وَطَبَعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ﴾۔

سورہ بقرہ کی ابتدا میں ہم نے دل پر مہر لگانے کے مفہوم پر بحث کی ہے۔ (تفسیر نمونہ جلد اول ص ۱۰۰) (اردو ترجمہ) اگلی آیت میں اس کے مد مقابل گروہ کی صفات و خصوصیات کا ذکر ہے جو کہ بالکل منافقین کی صفات و خصوصیات کے برعکس ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: لیکن رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں انھوں نے اپنے جان و مال سے راہِ خدا میں جہاد کیا ہے ﴿لَكِنَّ الرُّسُولَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ﴾۔

اور ان کا انجام کار یہ ہوا کہ طرح طرح کی سعادتیں، کامیابیاں اور دونوں جہانوں کی مادی و روحانی خیرات انھیں نصیب ہوئیں ﴿وَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ﴾ اور یہی لوگ کامیاب ہیں ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾۔

لفظ ”الخیرات“ جمع کا صیغہ ہے جس پر ”الف لام“ بھی ہے اور اس سے عمومیت کا استفادہ ہوتا ہے یہ ایک ایسی جامع تعبیر ہے کہ جو ہر قسم کی کامیابی، نعمت اور خیر کا مفہوم لئے ہوئے ہے چاہے وہ مادی ہو یا روحانی۔ علم معانی بیان میں جو قواعد بیان ہوئے ہیں ان کے مطابق ان دونوں جملوں کی تعبیرات گواہی دیتی ہیں کہ کامیاب صرف یہی لوگ ہیں اور اسی طرح جوہر قسم کی خیر و سعادت کا استحقاق رکھتے ہیں صرف یہی لوگ ہیں، وہی جو اپنے پورے وجود اور وسائل کے ساتھ جہاد کرتے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایمان اور جہاد اکٹھے ہو جائیں تو پھر ہر طرح کی خیر و برکت اس کے ساتھ ہوگی اور ان دونوں کے بغیر نہ کوئی راستہ فلاح کی طرف جاتا ہے نہ ہی مادی و معنوی نعمات میں کوئی حصہ ملتا ہے۔

یہ نکتہ بھی لائق توجہ ہے کہ ان دونوں گروہوں کی صفات کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ منافق فقدانِ ایمان اور گناہ میں بہت زیادہ آلودگی کی وجہ سے نادان اور جاہل ہیں اور اسی بنا پر عالی ہمتی سے محروم ہیں جو کہ فہم، شعور اور آگہی کی پیداوار ہے وہ اس بات پر راضی ہیں کہ بیماروں اور بچوں کے ساتھ رہ جائیں اور میدانِ جہاد میں شرکت کے فضائل اور افتخارات کے باوجود اس کا انکار کر دیں۔ جب کہ ان کے مقابلے میں اہل ایمان ایسی روشن نگاہی، فہم و ادراک اور عالی ہمتی رکھتے ہیں کہ مشکلات سے نجات کی راہ تمام تر وسائل کے ساتھ جہاد میں شرکت میں سمجھتے ہیں۔

یہ وہی عظیم درس ہے جو قرآن نے اپنی بہت ہی آیات میں ہمیں دیا ہے اور پھر بھی ہم اس سے غافل ہیں۔ زیر بحث آیت میں دوسرے گروہ کی کچھ اخرویی جزاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا نے ان کے لئے باغاتِ بہشت تیار کر رکھے ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری کی گئی ہیں ﴿أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾۔ تاکیداً فرمایا گیا ہے کہ یہ نعمت اور عنایات عاریتاً اور فنا پذیر نہیں ہے بلکہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے ﴿خَالِدِينَ فِيهَا﴾۔ اور یہ عظیم کامیابی ہے ﴿ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾۔

”اعدلہم“ (خدا نے ان کے لئے تیار کیا ہے) یہ تعبیر موضوع کی اہمیت کی دلیل ہے اور اس احترام کی نشانی ہے جو اس گروہ کو خدا کے نزدیک حاصل ہے یعنی اس نے پہلے سے یہ نعمات و عنایات ان کے لئے تیار کر رکھی ہیں۔

آیت ۹۰

۹۰۔ ﴿وَجَاءَ الْمُعَذِّرُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِينَ كَذَبُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ سَيُصِيبُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ

أَلِيمٌ﴾۔

ترجمہ

۹۰۔ اور اعراب میں سے معذور لوگ (تیرے پاس) آئے ہیں کہ انہیں جہاد سے تخلف کی اجازت دی جائے لیکن وہ لوگ جنہوں نے خدا اور اس کے پیغمبر کے ساتھ جھوٹ بولا ہے (بغیر کسی عذر کے اپنے گھریں) بیٹھ گئے ہیں۔ عنقریب ان لوگوں کو جو کافر ہو گئے ہیں (اور معذور نہیں تھے) اور دردناک عذاب پہنچے گا۔

تفسیر

گذشتہ مباحث بہانہ جو اور عذر تراش منافقین کے بارے میں تھیں اسی مناسبت سے اس آیت میں جہاد میں پیچھے رہ جانے والے دو گروہوں کی کیفیت کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

پہلا گروہ وہ ہے جس نے بغیر کسی عذر کے سرکشی کے طور پر اس عظیم ذمہ داری سے روگردانی کی ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے: بادیہ نشین اعراب کا ایک گروہ جو میدان جہاد میں شرکت سے معذور تھا تیرے پاس آیا ہے تاکہ اسے اجازت دی جائے اور معاف رکھا جائے ﴿وَجَاءَ الْمُعَذِّرُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ﴾۔

ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا اور اس کے رسول کے سامنے جھوٹ بولا ہے اور بغیر کسی عذر کے اپنے گھریں بیٹھ گئے ہیں اور میدان میں نہیں گئے ﴿وَقَعَدَ الَّذِينَ كَذَبُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾۔

آیت کے آخر میں دوسرے گروہ کو شدت کے ساتھ تہدید کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے: ان میں سے جو کافر ہوا ہے عنقریب وہ دردناک عذاب میں گرفتار ہوگا ﴿سَيُصِيبُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾۔

جو کچھ ہم نے آیت کی تفسیر میں بیان کیا ہے یہی مفہوم آیت میں موجود قرآن سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے مد مقابل قرار دیے گئے ہیں اور دوسری طرف لفظ ”منہم“ نشاندہی کرتا ہے کہ یہ دونوں گروہ تمام کے تمام کافر نہیں تھے ان میں دو قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ”معذرون“ حقیقی معذور تھے۔

لیکن اس تفسیر کے مقابلے میں اس آیت کی دو اور تفسیریں بھی کی گئی ہیں:

پہلی یہ کہ ”معذرون“ سے مراد وہ لوگ ہیں جو جہاد سے فرار کے لئے فضول، بے ہودہ ار جھوٹے بہانے تراشتے تھے، اور دوسرے گروہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو عذر تراشی کی بھی زحمت نہیں دیتے تھے اور جہاد کے بارے میں کھل کے حکم خدا کی نافرمانی کرتے تھے چاہے وہ سچے ہوں یا جھوٹے۔

مگر قرآن نشانہ ہی کرتے ہیں کہ ’معذرون‘ میراد حقیقی معذور ہی ہیں۔

آیات ۹۱، ۹۲، ۹۳

۹۱- ﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَى وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنْفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾-

۹۲- ﴿وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ﴾-

۹۳- ﴿إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ هُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾-

ترجمہ

۹۱- ضعفاء، بیمار اور وہ جو (جہاد کی راہ میں) خرچ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتے ان پر کوئی اعتراض نہیں (کہ انہوں نے میدانِ جہاد میں شرکت نہیں ہے جب وہ خدا اور اس کے رسول سے خیر خواہی کریں) اور جو کچھ طاقت رکھتے ہیں اس سے دریغ نہ کریں کیونکہ (کیونکہ نیکو کار لوگوں سے مواخذہ نہیں ہو سکتا اور خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

۹۲- نیز ان پر بھی اعتراض نہیں ہو جو جب تیرے پاس آئے کہ تو انہیں (میدانِ جہاد کے لئے) مرکب پر سوار کمرے تو تو نے کہا کہ میرے پاس سواری نہیں ہے کہ جس پر تمہیں سوار کروں تو وہ (تیرے پاس سے) اس حالت میں لوٹے کہ ان کی آنکھیں اشک بار تھیں کیونکہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے وہ راہِ خدا میں خرچ کرتے۔

۹۳- مواخذہ کی راہ ان کے لئے کھلی ہے جو تجھ سے اجازت چاہتے ہیں جب کہ وہ بے نیاز ہیں (اور کافی وسائل رکھتے ہیں) وہ پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ رہ جانے پر راضی ہو گئے ہیں اور خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے۔ لہذا وہ کچھ نہیں جانتے۔

شانِ نزول

پہلی آیت کے بارے میں منقول ہے کہ پیغمبر اکرم کے مخلص اصحاب میں سے ایک نے آپ سے عرض کیا: میں ایک بوڑھا، نابینا اور عاجز شخص ہوں یہاں تک کہ میرے پاس کوئی ایسا شخص بھی نہیں جو میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے میدانِ جہاد میں لے جائے تو کیا میں جہاد میں شرکت نہ کروں تو معذور ہوں؟

پیغمبر اکرم خاموش رہے تو پھر پہلی آیت نازل ہوئی جس میں ایسے افراد کو اجازت دی گئی ہے

اس شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ نابینا افراد تک پیغمبر اکرم کو اطلاع دئے بغیر جہاد میں شرکت سے پہلو تہی نہیں کرتے تھے اور اس احتمال کی بنا پر کہ شاید ان کا وجود اس حالت میں بھی مجاہدین کی تشویق یا کثرت لشکر کے لئے مفید ہو وہ رسول اللہ سے اپنی ذمہ داری کے بارے میں پوچھتے تھے۔

دوسری آیت کے بارے میں بھی روایات میں ہے کہ غریب انصار سے سات افراد رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تقاضا کیا کہ انھیں جہاد میں شرکت کے لئے وسائل مہیا کئے جائیں لیکن چونکہ پیغمبر اکرم کے پاس انھیں مہیا کرنے کے لئے وسائل نہ تھے تو آپ نے انھیں نفی میں جواب دیا۔ وہ اشک آلودہ نگاہوں سے آپ کی بارگاہ سے گئے اور بعد میں ”بکاون“ (رونے والے) کے نام سے مشہور ہوئے۔

وہ معذور جو عشق جہاد میں آسو بہاتے تھے

تمام گروہوں کی کیفیت واضح کرنے کے لئے ان آیات میں جہاد میں شرکت کے لحاظ سے ان کے معذور ہونے کی انہ ہونے کے بارے میں ایک واضح تقسیم بند کی گئی ہے۔ ان میں پانچ گروہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے چار تو واقعاً معذور ہیں اور ایک گروہ منافق اور غیر معذور ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جو ضعیف و ناتوان ہیں (بڑھاپے کے سبب بینائی نہ ہونے کے باعث یا ایسی کسی اور وجہ سے) اسی طرح بیمار اور وہ لوگ جن کے پاس میدان جہاد میں شرکت کے لئے وسائل نہیں ہیں ان پر کوئی اعتراض نہیں کہ وہ اس واجب اسلامی پروگرام میں شرکت نہ کریں

﴿لَيْسَ عَلَى الضَّعْفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَى وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنْفِقُونَ حَرَجٌ﴾

ان تین گروہوں کے لئے ہر قانون میں معافی ہے اور عقل و منطق بھی اس کی تائید کرتی ہے اور مسلم ہے کہ اسلامی قوانین کسی مقام پر بھی عقل و منطق سے جدا نہیں ہیں۔

لفظ ”حرج“ اصل میں کسی چیز کے مرکز اجتماع کے معنی میں ہے اور چونکہ اجتماع اور جمیعت کا تنگی ضیق مکان اور جگہ کی تنگی سے تعلق ہے لہذا یہ لفظ تنگی، ناراضی اور مسئولیت کے معنی میں آیا ہے۔ زیر بحث آیت میں یہ لفظ آخری معنی یعنی مسئولیت، جوابدہی اور ذمہ داری کے معنی میں آیا ہے۔

اس کے بعد ان کی معافی کے حکم کے لئے ایک اہم شرط بیان کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: یہ اس صورت میں ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کے لئے کسی مخلصانہ خیر خواہی سے دریغ نہ کریں ﴿إِذَا نَصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ﴾۔ یعنی اگرچہ وہ ہتھیار

ہاتھ میں لیکر میدان جنگ میں نہیں جاسکتے۔ لیکن وہ یہ تو کر سکتے ہیں کہ اپنی گفتار وہ عمل سے مجاہدین کے شوق کو ابھاریں اور جہاد کے ثمرات و نتائج شمار کر کے ان کے جذبات کو تقویت پہنچائیں اور اس کے برعکس جتنا ہو سکے دشمن کے دلوں کو کمزور کریں اور ان کی شکست کے مقدمات کی فراہمی میں کوتاہی نہ کریں۔ یہ مفہوم اس لئے ہے کہ کیونکہ لفظ ”نصح“ جو اصل میں اخلاص کے معنی میں ہے ایک جامع لفظ ہے۔ اس میں ہر قسم کی خیر خواہی اور مخلصانہ اقدام کا مفہوم پنہاں ہے اور چونکہ یہاں جہاد کا معاملہ درپیش ہے لہذا اس سے مراد ایسی کوششیں ہیں جو اس سلسلے میں درکار ہیں۔

بعد میں اس امر کی دلیل بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے: ایسے افراد نیک لوگ ہیں اور نیکوکاروں کے لئے ملامت، سرزنش، سزا اور مواخذہ کا کوئی راستہ نہیں ہے ﴿مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ﴾۔

آیت کے آخر میں خدا تعالیٰ کی دو عظیم صفات بیان کی گئی ہیں یہ بھی دراصل ان تین گروہوں خنی معافی کی ایک دلیل کے طور پر بیان ہوئی ہیں ارشاد ہوتا ہے: خدا غفور اور رحیم ہے ﴿وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾۔

”غفور“ ”غفران“ کے مادہ سے مستور اور پوشیدہ کرنے کے معنی میں ہے یعنی خدا اس صفت کے تقاضا کی بنا پر معذور اور ناتواں افراد کے کام پر پردہ ڈال دیتا ہے اور ان کے عذر قبول کر لیتا ہے۔

اور خدا کا ”رحیم“ ہونا مقتضی ہے کہ وہ شاق اور مشکل ذمہ داری کسی پر نہ ڈالے اور اسے معاف رکھے یہ لوگ اگر میدان جہاد میں حاضر ہونے پر مجبور ہوتے تھے یہ امر خدا کی غفوریت اور رحیمیت سے مناسبت نہ رکھتا۔ یعنی غفور و رحیم خدا انہیں یقیناً معاف رکھے گا۔

چند ایک روایات جو مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں نقل کی ہیں، ان سے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ معذور لوگوں کو نہ صرف یہ کہ اس ذمہ داری سے رخصت دی گئی ہے اور ان سے سزا برطرف کر دی گئی ہے بلکہ میدان جہاد میں شرکت کے لئے انہیں جو قدر اشتیاق ہے اس کے حساب سے وہ جزا ثواب اور اعزازات میں بھی مجاہدین کے ساتھ شریک ہیں جیسا کہ پیغمبر اکرم سے منقول ایک حدیث میں بھی ہے کہ جس وقت آپ جنگ تبوک سے واپس آئے اور مدینے کے قریب پہنچے تو فرمایا:

اس شہر میں تم کچھ ایسے افراد کو چھوڑ گئے تھے جو تمام راستے میں تمہارے ساتھ ساتھ جو قدم تم نے اٹھا اور جو مال تم نے اس راہ میں خرچ کیا اور جس زمین سے تم گذرے وہ تمہارے ہمراہ تھے۔

صحابہ نے عرض کیا:

یا رسول اللہ! وہ جس طرح ہمارے ساتھ تھے جب کہ وہ مدینہ میں تھے۔

رسول اللہ نے فرمایا:

اس بنا پر کہ وہ کسی عذر کی وجہ سے جہاد میں شرکت نہیں کر سکے (لیکن ان کے دل ہمارے ساتھ تھے)۔^(۱)

اس کے بعد چوتھے گروہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جسے جہاد میں شرکت سے معافی دی گئی ہے، فرمایا گیا ہے: اسی طرح اس گروہ پر بھی کوئی اعتراض نہیں جو تیرے پاس آیا تو انھیں میدانِ جہاد میں شرکت کے لئے سواری فراہم کر دے اور تو نے کہا کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں کہ جس پر تمہیں سوار کرتوں تو مجبوراً وہ تیرے پاس سے اس حالت میں گئے کہ ان کی آنکھیں اشکبار تھیں اور یہ آنسو اس غم میں تھے کہ ان کے پاس راہِ خدا میں خرچ کرنے کے لئے کچھ نہ تھا ﴿وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَأَعْيَيْنُهُمْ تَفِيضٌ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ﴾

﴿

”تفیض“ ”فیضان“ کے مادہ سے ہے اس کا معنی ہے پر ہونے کے نتیجے میں گرنا۔ جب انسان کو تکلیف ہوتی ہے اگر اس کی تکلیف اودکھ زیادہ شدید نہ ہو تو آنکھیں آنسوؤں سے پر ہو جاتی ہیں لیکن آنسو جاری نہیں ہوتے لیکن اگر دکھ اور تکلیف شدید ہو جائے تو اشک رواں ہو جاتے ہیں۔

یہ صورت نشاندہی کرتی ہے کہ یہ اصحابِ پیغمبر جہاد کے اس قدر مشتاق اور عاشق تھے کہ نہ صرف معافی مل جانے پر خوش نہ تھے بلکہ اس طرح آنسو بہا رہے تھے جیسے ان کا کوئی بہترین عزیز اور دوست کھو گیا ہو۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ یہ چوتھا گروہ تیسرے سے علیحدہ نہیں جس کا ذکر گزشتہ آیت میں ہوا ہے لیکن اس کا ایک خاص امتیاز ہے اور اس گروہ کی قدر دانی کے لئے مستقل ایک آیت میں ان کی کیفیت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

ان کا امتیاز یہ تھا کہ!

۱۔ انھوں اس پر قناعت نہیں کی کہ ان کے پاس جہاد میں شرکت کے وسائل نہیں تو بیٹھ رہیں بلکہ وہ رسول کے پاس آئے اور سواری کے لئے ان سے اصرار کیا۔

۲۔ جب رسول اللہ نے انھیں نفی میں جواب دیا تو نہ صرف یہ کہ معافی ملنے پر وہ خوش نہیں ہوئے بلکہ بہت دکھی او پریشان ہوئے۔

ان دو وجوہ کی بناء پر خدا تعالیٰ نے ان کا خاص طور پر الگ سے ذکر کیا ہے۔

آخری آیت میں پانچویں گروہ کی حالت بیان کی گئی ہے یعنی وہ کہ جن کے پاس بارگاہ الہی کے لئے کوئی عذر نہیں تھا، فرمایا گیا ہے: مواخذہ اور سزا کی راہ صرف ان لوگوں کے سامنے کھلی ہے جو تجھ سے اجازت چاہتے ہیں کہ جہاد میں شرکت نہ کریں جب کہ اس کام کے لئے ان کے پاس کافی اور ضروری وسائل موجود ہیں اور وہ بالکل بے نیاز ہیں ﴿إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُوكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ﴾۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ان کے لئے یہ ننگ و عار کافی ہے کہ وہ اس بات پر راضی ہیں کہ ناتواں، بیمار اور معذور افراد کے ساتھ مدینہ میں رہ جائیں اور جہاد میں شرکت کے اعزاز سے محروم رہیں ﴿رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ﴾۔ اور یہ سزا بھی ان کے لئے کافی ہے کہ خدا نے ان کے برے اعمال کی وجہ سے فکر و ادراک کی قدرت ان سے چھین لی اور ان کے دلوں پر مہر لگادی اور اس بناء پر وہ کچھ نہیں جانتے ﴿وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ هُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ مجاہدین کا جذبہ و شہادت:

ان آیات سے مجاہدین اسلام کے قوی اور عالی جذبے کا اظہار ہوتا ہے کہ کس طرح ان کے دلوں میں جہاد و شہادت کا عشق موجزن تھا وہ اس اعزاز کو ہر اعزاز پر مقدم سمجھتے تھے۔ اسی سے اس وقت اسلام کی تیز رفتار پیش رفت اور اس وقت ہماری پسماندگی کی اہم عوامل سامنے آتے ہیں۔

ہم کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ جہاد میں شرکت سے معافی پر جن کی آنکھوں میں برسات کی جھڑیا لگ جاتی ہیں ان کے ان لوگوں کے برابر ہو جائیں جو جہاد میں شرکت نہ کرنے کے لئے بہانے تراشتے ہیں۔

اگر ایمان کی وہی روح آج بھی زندہ ہو جائے، عشق اور جذبہ شہادت دلوں میں پھر سے موجزن ہو جائے تو آج بھی کامیابی اور پیش رفت اسی طرح سے ہو جیسے آغاز اسلام میں تھی بد بختی یہی ہے کہ ہم نے فقط اسلام کا ظاہری لباس پہن رکھا ہے، اور اسلام ہمارے وجود کی گہرائیوں میں نہیں اترتا۔ پھر بھی ہم اپنے آپ کو آغاز اسلام کے مسلمانوں کی طرح کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔

۲۔ جہا کے کئی مراحل ہیں:

زیر بحث آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کو مجاہدین کی ہمکاری سے مکمل طور پر معافی نہیں مل سکتی۔ یہاں تک کہ ج و افراد بیمار ہیں یا نایبنا ہیں یا فطری طور پر ہتھیار اٹھانے اور میدان جہاد میں شرکت کی طاقت نہیں رکھتے انھیں بھی چاہیے کہ وہ زبان سے یا کسی اور طرح سے تبلیغ کے ذریعے مجاہدین کو شوق دلائیں اور ان کی معاونت کریں ایسے لوگوں کو بھی اپنی ذمہ داری کو فراموش نہیں کرنا چاہیے اور بالکل ایسے امور سے کنارہ کش نہیں ہونا چاہیے۔ در حقیقت جہاد کے کئی مرحلے ہیں اور اس کے ایک مرحلے سے معذور ہونا دوسرے مراحل سے معذور ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

۳۔ ایک وسیع قانون کا سرچشمہ:

”ما علی المحسنین من سبیل“ (نیکو کاروں سے مواخذہ کی کوئی راہ نہیں) یہ جملہ فقہی مباحث میں ایک وسیع قانون کا سرچشمہ ہے اس قانون سے علماء نے بہت سے احکام اخذ کئے ہیں۔

مثلاً اگر کسی امین شخص کے ہاتھ سے کوئی امانت بغیر کسی افراط و تفریط کے تلف ہو جائے تو ایسا شخص نقصان کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں دیگر دلائل کے علاوہ اس آیت کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ یہ آیت مجاہدین کے بارے میں ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ آیت کا کسی ایک واقعہ کے بارے میں ہونا اس کی عمومیت کو ختم نہیں کرتا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی ایک مسئلہ کے بارے میں ہونا اسے ہرگز اسی میں محدود نہیں کرتا۔

آیات ۹۳، ۹۵، ۹۶

۹۴۔ ﴿يَعْتَذِرُونَ إِلَيْكُمْ إِذَا رَجَعْتُمْ إِلَيْهِمْ قُلْ لَا تَعْتَذِرُوا لَنْ تُؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَأْنَا اللَّهُ مِنْ أَخْبَارِكُمْ وَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾۔

۹۵۔ ﴿سَيَخْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ إِذَا انْقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوا عَنْهُمْ فَأَعْرِضُوا عَنْهُمْ إِنَّهُمْ رَجِسٌ وَمَآوَاهُمْ جَهَنَّمَ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾۔

۹۶۔ ﴿يَخْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ﴾۔

ترجمہ

۹۴۔ جس وقت تم ان کی طرف (جنہوں نے جہاد سے تخلف کیا ہے) لوٹ کر آئے تو تم سے عذر خواہی کریں گے کہہ دو کہ معذرت نہ کرو ہم ہرگز تم پر ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ اللہ نے ہمیں تمہاری خبروں سے آگاہ کیا ہے اور خدا اور اس کا رسول تمہارے اعمال دیکھتا ہے پھر تم اس کی طرف پلٹ جاؤ گے جو پہاں اور آشکار سے آگاہ ہے اور تمہیں اس سے آگاہ کرے گا (اور اس کی جزا دیگا) جو کچھ تم انجام دیتے تھے۔

۹۵۔ جب تم ان کی طرف لوٹ کر گئے تو وہ تمہارے لئے قسم کھائیں گے ان سے اعراض (اور صرف نظر) کرو۔ تم ان سے اعراض کرو (اور منہ پھیر لو) کیونکہ وہ پلید ہیں اور ان کے رہنے کی جگہ جہنم ہے، ان کے اعمال کی سزائیں جو وہ انجام دیتے تھے۔

۹۶۔ قسم کھا کے تم سے چاہتے ہیں کہ ان سے راضی ہو جاؤ اگر تم ان سے راضی ہو جاؤ تو خدا فاسقین کے گروہ سے راضی نہیں ہوگا۔

شانِ نزول

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیات ان منافقین کے بارے میں نازل ہوئیں جن کی تعداد اسی سے زیادہ تھی کیونکہ جب آپ جنگ تبوک سے واپس ہوئے تو آپ نے حکم دیا کہ کوئی شخص ان کے ساتھ نہ بیٹھے اور نہ ان سے گفتگو کرے اور جب انہوں نے اپنے آپ کو معاشرے کے شدید دباؤ میں دیکھا تو معذرتیں کرنے لگے۔ اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں جن میں ان کی حقیقت واضح ہو گئی ہے۔

تفسیر

جھوٹی معذرتوں اور قسموں پر اعتبار نہ کرو یہ آیات بھی منافقین کے شیطانی اعمال کے بارے میں ہیں یکے بعد دیگرے ان مختلف کاموں سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ وہ ان کے ریاکارانہ اعمال اور ظاہری دل پذیر باتوں سے وھوکا نہ کھائیں۔

زیر نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: جب تم (جنگِ تبوک سے) مدینہ کی طرف لوٹ کر جاو گے تو منافقین تمہارے پیچھے آئیں گے اور معذرت کریں گے ﴿يَعْتَذِرُونَ إِلَيْكُمْ إِذَا رَجَعْتُمْ إِلَيْهِمْ﴾۔

”يعتذرون“ فعل مضارع ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے پیغمبر اکرم اور مسلمانوں کو پہلے ہی سے اس بات سے آگاہ کر رکھا تھا کہ بہت جلد منافقین جھوٹ موٹ عذر خواہی کرتے ہوئے ان کے پاس آئیں گے لہذا جواب دینے کا طریقہ بھی مسلمانوں کو بتا دیا گیا۔

پھر پیغمبر اکرم کی طرف مسلمانوں کے رہبر کی حیثیت سے روئے سخن کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: منافقین سے کہہ دو کہ معذرت نہ کرو ہم ہر گز تمہاری باتوں پر ایمان نہیں لائیں گے ﴿قُلْ لَا تَعْتَذِرُوا لَنْ تُؤْمِنَ لَكُمْ﴾۔ ”کیونکہ خدا نے ہمیں تمہاری خبروں سے آگاہ کر دیا ہے“۔ لہذا ہم تمہاری شیطانی سازشوں سے اچھی طرح باخبر ہیں ﴿قَدْ نَبَأْنَا اللَّهُ مِنْ أَحْبَابِكُمْ﴾۔ لیکن اس کے باوجود تمہارے لئے بازگشت اور توبہ کی راہ کھلی ہے۔ عنقریب خدا اس کا رسول تمہارے اعمال دیکھے گا ﴿وَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ﴾۔

آیت کی تفسیر کے ضمن میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس جملے سے توبہ مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ آئندہ بھی خدا اور اس کا رسول

(وحی کے مطابق) تمہارے اعلام اور سازشوں سے آگاہ ہوں گے اور انہیں نقش بر آب کر دیں گے لہذا نہ تم آج کچھ کر سکتے ہو اور نہ کل۔

لیکن پہلی تفسیر ظاہرِ ایت کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

ضمنی طور پر آپ متوجہ رہیں کہ اس جملے کے ابرے میں اور امت کے تمام اعمال اس کے پیغمبر کے سامنے پیش ہونے کے مسئلے کے متعلق ہم اسی سورہ کی آیہ ۱۰۵ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کریں گے۔

بعد میں فرمایا گیا ہے کہ تمہارے تمام اعمال اور تمہاری نیتیں ثبت اور محفوظ ہو جائیں گی ”پھر تم اس کی طرف پلٹ جاؤ گے جو تمہارے پنہاں اور آشکار امور کو جانتا ہے اور وہ تمہیں تمہارے اعمال سے آگاہ کرے گا۔“ اور تمہیں ان کی جزا دے گا ﴿ثُمَّ تُرْجَوْنَ إِلَىٰ عَالَمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾۔

بعد والی آیت میں دوبارہ منافقین کی جھوٹی قسموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :- وہ تمہیں فریب دینے کے لئے عنقریب قسم کا سہارا لیں گے اور جب ان کی طرف لوٹو گے تو خدا کی قسم کھائیں گے کہ ان سے صرف نظر کر لو اور اگر ان سے کوئی خطا ہوئی ہے تو انہیں معاذ کرو ﴿سَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ إِذَا انْقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لَنُغْرَضُوا عَنْهُمْ﴾۔

در حقیقت وہ ہر دروازے سے داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ کبھی بہانوں سے اپنے آپ کے بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ کبھی اعتراف گناہ کریں گے اور عفو و درگزر کا تقاضا کریں گے۔ وہ سوچتے ہیں کہ شاید کسی طریقے سے تمہارے دلوں میں جگہ پیدا کر لیں۔

لیکن تم کسی طرح سے بھی ان سے اثر نہ لینا اور ”ان سے منہ پھیر لو“ البتہ ناراضی کے اظہار کے طور پر نہ کہ عفو و بخشش کے طور پر ﴿فَأَعْرِضُوا عَنْهُمْ﴾۔

وہ اعراض کا تقاضا کرتے ہیں لیکن درگزر کے معنی میں۔ تم بھی اعراض کرو مگر انکار کے معنی میں۔ یہ دونوں تعبیریں مشابہ ہیں اور بالکل متضاد معانی پیش کرتی ہیں۔ اس انداز کی لطافت اور خوبصورتی اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اس کے بعد تاکید، توضیح اور دلیل کے طور پر فرمایا گیا ہے: کیونکہ وہ لوگ پلید ہیں اور ایسی نجس موجودات سے منہ پھیرنا ہی چاہیئے ﴿إِنَّهُمْ رِجْسٌ﴾۔ اور چونکہ ایسے ہیں لہذا ان کے لئے جہنم کے علاوہ کوئی ٹھکانہ نہیں ہو سکتا ﴿وَمَا أَوَاهُمْ جَهَنَّمَ﴾۔ کیونکہ جنت میں نیک پاک لوگوں کی جگہ ہے نہ کہ پلید اور گندے لوگوں کی۔

لیکن ”یہ سب کچھ اعمال کا نتیجہ ہے جو انھوں نے خود انجام دیئے ہیں ﴿جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾۔“
زیر بحث آخری آیت میں ان کی ایک اور قسم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ”وہ اصرار کر کے اور قسم کھا کے چاہتے ہیں کہ تم ان سے راضی اور خوش ہو جاؤ ﴿يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ﴾۔“

پہلی آیت میں جس قسم کا ذکر ہے وہ اس بنا پر رتھی کہ مومنین عملاً انھیں ملامت نہ کریں۔ لیکن اس آیت میں جس قسم کا تذکرہ ہے وہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ عملی پہلو کے علاوہ مومنین سے دلی طور پر بھی ان سے خوش ہو جائیں۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ خدا تعالیٰ اس مقام پر یہ نہیں فرماتا ہے کہ ”تم ان سے راضی نہ ہونا“ بلکہ یہاں موجود تعبیر سے تہدید کی بو آتی ہے، فرمایا گیا ہے: اگر تم ان سے راضی ہو جاؤ تو خدا فاسقین کی قوم سے کبھی راضی نہیں ہو گا ﴿فَإِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ﴾۔

اس میں شک کہ دینی اور اخلاقی طور پر وہ مسلمانوں کو خوش نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ اس طرح مسلمانوں کے دل کی ناراضی دور کرنا چاہتے تھے تاکہ آئندہ ان کے عمل سے محفوظ رہیں۔

لیکن ”﴿لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ﴾“ کہہ کر خدا تعالیٰ مسلمانوں کو خبردار کرتا ہے کہ یہ فاسق ہیں لہذا مسلمانوں کو ان سے ہرگز راضی نہیں ہونا چاہیے۔ یہ فقط ان کی پر فریب چالیں ہیں۔ لہذا بیدار ہوتا کہ ان کے جال میں نہ پھنس جاؤ۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہر زمانے میں مسلمان منافقین کی شیطانی اور جانی پہچانی سازشوں پر نظر رکھیں تاکہ وہ ان کے سامنے اپنے پرانے پر فریب طریقے استعمال نہ کر سکیں اور اس طرح کہیں وہ اپنے برے مقاصد میں کامیاب نہ ہونے پائیں۔

آیات ۹۷، ۹۸، ۹۹

۹۷- ﴿الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا وَأَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ -

۹۸- ﴿وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَيَتَرَبَّصُّ بِكُمُ الدَّوَائِرَ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ -

۹۹- ﴿وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرْبَاتٍ عِنْدَ اللَّهِ وَصَلَوَاتِ الرَّسُولِ أَلَا إِنَّهَا قُرْبَةٌ لَهُمْ

سَيُدْخِلُهُمُ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ -

ترجمہ

۷۹- بادیہ نشین عربوں کا کفر اور نفاق شدید تر ہے اور جو کچھ خدا نے اپنے پیغمبر پر نازل کیا ہے اس کی حدود (اور سرحدوں) کی جہالت کے وہ زیادہ حق دار ہیں اور خدا دانا اور حکیم ہے -

۹۸- (ان) بادیہ نشین عربوں میں سے (کچھ لوگ) جو کچھ (راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں اسے تو ان شمار کرتے ہیں اور تمہارے بارے میں دردناک حوادث کی توقع رکھتے ہیں (حالانکہ) دردناک حوادث ان کے لئے ہیں اور خدا سننے والا اور دانا ہے -

۹۹- بادیہ نشین عربوں میں سے (کچھ اور لوگ) خدا اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں اسے خدا کے ہاں قرب اور پیغمبر کی دعاؤں کا باعث سمجھتے ہیں - آگاہ رہو کہ یہ ان کے تقرب کا باعث ہیں - خدا بہت جلد انہیں اپنی رحمت میں داخل کر دے گا کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے -

سنگ دل اور صاحب ایمان بادیہ نشین

گذشتہ آیات میں منافقین مدینہ کے بارے میں گفتگو تھی - ان آیات میں اسی مناسبت سے بادیہ نشین منافقین کی نشانیوں اور افکار کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے - اس کے ساتھ ساتھ مخلص اور سچے بادیہ نشین مومنین کے بارے میں بھی باقی کی گئی ہے -

شاید اس وجہ سے کہ مسلمانوں کو خبردار کیا جائے کہ وہ کہیں یہ خیال نہ کریں کہ منافقین صرف اس شہر میں رہتے ہیں، بتایا گیا ہے کہ بادیہ نشین منافقین ان سے بھی سخت تر ہیں - تاریخ اسلام گواہ ہے کہ مسلمانوں پر ان منافقین کی طرف سے بارہا حملے ہوئے ہیں -

لشکر اسلام کی پے در پے فتوحات کے سبب کہیں ایسا نہ ہو کہ اس خطرے کو نظر انداز کر دے۔ بہر حال پہلی آیت میں قرآن کہتا ہے: بادیہ نشین اعراب

(تعلیم و تربیت سے دوری اور آیاتِ الہی اور پیغمبر کے ارشادات نہ سننے کی وجہ سے) کفر اور نفاق میں زیادہ سخت ہیں ﴿الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا﴾۔ ”اسی وجہ سے وہ ان فراین و احکام کی حدود کی جہالت کے زیادہ حق دار ہیں جو خدا نے اپنے رسول پر نازل کئے ہیں

﴿وَأَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ﴾۔

”اعراب“ جمع کا معنی رکھنے والے لفظوں میں سے ہے لیکن لغت عرب کے لحاظ سے اس کا مفرد نہیں ہے جیسا کہ علماء لغت مثلاً قاموس، صحاح اور تاج العروس کے مولف اور دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ یہ لفظ صرف بادیہ نشین عربوں پر بولا جاتا ہے اور اس کے مفرد کے لئے یاء نسبت کے ساتھ ”اعرابی“ کی صورت میں بولتے ہیں۔ اس بناء بہت سے لوگوں کے تصور کے برخلاف ”اعراب“ ”عرب“ کی جمع نہیں ہے۔

”اجدر“ ”جدار“ کے مادہ سے دیوار کے معنی میں ہے بعد ازاں یہ لفظ ر مرتفع اور مناسب چیز کے لئے بولا جانے لگا اس وجہ سے عام طور پر ”اجدر“ زیادہ شائستہ اور مناسب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خدا دانا اور حکیم ہے یعنی اگر بادیہ نشین عربوں کے بارے میں اس قسم کا فیصلہ کرتا ہے تو خاص مناسبت کے سبب ہے کیونکہ ان کا ماحصول ایسی صفات رکھتا ہے ﴿وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾۔ لیکن اس بناء پر کہ کہیں یہ وہم پیدا نہ ہو کہ تمام بادیہ نشین عرب یا دنیا کے سبب بادیہ نشین ان صفات کے حامل ہوتے ہیں، بعد والی آیت میں ان میں سے دو مختلف گروہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: ”ان بادیہ نشین عربوں میں سے ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو جب کوئی چیز راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو نفاق یا کمزور ایمان کی وجہ سے اسے نقصان اور خسارہ شمار کرتے ہیں“ نہ کہ ایک کامیابی اور سود مند تجارت ﴿وَمِنْ

الْأَعْرَابِ مَنْ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا﴾۔^(۱)

”غرامت“ بھی اسی مناسبت سے استعمال ہوتا ہے کہ جو انسان کے لئے لازمی ہوتا اور جب تک ادا نہ کر لے وہ اس سے جدا نہیں ہوتی۔ عشق شدید کو بھی ”غرام“ کہتے ہیں کیونکہ وہ انسان کی روح میں اس طرح اترتا ہے کہ جدا نہیں ہوتا اور ”مغرم“ اور ”غرامت“ کا ایک ہی معنی ہے۔

ان کی ایک صفت یہ ہے کہ ”ہمیشہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ تمہیں مشکلات گھیر لیں اور بد بختی اور ناکامی تمہیں آئے ﴿وَيَتَرَبَّصُّ بِكُمُ الدَّوَّائِرُ﴾۔

”دوائر“ ”دائرہ“ کی جمع ہے اور اس کا معنی مشہور ہے لیکن وہ سخت اور دردناک حوادث انسان کا احاطہ کر لیتے ہیں عرب انہیں ”دائرہ“ کہتے ہیں اور جمع کی حالت میں ”دوائر“ کہتے ہیں۔

در حقیقت وہ لوگ تنگ نظر، بخیل اور بہت حاسد ہیں اپنے بخل ہی کی وجہ سے وہ راہِ خدا میں ہر طرح کی مالی خدمت کی نقصان شمار کرتے ہیں اور اپنے حسد کی وجہ سے وہ دوسروں کے لئے مشکلات اور مصائب کے انتظار میں رہتے ہیں۔ مزید فرمایا گیا ہے کہ وہ تمہارے لئے ظہور مشکلات اور فزول، بلا کا انتظار نہ کریں اور تمہارے ان کی توقع نہ رکھیں۔ کیونکہ یہ مشکلات، ناکامیاں بد بختیاں صرف اس منافق، بے ایمان، جاہل، نادان، تنگ نظر اور حاسد گمراہ کی تلاش میں ہیں ﴿عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ﴾۔ (۲)

آخر میں آیت کو اس جملے پر ختم کیا گیا ہے کہ ”خدا سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾۔ ان کی باتوں کو بھی سنتا ہے اور ان کی نیتوں اور مافی الضمیر سے بھی آگاہ ہے۔

آخری آیت میں دوسرے گمراہ یعنی بادیہ نشینوں میں سے مخلص مومنین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان بادیہ نشین عربوں میں سے ایک گمراہ ان کا ہے جو قیامت پر ایمان رکھتے ہیں ﴿وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾۔

اسی بنا پر وہ راہِ خدا میں خرچ کرنے کو بھی نقصان اور زیاں نہیں سمجھتے بلکہ اس جہان میں دوسرے جہان میں خدا کی وسیع جزا اور ثواب کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس کا کو قریب الہی کا ذریعہ، پیغمبر کی توجہ اور دعا کا باعث سمجھتے ہیں جو کہ افتخار اور عظیم برکت ہے ﴿وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرْبَاتٍ عِنْدَ اللَّهِ وَصَلَوَاتِ الرَّسُولِ﴾۔

یہاں خدا تعالیٰ ان کی طرز فکر کی بڑی تاکید سے تصدیق کرتا ہے اور کہتا ہے: آگاہ رہو کہ یقیناً ان کا یہ انفاق اور خرچ بارگاہِ خدا میں قرب کا باعث ہیں ﴿أَلَا إِنَّهَا قُرْبَةٌ لَهُمْ﴾۔ اور اسی بناء پر ”خدا انہیں بہت جلد اپنی رحمت میں داخل کر دے گا ﴿سَيُدْخِلُهُمُ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ﴾۔ اگر ان سے کچھ لغزشیں ہو تو ان کے ایمان اور اعمال کی وجہ سے انہیں بخش دے گا ”خدا بخشنے والا اور مہربان ہے، ﴿إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾۔

اس آیت میں جو پے در پے تاکیدیں نظر آتی ہیں بہت جالب توجہ ہیں۔ لفظ ”الما“ اور ”ان“ دونوں تاکید کے لئے ہیں اس کے بعد ”سید خلہم اللہ فی رحمۃ“ کا جملہ اور خاص طور پر اس میں لفظ ”فی“ رحمۃ خدا میں غوطہ زن ہونے کا ظاہر کرتا ہے۔ بعد میں آخری جملہ بھی ”ان“ سے شروع ہوتا ہے اور خدا کی شفقت و مہربانی کی صفات ”غفوراً رحیم“ کا ذکر کرتا ہے یہ یہ سب اس گروہ کے لئے خدا تعالیٰ کے انتہائی لطف و رحمۃ کا بیان ہے انھوں نے تعلیم و تربیت سے محروم ہونے اور آیات الہی اور ارشادات پیغمبر تک کافی رسائی نہ ہونے کے باوجود جان و دل سے اسلام قبول کیا ہے اور مالی وسائل نہ رکھنے کے باوجود (کہ جو ان کی بادیہ نشینی کا لازمہ ہے) وہ راہ خدا میں خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ شاید اس بناء پر یہ لوگ شہروں میں رہنے والے اور ہر طرح کے وسائل رکھنے والے افراد کی نسبت قدر دانی کے زیادہ حق دار ہیں۔

اس نکتہ کی جانب خصوصیت سے توجہ درکار ہے کہ منافق اعراب کے بارے میں ”﴿علیہم دائرۃ السوء﴾“ استعمال ہوا ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بد بختیاں ان پر محیط ہیں۔ لیکن باایمن اور فداکار اعراب کے لئے ”فی رحمۃ“ استعمال ہوا ہے جو ان پر رحمۃ الہی کے محیط ہونے کو بیان کرتا ہے ایک گروہ کو بد بختی نے گھیر رکھا ہے اور دوسرے پر رحمۃ الہی احاطہ کئے ہوئے ہے۔

۱۔ ”مغرم“ جیسے کہ مجمع البیان میں آیا ہے ”غرم“ (بروزن ”جرم“) کے مادہ سے ہے۔ دراصل یہ کسی چیز کے لازم ہونے کے معنی میں ہے بعد ازاں قرض خواہ اور مقروض کو ”غریم“ کہا جاتا ہے ج و ایک دوسرے کو نہیں چھوڑتے اور لازمی طور پر ایک دوسرے کو پکڑے ہوئے ہیں۔

۲۔ یہ جملہ حصرک المعنی دیتا ہے یعنی برے حوادث پس انھی دامن گیر ہوتے ہیں اور یہ انحصار اس بناء پر ہے کہ ”علیہم“ جو خبر ہے بتداء سے مقدم ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ آبادی کے بڑے مراکز:

عظیم معاشروں اور آبادی کے بڑے مراکز کو اسلام جو اہمیت دیتا ہے وہ مندرجہ بالا آیت سے واضح ہو جاتی ہے یہ بات قابل توجہ ہے کہ اسلام ایسے پس ماندہ ماحول سے اٹھا ہے کہ جس سے تمدن کی بو بھی نہ آتی تھی اس کے باوجود وہ تمدن کے اصلاحی عوامل کی خاص اہمیت کا قائل ہے اور اس کی اس بات پر نظر ہے کہ جو لوگ شہر سے دور افتادہ علاقوں میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ ایمان اور مذہبی معلومات میں اس لئے پیچھے ہیں کہ ان کے پاس تعلیم و تربیت کے لئے کافی وسائل اور مواقع نہیں ہیں۔ لہذا نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

و الزموا السواد الاعظم فان يد الله مع الجماعة

بڑے مراکز سے لازماً وابستہ رہو کیونکہ خدا کا ہاتھ جماعت کے ساتھ ہے۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۷)۔

لیکن اس بات کا مفہوم یہ نہیں کہ سب لوگ شہروں کا رخ کر لیں اور دیہات جو شہروں کی آبادی کا باعث ہیں انھیں ویران کر دیں بلکہ اس کے برعکس چاہیے کہ شہروں سے علم و دانش دیہات کی طرف لائی جائے اور دیہات میں تعلیم و تربیت، دین و ایمان اور بیداری و آگاہی کے فروغ اور تقویت کی کوشش کی جائے۔

اس میں شک نہیں کہ اگر دیہی عوام کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور انہیں شہری علوم و آداب، کتب آسمانی کی آیات اور پیغمبر خدا اور ہادیان برحق کی تعلیمات سے محروم رکھا جائے تو کفر و نفاق انہیں تیزی سے گھیر لے گا۔ دیہاتی لوگ صحیح تعلیم و تربیت زیادہ قبول کرتے ہیں کیونکہ ان میں صاف دل اور پاک فکر افراد زیادہ ہوتے ہیں جنہیں کسی کا ہاتھ نہیں لگا ہوتا اور ان میں شہری شیطنیتیں اور سازشیں کم ہوتی ہیں۔

۲۔ بادیہ نشین شہری:

”اعرابی“ اگرچہ ”بادیہ نشین“ کے معنی میں ہے لیکن اسلامی روایات میں اس کا ایک وسیع تر مفہوم لیا گیا ہے بالفاظ دیگر اس کا اسلامی مفہوم کسی علاقے سے وابستہ نہیں ہے بلکہ طرز فکر اور منطقہ فکری سے مربوط ہے جو لوگ اسلامی آداب و سنن اور تعلیم و تربیت سے دور ہیں، اگرچہ شہر میں رہتے ہوں اعرابی ہیں اور اسلامی آداب و سنن سے آگاہ بادیہ نشین بی اعراب نہیں ہیں۔

امام جعفر صادق سے منقول ایک مشہور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: من لم يتفقه منكم في الدين فهو اعرابي
تم میں سے جو شخص اپنے دین سے آگاہ نہیں، اعرابی ہے۔^(۱)
یہ فرمان ہماری مندرجہ بالا گفتگو پر ایک واضح گواہ ہے۔

ایک اور روایت میں ہے: من الكفر التعرب بعد الهجرة ہجرت کے بعد بادیہ نشینی اور تعرب کفر ہے۔
نیز نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام نے منقول ہے کہ آپ نے اپنے اصحاب میں سے معصیت کار لوگوں کو
مخاطب کر کے فرمایا ہے: و اعلموا انکم صرتم بعد الهجرة اعراباً جان لو کہ تم ہجرت کے بعد اعرابی ہو گئے ہو۔ (نہج
البلاغہ خطبہ ص ۱۹۲)

مندرجہ بالا دو احادیث میں اعرابی ہونے کو ہجرت کے بالمقابل بیان کیا گیا ہے۔ اگر ہم اس طرف توجہ کریں کہ
ہجرت کا وسیع مفہوم بھی مکانی اور علاقائی پہلو نہیں رکھتا بلکہ اس کی بنیاد محور کفر سے فکر کو محور ایمان کی طرف منتقل کرنا
ہے تو اس سے اعرابی ہونے کا معنی بھی واضح ہو جاتا ہے، اسلامی آداب و سنن سے جاہلیت کے آداب و رسول کی
طرف پھر جانا۔

۳۔ قرب الہی کا مفہوم:

مندرجہ بالا آیات میں باایمان بادیہ نشین کے بارے میں ہے کہ وہ اپنے نفاق اور راہِ خدا میں خرچ کرنے کو قربِ خدا کا
سبب سمجھتے ہیں خصوصاً جبکہ لفظ ”قربات“ آیا ہے کہ جو کہ جمع اور نشاندہی کرتا ہے کہ وہ ایک نہیں بلکہ اس میں کئی قرب
تلاش کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ قربِ خدا سے مراد قربتِ مکان اور مکانی نزدیکی نہیں ہے بلکہ مقام و مرتبہ اور قدر
و منزلت کی نزدیکی ہے یعنی اس کی طرف جانا جو کمالِ مطلق ہے اور اس کی صفاتِ جمال و جلال کا سایہ اپنی روح و فکر پر
ڈالنا۔

آیت ۱۰۰

۱۰۰۔ ﴿وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾۔

ترجمہ

۱۰۰۔ مہاجرین و انصار میں سے پیش قدمی کرنے والوں اور ان کی پیروی کرنے والوں سے خدا خوش ہے اور وہ (بھی) خدا سے راضی ہیں اور اس نے ان کے لئے باغاتِ بہشت فراہم کئے ہیں کہ جن درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور عظیم کامیابی ہے۔

سابقین اسلام

مندرجہ بالا آیت کی شانِ نزول کے بارے میں اگرچہ کئی ایک روایات نقل ہوئی ہیں لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے ان میں سے کوئی بھی آیت کی شانِ نزول نہیں ہے بلکہ فی الحقیقت اس کے مصداق کا بیان ہے۔ بہر حال گزشتہ آیات میں کفار اور منافقین کی حالت بیان ہوئی ہے، ان کے بعد اب زیرِ نظر آیت میں سچے مسلمانوں کے مختلف گروہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ان تین گروہ بیان کئے گئے اول وہ جو اسلام اور ہجرت میں سبقت کرنے والے تھے ﴿وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ﴾۔

دوسرے وہ جو رسول اللہ کی نصرت اور مدد کرنے والوں میں پہل کرنے والے اور انصارِ مدینہ تھے ﴿وَالْأَنْصَارُ﴾۔ تیسرے وہ جو دونوں گروہوں کے بعد آئے اور انھوں نے ان کے طریقوں کی پیروی کی، نیک اعمال بجالانے میں، اسلام قبول کرنے میں ہجرت کرنے میں، رسول اللہ کے دین کی مدد کرنے میں انھوں نے پہلے دو گروہوں کا ساتھ دیا ﴿وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ﴾^(۱)۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ”باحسان“ دراصل اعمال و عقائد کا بیان مقصود ہے کہ جن میں وہ سابقین اسلام کی پیروی کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ”احسان“ ان اعمال کا وصف ہے کہ جن کی اتباع ہوتی ہے لیکن آیت کے معنی میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے۔ کہ احسان صفتِ اتباع کی کیفیت ہے یعنی وہ اچھے طریقے سے

پیروی کرتے ہیں۔ پہلی صورت میں باقی ”فی“ کے معنی میں ہے جب کہ دوسری صورت میں ”مع“ کے معنی میں ہے البتہ ظاہر آیت پہلی تفسیر سے مناسبت رکھتی ہے۔

ان تینوں گروہوں کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے: خدا بھی ان سے راضی ہے اور وہ بی خدا سے راضی ہیں ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾۔

خدا کا ان سے راضی ہونا ان کے ایمان اور ان کے انجام کردہ نیک اعمال کی بناء پر ہے اور ان کا خدا سے راضی ہونا خدا کی طرف سے عطا کردہ اچھی جزاؤں اور نہایت اہم عنایات کے باعث ہے۔ دوسرے لفظوں میں جو کچھ خدا ان سے چاہتا تھا انھوں نے انجام دیا ہے اور جو کچھ وہ خدا سے چاہتے تھے خدا نے انھیں عطا فرمایا ہے۔ اس بنا پر خدا نے ان سے راضی ہے اور وہ خدا سے راضی ہیں۔

گزشتہ جملہ اگرچہ تمام طرح کی مادی و معنوی نعمات پر محیط ہے لیکن تاکید کے طور پر اور اجمال کے بعد تفصیل کے لئے مزید فرمایا گیا ہے خدا نے ان کے لئے باغات بہشت تیار کئے ہیں جن درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں ﴿وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾۔ اور اس نعمت کی خصوصیات میں سے ہے کہ یہ دائمی اور جاودانی ہے ”اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے“ ﴿خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾۔ اور یہ تمام مادی و معنوی نعمتیں ان کے لئے عظیم کامیابی شمار ہوگی ﴿ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾۔

اس سے بڑھ کر کیا کامیابی ہوگی کہ انسان محسوس کرے کہ اسے پیدا کرنے والا معبود مولا اس سے خوش اور راضی ہے اور اس کے کام کی تائید کی ہے اور اسے پسند کیا ہے اور اس سے بڑھ کر کیا کامیابی ہوگی کہ انسان چند روزہ زندگی میں کئے ہوئے محدود اعمال سے غیر متناہی ابدی نعمات حاصل کرے۔

۱۔ بہت سے مفسرین نے لفظ ”من“ کو ”وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ“ میں ”من تبعیضیہ“ سمجھا ہے اور ظاہر آیت بھی یہی ہے۔ کیونکہ آیت میں مہاجرین و انصار میں سبقت کرنے والوں کے بارے میں بات کی گئی ہے نہ کہ مہاجرین و انصار کے بارے میں۔ درحقیقت باقی و انصار ”تابعین“ میں داخل ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ سابقین کا مرتبہ اور اہمیت:

ہر وسیع اجتماعی انقلاب میں جو معاشرے کی ناگفتہ بہ کیفیت کے خلاف آیا ہو کچھ سبقت کرنے والے ہوتے ہیں۔ انقلاب کی بنیادیں اور اس کی اٹھان انہی کے کندھوں پر ہوتی ہے۔ درحقیقت انقلاب کے سب سے زیادہ وفادار وہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کا رہبر جب ہر لحاظ سے تنہا ہوتا ہے وہ اس کے گرد جمع ہوتے ہیں اور اگرچہ وہ مختلف حوالوں سے مشکلات کا شکار ہوتے ہیں اور طرح طرح کے خطروں سے دوچار ہوتے ہیں، نصرت اور وفاداری سے دست بردار نہیں ہوتے خاص طور سے آغاز اسلام کی تاریخ نشاندہی کرتی ہے کہ سبقت کرنے والے اور پہلے ایمان لانے والے افراد کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا انھیں کیسے شکنجوں میں جکڑا گیا، تکلیفیں پہنچائی گئیں، برا بھلا کہا گیا، تہمتیں لگائی گئی، زنجیریں پہنچائی گئیں اور ان میں سے کئی ایک کو قتل کر دیا گیا لیکن ان تمام امور کے باوجود جو کچھ ایسے افراد تھے جو آہنی ارادہ، عشق سوزاں، عزمِ راسخ اور ایمان عمیق کے ساتھ اس راہ پر گامزن رہے اور ہر طرح کے خطرات کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔

اس سلسلے میں مہاجرین سابقین کا حصہ سب سے زیادہ تھا اور ان کے بعد انصار تھے جنہوں نے پیغمبر اکرم کے لئے اپنا دامن محبت پھیلا دیا اور انھیں مدینے آنے کی دعوت دی اور آپ کے مہاجرین اصحاب کو بھائیوں کی طرف سکونت فراہم کی اور اپنے پورے وجود سے ان کی حمایت کی اور ان کا دفاع کیا یہاں تک کہ انھیں اپنے اوپر ترجیح دی۔ اگر ہم دیکھتے ہیں کہ زیر نظر آیت میں ان دونوں گروہوں کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے تو وہ اسی وجہ سے ہے لیکن اس کے باوجود جیسا کہ قرآن مجید کی روش ہے اس نے دوسروں کے حصے کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اور ”تابعین باحسان“ کہہ کر زماہ پیغمبر اور آپ کے بعد کے دور میں بھی اسلام سے وابستہ ہو کر ہجرت کرنے والوں یا مہاجرین کو پناہ دینے والوں اور ان کی حمایت کرنے والوں کو یاد کیا ہے اور سب کو عظیم اجر و ثواب کی نوید دی ہے۔

۲۔ تابعین کون لوگ تھے؟

بعض علماء کے مطابق ”تابعین“ اصطلاح ہے جو صرف صحابہ کے شاگردوں کے لئے استعمال ہوتی ہے یعنی وہ افراد جنہوں نے رسول اللہ کو نہیں دیکھا اور وہ آپ کے بعد آئے ہیں اور انہوں نے اسلامی علوم و کون وسعت دی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے اپنی اسلامی معلومات بغیر کسی واسطے کے اصحابِ پیغمبر سے حاصل کی ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم سطور بالا میں کہہ چکے ہیں لغت کے لحاظ سے آیت کا مفہوم اس گروہ میں محدود نہیں ہو سکتا بلکہ ”تابعین“ بحسان کی تعبیر ان کے لئے ہے جنہوں نے کسی بھی زمانے میں سابقین اسلام کے اہداف و مقاصد کی پیروی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ بعض لوگوں کی سوچ کے برعکس ”ہجرت“ اور ”نصرت“ دونوں اسلام کے اصلاحی اور تعمیری مفاہیم ہیں جو زمانہ پیغمبر میں محدود نہیں ہیں بلکہ آج بھی یہ دونوں مفاہیم دوسری صورت میں موجود ہیں اور کل ان کا وجود ہوگا۔ اس بان پر وہ تمام افراد جس کسی نہ کسی طرح ان دونوں پروگراموں پر عمل پیرا ہوں ”تابعین بحسان“ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

البتہ اہم بات یہ ہے کہ ہمیں توجہ رکھنا چاہیے کہ قرآن لفظ ”احسان“ ذکر کمر کے تاکید کرتا ہے کہ اسلام کے سابقین کی پیروی فقط لفظی اور بغیر عمل کے ایمان کی صورت میں نہیں ہونا چاہیے بلکہ ضروری ہے کہ یہ پیروی ایک فکری و عملی اور تمال پہلوؤں سے ہونا چاہیے۔

۳۔ پہلا مسلمان کون تھا؟:

یہاں بہت سے مفسرین نے زیر بحث آیت کی مناسبت سے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اسلام قبول کرنے والا پہلا شخص کون تھا اور یہ عظیم افتخار کس نے حاصل کیا؟

اس وال کے جواب میں سب نے متفقہ طور پر کہا کہ عورتوں میں سے جو خاتون سب سے پہلے مسلمان ہوئیں وہ جناب خدیجہ ؓ تھیں جو پیغمبر اکرم کی وفادار اور فداکار زوجہ تھیں باقی رہا مردوں میں سے تو تمام شیعہ علماء مفسرین اور اہل سنت علماء کے ایک بہت بڑے گروہ نے کہا ہے کہ حضرت علی ؓ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے مردوں میں سے دعوتِ پیغمبر پر لبیک کہی۔ علماء اہل سنت میں اس امر کی اتنی شہرت ہے کہ ان میں سے ایک جماعت نے اس پر جماع و اتفاق کا دعویٰ کیا ہے۔ ان میں سے حاکم نیشاپوری نے مستدرک علی ؓ الصحیحین کتاب معرفت ص ۲۲ پر کہا ہے:

لا اعلم خلافاً بین اصحاب التواریخ ان علی بن ابی طالب رضی الہ عنہ اولہم اسلاماً و انما اختلفوا فی بلوغہ

مورخین میں اس امر پر کوئی اختلاف نہیں کہ علیؑ بن ابی طالب اسلام لانے والے پہلے شخص ہیں۔ اختلاف اسلام قبول کرتے وقت ان کے بلوغ کے بارے میں ہے۔ (تفسیر قرطبی جلد ۵ صفحہ ۳۰۷۵)۔

ابن عبد البر۔ استیعاب (ج ۲ ص ۴۵۷) میں لکھتے ہیں: اتفقوا علی ان خدیجة اول من آمن بالله و رسوله و صدقه فیما جاء به ثم علی بعدها

اس مسئلہ پر اتفاق ہے کہ خدیجہ وہ پہلی خاتون نہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائیں اور جو کچھ وہ لائے تھے اس کی تصدیق کی۔ پھر حضرت علیؑ نے ان کی کے بعد یہی کام انجام دیا۔ (الغیر جلد ۳ صفحہ ۲۳۷، ۲۳۸)۔

ابو جعفر اسکافی معتزلی لکھتا ہے: قدروی الناس كافة افتخار علی بالسبق الی الاسلام

تما لوگوں نے یہی نقل کیا ہے کہ سبقت اسلام کا افتخار علی سے مخصوص ہے۔ (الغیر جلد ۳ صفحہ ۲۳۷، ۲۳۸)۔

قطع نظر اس کے پیغمبر اکرم سے، خود حضرت علیؑ سے اور صحابہ سے اس بارے میں بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جو حد اترا تک پہنچی ہوئی ہیں، ذیل چند روایات ہم نمونہ کے طور پر نقل کرتے ہیں:

۱۔ پیغمبر اکرم نے فرمایا: اولکم وارداً علی الحوض اولکم اسلاماً علی بن ابی طالب

پہلا شخص جو حوض کوثر کے کنارے میرے پاس پہنچے گا وہ شخص ہے جو سب سے پہلے اسلام لایا اور وہ علی بن ابی

طالب ہے۔ (۱)

۲۔ علماء اہل سنت کے ایک گروہ نے پیغمبر اکرم سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت نے حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا:

ان هذا اول من آمن بی و هذا اول من یصافحنی و هذا الصدیق الاکبر

یہ پہلا شخص ہے جو مجھ پر ایمان لایا اور پہلا شخص ہے جو قیامت میں مجھ سے مصافحہ کرے گا اور یہ صدیق اکبر ہے۔

(۲)

۳۔ ابو سعید خدری رسول اکرم سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت نے حضرت علیؑ کے دونوں شانوں کے درمیان

ہاتھ مار کر فرمایا: یا علی لک سبع خصال لا یحاجک فیہن احد یوم القیامة : انت اول المؤمنین بالله ایماناً و فہم

بعہد اللہ و اقومہم بامر اللہ

اے علی! تم سات ممتاز صفات کے حامل ہو کہ جن کے بارے میں روز قیامت کوئی تم سے حجت بازی نہیں کر سکتا۔

تم وہ پہلے شخص ہو جو خدا پر ایمان لائے اور خدائی پیمانوں کے زیادہ وفادار ہو اور فرمانِ خدا کی اطاعت میں تم زیادہ قیام

کرنے والے ہو

۱۔ الغدير میں یہ حدیث حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۶۶ کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے تاریخ، تفسیر اور حدیث کی کتب میں اس سلسلے میں بہت سی روایات پیغمبر اکرم سے اور دوسروں سے نقل ہوئی ہیں۔ شائقین مزید توضیح کے لئے الغدير (عربی) ج ۳ ص ۲۲۰ تا ص ۲۴۰ اور کتاب احقاق الحق ج ۳ ص ۱۱۴ تا ص ۱۲۰ ملاحظہ فرمائیں۔

یہ امر لائق توجہ ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ایمان اور اسلام میں حضرت علیؑ کی سبقت کا سیدھے طریقے سے تو انکار نہیں کر سکے لیکن کچھ واضح البطلان علل کی بنیاد پر ایک طریقے سے انکار کی کوشش کی ہے یا سے کم اہم بنا کر پیش کیا ہے۔ بعض نے کوشش کی ہے کہ ان کی جگہ حضرت ابو بکر کو پہلا مسلمان قرار دیں یہ لوگ کبھی کہتے ہیں کہ علی اس وقت دس سال کے تھے لہذا طبعاً نابالغ تھے اس بناء پر ان کا اسلام ایک بچے کے اسلام کی حیثیت سے دشمن کے مقابلے میں مسلمانوں کے محاذ کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا (یہ بات فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں زیر نظر آیت کے ذیل میں ذکر کی ہے)۔

یہ بات واقعاً عجیب ہے اور حقیقت میں خود پیغمبر خدا پر اعتراض ہے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ یوم الدار (دعوت ذی العشرہ کے موقع پر) رسول اللہ نے اسلام اپنے قبیلے کے سامنے پیش کیا اور کسی نے حضرت علیؑ کے سوال اسے قبول نہ کیا۔ اس وقت حضرت علیؑ کھڑے ہو گئے اور اسلام کا اعلان کیا تو آپ نے ان کے اسلام کو قبول کیا۔ بلکہ یہاں تک اعلان کیا کہ تو میرا بھائی، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہے۔

یہ وہ حدیث ہے جو شیعہ سنی حافظان حدیث نے کتب صحاح اور مسانید میں نقل کی ہے۔ اسی طرح کئی مورخین اسلام نے اسے نقل کیا ہے یہ نشاندہی کرتی ہے کہ رسول اللہ نے حضرت علیؑ کی اس کم سنی میں نہ صرف ان کا اسلام قبول کیا ہے بلکہ ان کا اپنے بھائی، وصی اور جانشین کی حیثیت سے تعارف بھی کروایا ہے۔ (۳)

کبھی کہتے ہیں کہ عورتوں میں پہلیہ مسلمان خدیجہ تھیں، مردوں میں پہلے مسلمان ابو بکر تھے اور بچوں میں پہلے مسلمان علی تھے۔ یوں دراصل وہ اس امر کی اہمیت کم کرنا چاہتے ہیں (یہ تعبیر مشہور اور معتصب مفسر مولف المنار نے زیر بحث آیت کے ذیل میں ذکر کی ہے)۔

حالانکہ اول تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں حضرت علیؑ علیہ السلام کی اس وقت کم سنی سے اس امر کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی خصوصاً جب کہ قرآن حضرت یحییٰ کے بارے میں کہتا ہے: ﴿وَاتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾۔

ہم نے اسے بچپن کے عالم میں حکم دیا (مریم ۱۲)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی ہے کہ وہ بچپن کے عالم میں بھی بول اٹھے اور جو افراد ان کے بارے میں شک کرتے تھے اس سے کہا: ﴿انی عبد اللہ ، اُتانی الكتاب وجعلنی نبیاً﴾

میں اللہ کا بندہ ہوں مجھے اس نے آسمانی کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے۔ (مریم ۳۰)

ایسی آیات کو اگر ہم مذکورہ حدیث سے ملا کر دیکھیں کہ جس میں آپ نے حضرت علیؓ کو اپنا وصی، خلیفہ اور جانشین قرار دیا ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ صاحب المنار کی متعصبانہ گفتگو کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ امر تاریخی لحاظ سے مسلم نہیں ہے کہ حضرت ابوبکر اسلام لانے والے تیسرے شخص ہیں بلکہ تاریخ و حدیث کی بہت سی کتب میں ان سے پہلے بہت سے افراد کہ اسلام قبول کرنے کا ذکر ہے۔

یہ بحث ہم اس نکتہ پر ختم کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے خود اپنے ارشادات میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میں پہلا مومن پہلا مسلمان اور رسول اللہ کے ساتھ پہلا نماز گزار ہوں اور اس سے آپ نے اپنے مقام و حیثیت کو واضح کیا ہے، یہ بات آپ سے بہت سی کتب میں منقول ہے۔

علاوہ ازیں ابن ابی الحدید مشہور عالم ابو جعفر اسکانی معزلی سے نقل کرتا ہے کہ یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ابوبکر اسلام میں سبقت رکھتے تھے اگر یہ امر صحیح ہے تو پھر خود انھوں نے اس سے کسی مقام پر اپنی فضیلت کا استدلال کیوں نہیں کیا اور نہ ہی ان کے حامی کسی صحابی نے ایسا دعویٰ کیا ہے۔ (الغیر ج ۲ ص ۲۴۰)

۴۔ کیا تمام صحابہ نیک اور صالح تھے؟

اس امر کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ علماء اہلسنت عام طور پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول اللہ کے تمام اصحاب پاک، نیکو کار، صالح، شائستہ اور اہل جنت تھے۔ زیر بحث آیت کو بعض لوگ اس دعویٰ کی قطعی دلیل قرار دیتے ہیں۔ اسی مناسبت سے ہم بات دوبارہ اس اہم بات کا تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں کہ جو سلامی مسائل میں بہت سی خرابیوں اور اختلافات کا سرچشمہ ہے۔

بہت سے اہل سنت مفسرین زیر نظر آیت کے ذیل میں نقل کرتے ہیں:

حمید بن زیاد کہتا ہے کہ میں محمد بن کعب قرظی کے پاس گیا میں نے اس سے کہا کہ رسول اللہ کے اصحاب کے بارے میں تم کیا کہتے ہو کہ اس نے کیا کہا: جمیع اصحاب رسول اللہ (ص) فی الجنة محسنہم و مسیئہم

یعنی رسول اللہ کے تمام اصحاب جنتی ہیں چاہے وہ نیکو کار ہو یا گناہ گار
میں نے کہا: ”یہ بات تم کہا سے کہہ رہے ہو؟“

اس نے کہا اس آیت کو پڑھو ﴿وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ﴾ (المہاجرین و الانصار)

وہاں تک جہان فرماتا ہے رضی اللہ عنہم و رضو اعنہ

اس نے مزید کہا؛ لیکن تابعین کے بارے میں ایک ہے اور وہ یہ کہ تابعین صحابہ کی صرف نیک کاموں میں پیروی کریں)
تابعین صرف اسی صورت میں اہل نجات ہیں لیکن صحابہ کے لئے ایسی کوئی شرط نہیں^(۴)

لیکن یہ دعویٰ بہت سے دلائل کی بناء پر غیر قابل قبول ہے کیونکہ

اول تو زیر نظر آیت میں مذکورہ حکم تابعین کے بارے میں بھی ہے اور تابعین سے مراد جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں وہ
تمام لوگ ہیں جو سابقین مہاجرین و انصار کی روش اور طریقے کی پیروی کرتے ہیں اس بناء پر تو تمام امت بغیر کسی
استثناء کے اہل نجات ہونا چاہیے۔

باقی رہا یہ کہ محمد بن کعب والی روایت میں اس بات کا جواب دیا گیا ہے کہ خدا نے تابعین کے لئے ”احسان“ کی شرط
عائد کی ہے یعنی وہ صحابہ کے صرف اچھے طور طریقوں کی پیروی کریں نہ کہ ان کے گناہوں کی یہ بات نہایت عجیب
مباحث میں سے ہے کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ فرع کو اصل سے بڑھا دیا جائے صحابہ کے تابعین کے لئے جب
اعمال صالح میں پیروی شرط نجات ہے تو بطریق اولیٰ یہ شرط خود صحابہ کے لئے بھی ہونی چاہیے۔

بالفاظ دیگر خدا تعالیٰ زیر نظر آیت میں کہتا ہے کہ اس کی رضا اور خوشنودی ان تمام مہاجرین و انصار اور ان کے
تابعین کے لئے ہے جن کی زندگی کا لائحہ عمل صحیح ہو نہ یہ کہ سب مہاجرین و انصار سے وہ راضی ہے چاہے وہ اچھے ہوں
یا برے لیکن تابعین کے لئے اس کی رضا مشروط ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ بات عقل سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ عقل اصحاب پیغمبر کے لئے دوسروں کی نسبت کسی
امتیاز کی قائل نہیں ہوتی۔ ابو جہل میں اور ان افراد میں جو آنحضرت کے دین پر ایمان لا کر منحرف ہو گئے ہیں کیا فرق ہے
؟ وہ اشخاص جو رسول اللہ کے صدیوں بعد دنیا میں آئے اور راہ اسلام میں ان کی فداکاری اور جانبازی پہلے اصحاب رسول
سے کمتر نہیں بلکہ ان کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے پیغمبر اکرم جو دیکھے بغیر پہچانا اور ان پر ایمان لائے کیسے اللہ کی رحمت اور
خوشنودی انہیں حاصل نہ ہوگی۔ وہ قرآن جو کہتا ہے کہ تم میں سے زیادہ صاحبِ تکریم خدا کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ پرہیز

گار ہے وہ اس غیر منطقی تبعیض اور ترجیح کو کیسے پسند کر سکتا ہے وہ قرآن جو اپنی مختلف آیات میں ظالموں اور فاسقوں پر لعنت کرتا ہے اور انہیں عذاب الہی کا مستحق شمار کرتا ہے وہ کس طرح عذاب الہی سے صحابہ کی غیر منطقی مصونیت اور تحفظ کی تائید کر سکتا ہے کیا قرآن کی ایسی لعنتیں اور دھکیاں قابل استثناء ہیں اور ایک گروہ ان سے خارج ہے؟ آخر کیوں اور کس لئے؟

تمام چیزوں سے قطع نظر کیا ایسا فیصلہ صحابہ کو ہر قسم کے گناہ اور نافرمانی کی اجازت دینے کے مترادف نہیں ہے؟ تیسرا یہ کہ ایسا فیصلہ اسلامی تاریخ سے کسی طرح بھی مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ بہت سے لوگ تھے جو ایک دن انصار و مہاجرین کے ساتھ تھے بعد ازاں اس راستے سے منحرف ہو گئے اور رسول اللہ ان سے خفا و ناراض ہوئے اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ کی ناراضگی غضبِ خدا کا باعث ہے کیا گذشتہ آیات میں ہم نے ثعلبہ بن حاطب انصاری کی داستان نہیں پڑھی کہ وہ کس طرح منحرف ہو گیا اور مغضوب پیغمبر ہو گیا۔ زیادہ وضاحت سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ان لوگوں کی مراد یہ ہے کہ اصحاب رسول سب کے سب کسی قسم کے گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے تھے اور ہر معصیت سے معصوم اور پاک تھے تو یہ واضحیات کے انکار کے مترادف ہے۔ اگر مراد یہ ہے کہ انھوں نے گناہ تو کئے ہیں اور غلط اعمال بھی انجام دئے لیکن پھر بھی خدا ان سے راضی ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے گناہ پر رعایت دی ہے۔

طلحہ و زبیر کے جو ابتداء میں رسول اللہ کے اصحاب خاص میں سے تھے اور اسی طرح عائشہ جو رسول اللہ کی زوجہ تھیں انہیں جنگ جمل کے سترہ ہزار مقتول مسلمانوں کے خون سے کون بر الذمہ قرار دے سکتا ہے؟ کیا خدا ان خونریزوں پر راضی تھا؟

علیؑ کی مخالفت جو خلیفہ رسول تھے فرض کریں کہ ان کی خلافت منصوص نہ تھی۔ مگر کم از کم وہ امت کے اجماع و اتفاق سے تو چنے گئے تھے، ان کے خلاف اور ان کے اصحاب باوفا کے خلاف تلوار کھینچنا کیا ایسا عمل تھا، جس پر خدا راضی تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ ”تنزیہ صحابہ“ ایک مفروضہ ہے جس کے طرفداروں نے اس بات پر اصرار کمر کے اور دباو ڈال کر اس اسلام کے پاکیزہ چہرے کو بگاڑ دیا ہے جو ہر مقام پر شخصیت کی میزان ایمان اور عمل صالح کو قرار دیتا ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ خدا کی رضا اور خشنودی جس کا ذکر زیر نظر آیت میں ہے چند امور کے ضمن میں ہے اور وہ ہیں ہجرت نصرت، ایمان اور عمل صالح۔ تمام صحابہ اور تابعین جب تک ان کے مطابق رہے خدا کی رضا ان کے شامل حال رہی اور جس دن کوئی ان سے دور ہو گیا اس دن وہ رضائے الہی سے بھی دور ہو گیا۔

جو کچھ ہم نے کہا اس سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ مذکورہ متعصب مفسر یعنی مولف المنار نے شیعوں کی اس بات پر جو سرزنش کی ہے وہ تمام صحابہ کی پاکیزگی اور درستی کا اعتقاد نہیں رکھتے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ شیعوں نے اس کے سوا کوئی گناہ نہیں کیا کہ انھوں نے حکم عقل، شہادت تاریخ اور قرآن کی گواہی کو قبول کیا ہے اور متعصب افراد کے فضول اور نادارست امتیازات پر کان نہیں دھرا۔

۱۔ الغدیری یہ حدیث مستدرک حاکم ج ۲ ص ۱۳۶، استعاب ج ۲ ص ۴۵ اور شرح ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۳۵۸ سے نقل کی گئی ہے۔

۲۔ الغدیری ہی میں یہ حدیث طبرانی اور بیہقی سے نقل کی گئی ہے نیز بیہقی نے مجمع میں، حافظ گنجی نے کفایہ اکمال میں اور کنز العمال میں نقل کی ہے۔

۳۔ یہ حدیث مختلف نقل ہوئی ہے اور جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اسے جعفر اسکانی نے کتاب نہج العثمانيہ میں، بہان الدین نے نجباء الانبياء میں، ابن اثیر کامل میں اور بعض دیگر علماء نے نقل کیا ہے (مزید وضاحت کے لئے الغدیر، عربی کی جلد دوم ص ۲۷۸ تا ۲۸۶ کی طرف رجوع کریں۔

۴۔ تفسیر المنار اور تفسیر کبیر از فخر رازی زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

آیت ۱۰۱

۱۰۱۔ ﴿وَمَنْ حَوْلَكُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ سَنُعَذِّبُهُمْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ﴾۔

ترجمہ

۱۰۱۔ بادیہ نشین اعراب جو تمہارے اطراف میں ہیں ان میں ایک جماعت منافقین کی ہے اور (خود) اہل مدینہ میں سے (بھی) ایک گروہ نفاق کا سخت پابند ہے انھیں تم نہیں پہچانتے اور ہم انہیں پہچانتے ہیں۔ عنقریب ہم انھیں دو مرتبہ عذاب دیں گے (ایک اجتماعی رسوائی کا عذاب اور دوسرا موت کے وقت کا عذاب) اس کے بعد (قیامت میں) عذابِ عظیم کی طرف بھیجے جائیں گے۔

تفسیر

قرآن مجید بحث کا رخ دوبارہ منافقین کی طرف موڑ رہا ہے فرمایا گیا ہے: ان لوگوں کے درمیان جو تمہارے شہر (مدینہ) کے اطراف میں ہیں ایک گروہ منافقین کا موجود ہے ﴿وَمَنْ حَوْلَكُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ﴾۔ یعنی صرف داخلی منافقین پر توجہ نہ رکھو بلکہ ہوشیار رہ کر باہر کے منافقین پر بھی نگاہ رکھو۔ ان کی خطرناک کار گزاریوں پر نظر رکھو اور ان پر بھی۔

لفظ ”اعراب“ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے عام طور بادیہ نشین عربوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ پھر مزید فرمایا گیا ہے: خود مدینہ میں اور اس شہر کے رہنے والوں میں ایک گروہ ان لوگوں کا ہے کہ جن کا نفاق سرکشی کی حد تک پہنچا ہوا ہے اور وہ اس کے سخت پابند ہیں اور اس میں تجربہ کار ہیں ﴿وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَىٰ النِّفَاقِ﴾۔ ”مردودا“ مادہ ”مرد“ (بروزن ”سرد“) سے ہے اس کا مطلب ہے مطلق طغیان سرکشی اور بے گانگی۔ اصل میں یہ ”برہنگی“ اور ”تجرد“ کے معنی میں آیا ہے۔ اسی بنا پر جن لڑکوں کے چہروں پر بال نہ اگے ہوں انھیں ”امرد“ کہتے ہیں۔ ”شجرۃ مرداء“ ایسے درخت کو کہتے ہیں جس پر بالکل پتے نہ ہوں اور ”مرد“ ایسے شخص کو کہتے ہیں جو اطاعت حکم سے بالکل نکل گیا ہو۔

بعض مفسرین اور اہل لغت نے اس مادہ کا ایک معنی ”تمرین“ بھی بیان کیا ہے ﴿تاج العروس اور ”قاموس“ میں بھی اس کا ایک معنی ”تمرین“ ذکر ہوا ہے﴾۔ یہ شاید اس بناء پر ہو کہ کسی چیز سے مطلق تجرد اور مکمل خروج بغیر تمرین کے ممکن ہیں نہیں۔

بہر حال یہ منافقین حق و حقیقت سے اس قدر عاری اور اپنے کام میں اتنے ماہر ہیں کہ وہ اپنے آپ کو سچے مسلمانوں میں اس طرح شامل رکھتے ہیں کہ کسی کو ان کے منافق ہونے کا پتہ نہیں۔ داخلی اور خارجی منافقین کے بارے میں تعبیر کا یہ فرق جو زیر نظر آیت میں دکھائی دیتا ہے گویا اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ داخلی منافق اپنے کام میں زیادہ ماہر ہیں لہذا وہ طبعاً زشیادہ خطرناک ہیں اور مسلمانوں کو چاہئیے کہ ان پر کڑی نظر رکھیں اگرچہ خارجی منافقین سے بھی غافل نہیں رہنا چاہئیے۔

اسی لئے اس کے بعد بلافاصلہ فرمایا گیا ہے: تم انھیں نہیں پہچانتے لیکن ہم انھیں پہچانتے ہیں ﴿لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ﴾۔ البتہ یہ پیغمبر کے عمومی علم کی طرف اشارہ ہے مگر یہ اس بات کے منافی نہیں کہ وحی اور تعلیم الہی کے ذریعے آپ ان کے اسرار سے پوری طرح واقف تھے۔

آیت کے آخر میں اس گروہ کے لئے سزا اور سخت عذاب کو یوں بیان کیا گیا ہے: ہم عنقریب انھیں دو مرتبہ عذاب دیں گے اور اس کے بعد وہ ایک عذاب عظیم کی طرف بھیجے جائیں گے ﴿سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ﴾۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ”عذاب عظیم“ روز قیامت کے عذاب اور سزاؤں کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ کہ اس سے پہلے دو عذابوں کا جو ذکر ہے اس سے کیا مراد ہے اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے اور انھوں نے بہت سے احتمالات ذکر کئے ہیں لیکن زیادہ تر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک عذاب وہی اجتماعی سزا جو ان کی رسوائی اور ان کے اسرار منکشف ہو جانے کے بعد تمام معاشرتی وقار اور اہمیت کھو جانے کی صورت میں ہوگا اس کا ذکر شاید گذشتہ آیات میں موجود ہے اور بعض احادیث میں بھی آیا ہے کہ جب ان لوگوں کا معاملہ خطرناک مراحل تک پہنچ جاتا تو رسول اللہ ان کا تعارف کروادیتے یہاں تک کہ انھیں مسجد سے بھی نکال دیتے۔

ان کے لئے دوسری سزا اور عذاب وہی ہے جس کی طرف سورہ انفال کی آیہ ۵۰ میں اشارہ ہو چکا ہے۔ جہاں فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَوْ تَرَىٰ اذِيتُوفِي الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةَ يَضْرِبُونَ وُجُوهُهُمْ وَاذِيتُوفِي الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةَ يَضْرِبُونَ وُجُوهُهُمْ﴾ الخ

اگر تو کافروں کو اس وقت دیکھے جب موت کے فرشتے ان کی جان لے رہے ہوں کہ کس طرح فرشتے ان کے چہروں اور پشتوں پر مار رہے ہیں اور انھیں سزا دے رہے تو تجھے ان کی حالت پر افسوس ہوگا۔
یہ احتمال بھی ہے کہ دوسرا عذاب اندرونی اذیت اور روحانی سزا اور تکلیف کی طرف اشارہ ہو کہ جو مسلمانوں کی ہر طرف سے کامیابی کے زیر اثر انھیں پہنچتی ہے۔

آیت ۱۰۲

۱۰۲۔ ﴿وَآخِرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ -

ترجمہ

۱۰۲۔ اور دوسرے گروہ نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا ہے اور صالح اور غیر صالح اعمال کو آپس میں ملا دیا ہے امید ہے خدا ان کی توبہ کر لے۔ اللہ غفور و رحیم ہے۔

شان نزول

زیر نظر آیت کی شان نزول کے بارے میں کئی روایات نقل ہوئی ہیں ان میں سے اکثر میں ابو لبابہ انصاری کا نام ملتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس نے دو یا کچھ اصحاب پیغمبر کے ساتھ مل کر جنگ تبوک میں شرکت نہ کی لیکن جب ان افراد نے وہ آیات سنیں جو متخلفین کی مذمت میں نازل ہوئی تھیں تو بہت پریشان اور پشیمان ہوئے اور اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں کے ساتھ باندھ دیا۔ رسول اللہ نے ان کے بارے میں استفسار کیا۔ آپ کو بتایا گیا کہ انھوں نے قسم کھائی ہے کہ اپنے آپ کو ستونوں سے نہیں چھڑائیں گے جب تک کہ خود رسول اللہ آکر انھیں نہ چھوڑ دیں۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ یہ کام نہیں کروں گا مگر یہ کہ خدا مجھے اس کی اجازت دے۔

اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور خدا نے ان کی توبہ قبول کی۔ اس پر رسول اللہ نے آکر انھیں مسجد کے ستونوں سے کھول دیا۔

اس کے شکرانے کے طور پر انھوں نے اپنا سارا مال رسول اللہ کی خدمت میں پیش کر دیا اور عرض کیا یہ وہی مال و اسباب ہے جس سے دل بستگی کی خاطر ہم نے شریک جہاد ہونے سے گریز کیا تھا۔ یہ سب کچھ ہم سے قبول کر کے راہ خدا میں خرچ کیجئے۔

پیغمبر اکرم نے فرمایا: ابھی تک اس کے بارے میں مجھ پر کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ بعد والی آیت نازل ہوئی اور آپ کو حکم دیا گیا کہ ان کے اموال میں سے کچھ حصہ لے لیں اور بعض روایات کے مطابق تیسرا حصہ قبول کرنے کا حکم ہوا۔

کچھ اور روایات میں ہے کہ مندرجہ بالا آیت ابو لبابہ کے بارے میں بنی قریظہ کے واقعہ کے سلسلہ میں ہے قریظہ یہودی تھے انھوں نے ابو لبابہ سے مشورہ کیا کہ کیا ہم پیغمبر کا فیصلہ مان لیں یا نہ۔ اس نے کہا کہ اگر تم نے ان کا فیصلہ مان لیا تو

آنحضرت ﷺ تم سب کے سر اڑا دیں گے۔ اس کے بعد ابو لہبہ اپنی اس بات پر پشیمان ہوا اور توبہ کی اور اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دیا۔ اس کے بعد مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور خدا تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کر لی۔^(۱)

۱۔ مجمع البیان اور دیگر تفاسیر۔

توبہ کرنے والے

گزشتہ آیت میں مدینہ داخلی اور خارجی منافقین کی کیفیت بتائی گئی تھی ان یہاں ایک گناہگار مسلمان گمروہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے انھوں نے توبہ کی اور اپنے برے اعمال کی تلافی کے لئے اقدام کیا۔ ارشاد ہوتا ہے: ان میں سے ایک گمروہ نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے ﴿وَأَخْرُوزَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ﴾ اور انھوں نے اچھے اور برے اعمال کو آپس میں ملا دیا ہے ﴿خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا﴾۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: امید ہے خدا ان کی توبہ قبول کر لے اور اپنی رحمت ان کی طرف پلٹا دے ﴿عَسَى اللَّهُ أَن يَتُوبَ عَلَيْهِمْ﴾۔ ”کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے“ اور وسیع و عریض رحمت کا مالک ہے ﴿إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾۔

مندرجہ بالا آیت میں ”عسی“ کی تعبیر آئی ہے یہ عموماً کامیابی اور ناکامی کے اکتھے احتمال کے مواقع پر آتی ہے یہ شاید اس بناء پر ہے کہ انھیں امید و بیم اور خوف و رجاء کے درمیان رکھا جائے کیونکہ یہ دونوں کیفیتیں تکامل اور ارتقاء اور تربیت کا ذریعہ ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ”عسی“ کی تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ توبہ، ندامت اور پشیمانی کے علاوہ انھیں دیگر شرائط کو بھی پورا کرنا چاہئے اور اپنے نیک اعمال کے ذریعے گزشتہ کی تلافی کرنا چاہئے۔ لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آیت اللہ کو غیر ان و رحمت کے ذکر سے مکمل کیا گیا ہے، اس میں امید کا پہلو غالب ہے۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ آیت اگرچہ ابو لباہ کے بارے میں یا جنگ تبوک کے دیگر متخلفین کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس سے آیت کا وسیع معنی محدود نہیں ہو جاتا بلکہ آیت ان تمام افراد کا احاطہ کئے ہوئے ہے جو نیک و بد اعمال کو خلط ملط کر دیتے ہیں اور پھر اپنے برے اعمال پر پشیمان ہوتے ہیں ض اسی لئے بعض علماء سے منقول ہے انھوں نے کہا ہے کہ مندرجہ بالا آیت نہایت امید بخش آیات قرآن میں سے ہے کہ جس نے گنہ گاروں کے لئے کئی دروازے کھول دیئے ہیں اور توبہ کرنے والوں کو اپنی طرف دعوت دی ہے۔

آیات ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵

۱۰۳۔ ﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾۔

۱۰۴۔ ﴿أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَأْخُذُ الصَّدَقَاتِ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾۔

۱۰۵۔ ﴿وَقُلْ اْعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ وَسَتُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ

تَعْمَلُونَ﴾۔

ترجمہ

۱۰۳۔ انکے اموال سے صدقہ (زکوٰۃ) لے لو تاکہ انھیں اس کے ذریعے پاک کرو اور ان کی تربیت کرو اور (زکوٰۃ لیتے وقت) انھیں دعا دو کیونکہ تمہاری دعا ان کے سکون کا باعث ہے اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۱۰۴۔ کیا وہ جانتے نہیں کہ صرف خدا ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور صدقات لیتا ہے اور خدا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

۱۰۵۔ کہہ دو! عمل کرو خدا، اس کا رسول اور مومنین تمہارے عمل کو دیکھتے ہیں اور عنقریب اس کی طرف لوٹ کر جاو گے کہ جو پنہاں اور آشکار کو جانتا ہے اور تمہیں اس چیز کی خبر دے گا جو کچھ تم کرتے ہو۔

زکوٰۃ فرد اور معاشرے کو پاک کرتی ہے

پہلی زیر نظر آیت میں ایک اہم اسلامی حکم یعنی زکوٰۃ کی طرف اشارہ ہوا ہے اور رسول اللہ کو ایک عمومی قانون کے طور پر حکم دیا گیا ہے کہ ان کے اموال سے صدقہ یعنی زکوٰۃ وصول کرو ﴿مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً﴾۔

لفظ ”من“ جو تبعیض کے لئے ہے نشاندہی کرتا ہے کہ زکوٰۃ مال کا ایک حصہ ہوتا ہے پورا مال نہیں اور نہ ہی اس کا پورا حصہ زکوٰۃ قرار پاتا ہے۔

اس کے بعد زکوٰۃ کے اخلاقی، نفسیاتی اور اجتماعی فلسفہ کے دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس طرح سے تو انھیں پاک کرتا ہے اور نشو و نما دیتا ہے ﴿تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا﴾۔ انھی اخلاقی رذائل، دنیا پرستی اور بخل سے پاک کرتا ہے اور انسان دوسری، سخاوت اور دوسروں کے حقوق کی پاسداری کے لئے نشو و نما دیتا ہے۔

اس سے قطع نظر معاشرے کے ایک طبقے کی محرومیت سے جو خرابیاں، افلاس، گناہ اور طبقاتی تفاوت جنم لیتی ہے۔ اسے الہی فریضہ انجام دے کر ختم کرو اور معاشرے کو ان آلودگیوں سے پاک کر دو۔ علاوہ براین اجتماعی وابستگی، نمو

، اقتصادی پیش رفت ایسے ہی کاموں سے ہوتی ہے اس بناء پر زکوٰۃ کا حکم ایک طرف سے معاشرے اور فرد کو پاک کرتا ہے اور دوسری طرف انسانوں میں فضیلت کے بیج کی نشو و نما کرتا ہے۔ نیز معاشرے کی پیش رفت کا سبب بھی ہے اور زکوٰۃ کے بارے میں پیش کی جا سکنے والی یہ بہترین تعبیر ہے یعنی ایک طرف سے یہ آلودگیوں کو دھو ڈالتی ہے دوسری طرف ارتقاء و تکامل کا ذریعہ ہے۔ آیت کے معنی میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ”تطهرهم“ کا فاعل زکوٰۃ ہو اور ”تزکيهم“ کا فاعل پیغمبر اکرم ہوں۔ اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ زکوٰۃ انھیں پاک کرتی ہے اور اس کے ذریعے تو ان کی نشو و نما کرتا ہے لیکن زیادہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا فاعل ذاتِ پیغمبر ہے۔ جیسا کہ ہم نے ابتداء میں معنی کیا ہے اگرچہ نتیجہ کے لحاظ سے ان دونوں تعبیروں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے جس وقت وہ زکوٰۃ ادا کریں تو ان کے لئے دعا کرو اور ان پر درود بھیج دو ﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ﴾۔ یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ واجب ذمہ داریاں ادا کرنے پر بھی لوگوں کی قدر دانی کی جانا چاہیئے اور خصوصیت سے معنوی اور نفسیاتی طریقے سے انھیں تشویق دلائی چاہیئے لہذا روایات میں ہے کہ جب رسول اللہ کی خدمت میں زکوٰۃ لے کر آتے تھے تو آپ ”اللھم صل علیہم“ کہہ کر ان کے لئے دعا کرتے تھے۔

بعد میں مزید فرمایا گیا ہے: تمہارا یہ دعا کرنا اور درود بھیجنا ان کے قلبی سکون کا سرمایہ ہے ﴿إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ﴾۔ کیونکہ اس دعا سے ان کے قلب و روح پر رحمتِ الہی کا غزل ہوتا ہے اور وہ اسے محسوس کرتے ہیں علاوہ ازیں رسول اللہ یا ان کے جانشین لوگوں کی جو قدر دانی کرتے ہیں اور ان کے مال کی زکوٰۃ لیتے ہیں تو انھیں ایک قسم کا روحانی اور فکری سکون پہنچاتے ہیں یعنی اگر ظاہراً وہ ایک چیز دے بیٹھے ہیں تو اس سے بہتر چیز انھوں نے حاصل کی ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ہم نے آج تک نہیں سنا کہ مالیات پر مامور افراد کی ذمہ داری ہو کہ وہ لوگوں کا شکریہ ادا کریں لیکن یہ ایک مستحب حکم اسلامی لائحہ عمل میں موجود انسانی اقدار کے گہرے احترام کو واضح کرتا ہے۔

آیت کے آخر میں گذشتہ بحث کی مناسبت سے ارشاد ہوتا ہے: خدا سننے والا اور جاننے والا ہے (وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ)۔ وہ پیغمبر کی دعا بھی سنتا ہے اور زکوٰۃ دینے والوں کی نیت کو بھی جانتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ قبول کی گئی زکوٰۃ:

گزشتہ آیات کے بارے میں جو شان نزول ہم نے ذکر کی ہے اس سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت ان آیات سے قریبی تعلق رکھتی ہے جن کا ربط ابو لبابہ اور اس کے ساتھیوں کی توبہ کے واقعہ سے ہے کیونکہ وہ اپنی توبہ قبول ہونے کے شکرانے پر اپنا سب مال رسول اللہ کی خدمت میں لے آئے اور آپ نے ان کے مال میں سے کچھ حصہ لے لیا لیکن یہ شان نزول اس کے منافی نہیں کہ آیت زکوٰۃ کے بارے میں ایک عمومی حکم رکھتی ہو اور یہ جو بعض مفسرین نے ان دونوں کے درمیان تضاد و خیال کیا ہے درست نہیں ہے جیسا کہ ہم نے باقی آیات اور ان کی شان، نزول کے بارے میں کئی مرتبہ کہا ہے۔

ایک ہی سوال باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس روایت کے مطابق رسول اللہ نے ابو لبابہ اور اس کے ساتھیوں کے مال میں سے ایک تہائی حصہ قبول کیا تھا جب کہ زکوٰۃ کی مقدار کسی مقام پر بھی $1/3$ نہیں ہے۔ گندم، جو، خرما اور کشمش میں دسواں حصہ ہوتا ہے اور کبھی بیسواں۔ سونا اور چاندی میں ڈھائی ($1/2 - 2$) فیصد زکوٰۃ ہوتی ہے اور گائے، گوسفند اور اونٹ میں بھی زکوٰۃ کی مقدار ایک تہائی نہیں بنتی۔

لیکن اس سوال کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ نے ان کے اموال میں سے ایک حصہ زکوٰۃ کے طور پر اور باقی ان کے گناہوں کے کفارے پر وصول کیا اس بناء پر آپ نے ان سے واجب زکوٰۃ لی اور کچھ مقدار انھیں گناہوں سے پاک کرنے کے لئے قبول کی جس کی کل مقدار ان کے اموال کا $1/3$ حصہ بنتی ہے۔

۲۔ ”خذ“ کا مفہوم:

اس کا معنی ہے ”لے لو“ یہ حکم اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اسلامی حکومت کا سربراہ لوگوں سے زکوٰۃ لے سکتا ہے نہ یہ کہ وہ منتظر رہے کہ اگر لوگ چاہیں تو ادا کریں اور اگر نہ چاہیں تو نہ کریں۔

۳۔ ”صل علیہم“ کے حکم کی عمومیت:

صل علیہم ”اگرچہ رسول اللہ سے خطاب ہے مگر واضح ہے کہ یہ ایک کلی اور عمومی حکم ہے (کیونکہ کلی قانون یہ ہے کہ پیغمبر کی خصوصیات کو دلیل خاص کا ذریعہ ہونا چاہئے)۔

لہذا بیت المال کے ذمہ دار اور نگران ہر زمانے میں زکوٰۃ دینے والوں کو ”اللہم صلی علیہم“ کہہ کر مدعا دے سکتے ہیں

اس کے باوجود اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ اہل سنت میں سے کچھ متعصب افراد آلِ نبی پر درود و صلوة کو بالکل جائز نہیں سمجھتے یعنی اگر کوئی کہے ”اللهم صلی علی امیر المومنین“ یا ”صلی علی فاطمة الزهراء“ تو اسے ممنوع شمار کرتے ہیں۔^(۱)

حالانکہ ایسی دعا ممنوع ہونے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے نہ کہ جواز کے لئے دلیل کی احتیاج ہے۔ علاوہ ازیں جیسا کہ سطور بالا میں ہے قرآن صراحت سے اجازت دیتا ہے کہ عام افراد کے بارے میں ایسی دعا کی جائے، چہ جائیکہ اہل بیت رسول، جانشینان، پیغمبر اور اولیاءِ الہی کے لئے۔ لیکن کیا کیا جاسکتا ہے کہ بعض اوقات تعصبات قرآنی آیات بھی سمجھنے نہیں دیتے۔

بعض گنہ گار مثلاً جنگ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے رسول اللہ سے اصرار کرتے تھے کہ آپ ان کی توبہ قبول کر لیں۔ اس سلسلے میں زیر بحث دوسری آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ توبہ قبول کرنا رسول کا کام نہیں ہے ”کیا وہ جانتے نہیں کہ خدا ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے ﴿لَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ﴾۔ وہ نہ فقط توبہ قبول کرنے والا ہے بلکہ زکوٰۃ یا دوسرے صدقات جو گناہ کے کفارہ کے طور پر یا پروردگار کے تقرب کے لئے دیئے جاتے ہیں وہ بھی خدا ہی لیتا ہے ﴿وَيَأْخُذُ الصَّدَقَاتِ﴾۔

اس میں شک نہیں کہ زکوٰۃ و صدقات پیغمبر، امام اور مسلمانوں کے پیشوا و وصول کرتے ہیں یا مستحق افراد لیتے ہیں۔ بہر صورت بظاہر ان سے یہ چیزیں خدا نہیں لیتا۔ لیکن چونکہ پیغمبر اور ہادیان برحق کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے (اس لئے کہ وہ خدا کے نمائندے ہیں) تو گویا خدا ہی ان صدقات کو وصول کرتا ہے اس طرح ضرورت مند بندے جو خدا کی اجازت اور فرمان سے ایسی مدد قبول کرتے ہیں درحقیقت اسی کے نمائندے ہیں اس طرح ان کا ہاتھ بھی خدا ہی کا ہاتھ ہے یہ ایک انتہائی لطیف چیز ہے جو زکوٰۃ کے اس اسلامی حکم کی عظمت و شکوہ کی تصویر کشی کرتی ہے۔

اس عظیم خدائی فریضہ کی ادائیگی کے لئے مسلمانوں کو شوق دلانے کے علاوہ اس طرح سے انھیں خبردار کیا گیا ہے کہ وہ زکوٰۃ و صدقات ادا کرنے میں انتہائی ادب و احترام ملحوظ نظر رکھیں کیونکہ لینے والا خدا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کوتاہ فکری سے یہ تصور کر لیا جائے کہ ضرورت مند شخص کی تحقیر و تذلیل میں کوئی حرج نہیں یا اسے اس طرح زکوٰۃ دی جائے کہ اس کی شخصیت مجروح ہو بلکہ اس کے برعکس چاہیے کہ یہ انکساری کے ساتھ اپنے ولی نعمت کے سامنے ادب کے اظہار کے ساتھ زکوٰۃ اس کے مستحق تک پہنچائی جائے۔

رسول اکرم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ان الصدقة تقع في يد الله قبل ان تصل الي يد السائل
صدقہ حاجت مند کے ہاتھ میں جانے سے پہلے خدا کے ہاتھ میں پہنچتا ہے۔

دوسری حدیث میں امام سجاد علیہ السلام سے منقول ہے: ان الصدقة لاتقع في يد العبد حتى تقع في يد الرب
صدقہ بندے کے ہاتھ میں اس وقت تک نہیں پہنچتا جب تک کہ پہلے پروردگار کے ہاتھ میں نہ جائے
(پہلے خدا کے ہاتھ میں جاتا ہے پھر بندے کے ہاتھ میں جاتا ہے) ^(۳)
یہاں تک کہ ایک روایت میں ہے:

اس بندے کے تمام اعمال فرشتے اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں سوائے صدقہ کے کہ جو براہ راست خدا کے ہاتھ میں
جاتا ہے۔ ^(۴)

یہی مضمون جو مختلف تعبیروں کے ساتھ ہم نے روایات اہل بیت علیہم السلام میں پڑھا ہے اہل سنت کے طرق سے بھی
ایک اور تعبیر کے ساتھ نقل ہوا ہے۔ صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:
ما تصدق احدكم بصدقة من كسب حلال طيب ولا تقبل الله الا الطيب الا اخذها الرحمن بيمينه و ان كانت
ثمرة فتربوا في كف الرحمن حتى تكون اعظم من الجبل۔

تم میں سے کوئی شخص حلال کمائی میں سے صدقہ نہیں دے گا۔ اور البتہ خدا حلال کے علاوہ قبول نہیں کرتا۔ مگر یہ کہ
خدا اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لے گا۔ اگر خرما کا ایک دانہ ہو۔ پھر وہ خدا کے دست قدرت میں بڑھنا شروع ہو گا یہاں
تک کہ وہ پہاڑ سے بھی بڑا ہو جائے گا۔ ^(۵)

یہ حدیث معنی خیز تشبیہات اور کنایہ جات سے معمور ہے۔ اس سے اسلامی تعلیمات میں انسانی خدمت اور حاجت
مندوں کی مدد کی بہت زیادہ اہمیت واضح ہوتی ہے۔

احادیث میں اس ضمن میں کئی ایک اور تعبیرات بھی آئی جو بڑی جاذبِ نظر اور اہم ہیں۔ ان میں مکتب اسلام کے
پرورش یافتہ افراد کو حاجت مندوں کو مدد دیتے ہوئے ایسا منکر بنا کر پیش کیا گیا ہے گویا حاجت مندوں نے مدد قبول کر کے
ان پر احسان کیا ہے اور انھیں اعزاز و افتخار سے نوازا ہے۔ مثلاً بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آئمہ معصومین
بعض اوقات حاجت مند کو صدقہ دینے سے پہلے احترام اور تعظیم کی علامت کے طور پر اپنے ہاتھ کا بوسہ لیتے یا یہ کہ پہلے وہ
مال حاجت مند کو دے دیتے پھر اسے لے کر بوسہ لیتے اور سو نگھتے پھر اسے واپس کر دیتے چونکہ وہ دستِ خدا کے روبرو

ہوتے تھے لیکن وہ لوگ ان تعلیمات سے کس قدر دور ہیں کہ جو اپنے ضرورت مند بھائیوں یا بہنوں کی تھوڑی سی مدد کرتے ہوئے ان کی تذلیل کرتے ہیں یا ان سے سختی یا بے اعتنائی سے پیش آتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات بے ادبی سے ان کی طرف پھینکتے ہیں۔

البتہ جیسا کہ اپنے مقام پر ہم نے کہا ہے کہ اسلام اپنی پورے اسلامی معاشرے میں کوئی فقیر اور حاجت مند نہ رہے لیکن اس میں شک نہیں کہ ہر معاشرے میں کچھ آبرو مند و ناتواں، ننھے یتیم اور بیمار وغیرہ ہوتے ہیں جو کمانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ضروری ہے کہ بیت المال اور متمکن افراد کے ذریعے انتہائی ادب و احترام سے ان کی ضروریات کو پورا کیا جائے۔

آیت کے آخر میں زیادہ تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: **﴿وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾**

توبہ اور اس کی تلافی جیسا کہ قرآن مجید کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ گناہ پر صرف ندامت اور پشیمانی کا نام نہیں بلکہ ضروری ہے کہ ندامت کے ساتھ ساتھ اصلاح اور تلافی بھی شامل ہو۔ ممکن ہے یہ تلافی بھی شامل ہو۔ ممکن ہے یہ تلافی ضرورت مندوں کی بلا عوض امداد کی صورت میں ہو جیسا کہ مندرجہ بالا آیات میں اور ابو لباہ کے واقعہ میں ہم نے پڑھا ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں کہ گناہ مالی امور سے متعلق ہو یا کسی اور سے متعلق، جیسا کہ ہم جنگ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں کے مسئلہ میں پڑھ چکے ہیں۔ درحقیقت مقصد یہ ہے کہ گناہ سے آلودہ روح کو نیک، صالح اور شائستہ عمل سے دھویا جائے اور اسے پاک کیا جائے اور پہلی اور فطری پاکیزگی کو لوٹایا جائے۔

بعد والی آیت میں گذشتہ مباحث کے بارے میں نئی شکل میں تاکید کی گئی ہے۔ پیغمبر اکرم کو حکم دیا گیا ہے کہ تمام لوگوں کو اس امر کی تبلیغ کریں اور کہیں کہ اپنے اعمال اور ذمہ داریاں انجام دو اور جان لو کہ خدا، اس کا رسول اور مومنین تمہارے اعمال کو دیکھیں گے **﴿وَقُلْ اَعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ﴾**۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ کوئی تصور نہ کرے کہ اگر وہ کسی خلوت کے مقام پر یا کسی جماعت کے اندر کوئی عمل انجام دیتا ہے تو وہ علم خدا کی نگاہ سے اوجھل رہ جاتا ہے بلکہ خدا کے علاوہ وہ پیغمبر اور مومنین بھی اس سے آگاہ ہیں۔ اس حقیقت کی طرف توجہ اور اس پر ایمان اعمال اور نیتوں کے پاک رہنے کے لئے بہت موثر ہے عام طور پر اگر انسان یہ احساس کر کہ اسے ایک آدمی دیکھ رہا ہے تو وہ اپنی کیفیت ایسی بنالے گا کہ جو قابل اعتراض نہ ہو چہ جائیکہ اسے یہ احساس

ہو کہ خدا و رسول اور مومنین اس کے اعمال سے باخبر ہیں۔ عنقریب تم ایسی ہستی کی طرف لوٹ جاؤ گے جو مخفی اور آشکار سے آگاہ ہے اور وہ تمہیں تمہارے عمل کی خبر دے گا اور اس کے مطابق جزا دے گا ﴿وَسُئِّرْ دُونَ إِلَيَّ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾۔

۱۔ مجمع البیان، زیر بحث آیے کے ذیل میں۔

۲۔ ان لوگوں کی اہل بیت رسالت سے دشمنی اس حد تک ہے کہ آنحضرت کے لئے بھی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہتے ہیں اور ”صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم“ نہیں کہتے۔ جب کہ رسول اللہ نے خود آل کے ذکر کے بغیر صلوات کو ”دم کٹی صلوات“ قرار دیا ہے۔ کد اوند عالم مسلمانوں کو عظمت اہل بیت ﷺ کا اقرار کرنے کی توفیق عطا فرمائے (مترجم)

۳۔ تفسیر صافی زیر بحث آیت کے ذیل میں بحوالہ تفسیر عیاشی۔

۴۔ تفسیر برہان زی بحث آیت کے ذیل میں بحوالہ تفسیر عیاشی۔

۵۔ تفسیر المنارج ۱۱ ص ۳۳ (یہ حدیث طرق اہل بیت سے امام صادق علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے۔ بحار الانوار ج ۹۶ ص ۱۴۳ طبع جدید کی طرف رجوع فرمائیں)

ایک اور گروہ فرمان خدا سے نکل گیا۔

۱۔ اعمال پیش ہونے کا مسئلہ: بہت سی روایات اور خبریں جو آئمہ سے پہنچی ہیں ان کے پیش نظر مکتب اہل بیت کے پیروں کا یہ مشہور و معروف عقیدہ ہے کہ پیغمبر اکرم اور آئمہ ہدای تمام امت کے اعمال سے آگاہ ہو جاتے ہیں یعنی خدا تعالیٰ مخصوص طریقوں سے امت کے اعمال ان کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

اس سلسلے میں منقول روایات بہت زیادہ ہیں اور شاید حد تو اتر تک ہوں۔ ہم نمونے کے طور پر ان میں سے مختلف قسم کی چند روایات ذیل میں درج کرتے ہیں۔

۱۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

تعرض الاعمال علی رسول اللہ اعمال العباد کل صباح ، ابراہا و فجارہا ، فاحذروہا ، وهو قول اللہ عز وجل و قل اعملوا فیسیری اللہ عملکم و رسولہ ، وسکت۔

لوگوں کے تمام اعمال ہر روز صبح کے وقت رسول خدا کے سامنے پیش ہوتے ہیں، چاہے وہ نیک لوگوں کے اعمال ہوں یا برے لوگوں کے، لہذا متوجہ رہو (اور اسے ڈرو) اور خدا تعالیٰ کے ارشاد ”قل اعملوا فیسیری اللہ عملکم و رسولہ“ کا یہی مفہوم ہے یہ کہہ کر آپ خاموش ہو گئے۔^(۱)

۲۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے جس میں آپ ﷺ فرماتے ہیں:

ان الاعمال تعرض علی نبیکم کل عشیة الخمیس فلیستح احدکم ان تعرض علی نبیہ العمل القبح۔
تمہارے تمام اعمال ہر جمعرات کو عصر کے وقت رسول خدا کے پاس پیش ہوتے ہیں لہذا اس بات پر شرم کرو کہ تمہاری طرف سے کوئی برا عمل خدمت پیغمبر میں پیش ہو۔^(۲)

۳۔ نیز ایک اور روایت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ ایک شخص نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا میرے لئے اور میرے گھر والوں کے لئے دعا کیجئے۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو کیا میں دعا نہیں کرتا، واللہ ان اعمالکم لتعرض علی فی کل یوم و لیلة

(خدا کی قسم تمہارے اعمال ہر روز شب میرے سامنے پیش ہوتے ہیں)

راوی کہتا ہے کہ یہ بات مجھ پر گراں گذری، امام متوجہ ہوئے اور مجھ سے فرمایا:

اما تقرء لتاب الله عزو جل ” و قل اعملوا فسیری الله عملکم و رسولہ والمو منون هو و الله علی بن ابی طالب“۔

کیا تو نے اللہ کی کتاب نہیں پڑھی جو کہتی ہے۔ ”عمل کرو، خدا، اس کا رسول اور مومنین تمہارے عمل کو دیکھتے ہیں۔ خدا کی قسم مومنین سے مراد علی بن ابی طالب (اور ان کی اولاد میں سے دوسرے امام) ہیں۔ ۳۔
البتہ بعض روایات میں صرف رسول اللہ کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اور بعض میں پیغمبر اکرم اور تمام آئمہ کا ذکر ہے اسی طرح کچھ روایات صرف جمعرات کو عصر کے وقت اعمال پیش ہونے کے بارے میں ہیں، بعض میں ہر روز اعمال پیش ہونے کا تذکرہ ہے، کچھ میں ہفتہ میں دو مرتبہ، بعض میں ہر ماہ کے شروع میں اور بعض میں موت کے وقت اور قبر میں رکھے جانے کے وقت کا ذکر ہے۔

واضح ہے کہ یہ روایات آپس میں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ سب صحیح ہوں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے بہت سے اداکاروں میں ہر روز کی کارگزاری روزانہ، ہفتہ کی کارگزاری ہفتے کے آخر میں اور مہینے یا سال کی کارگزاری مہینے یا سال کے آخر میں اعلیٰ افسروں کو پیش کی جاتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیش آتا ہے کہ کیا خود زیر نظر آیت اور اس کی تفسیر میں وارد روایات سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے یا جیسا کہ اہل سنت کے مفسرین نے کہا ہے کہ آیت ایک عام مسئلے کی طرف اشارہ کر رہی ہے وہ یہ کہ انسان جو بھی عمل کرتا ہے چاہے نہ چاہے ظاہر ہو ہی جات ہے اور خدا کے علاوہ پیغمبر اور تمام مومنین عام طریقوں ہی سے اس سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں کہنا چاہیے کہ انصاف یہ ہے کہ خود آیت میں اس بارے میں کچھ شواہد موجود ہیں۔ پہلا یہ کہ آیت مطلق ہے اور اس میں تمام اعمال شامل ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ تمام اعمال معمول کے طریقوں سے رسول اللہ اور مومنین پر آشکار نہیں ہوتے تھے کیونکہ بہت سے غلط اعمال مذخفی طور پر انجام پاتے تھے اور اکثر اوقات پوشیدہ رہ جاتے تھے یہاں تک کہ بہت سے اچھے اعمال بھی اسی طرح چھپے رہتے تھے۔

اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ تمام نیک اعمال میں سے اکثر سب پر واضح ہو جاتے تھے تو یہ ایک بے ہودہ بات ہوگی۔ لہذا لوگوں کے اعمال سے رسول اللہ کی اور لوگوں کی آگاہی غیر معمولی طریقوں اور خدائی تعلیم ہی سے ہو سکتی ہے۔

دوسرا یہ کہ آیت کے آخر میں ”فینبئکم بما کنتم تعملون“ خدا تمہیں قیامت میں اس سے آگاہ کرے گا جو تم عمل کرتے تھے) اس میں شک نہیں کہ اس جملے کے مفہوم میں انسان کے تمام اعمال شامل ہیں چاہے وہ مخفی ہوں یا آشکار اور آیت کا ظاہر یہ ہے کہ آیت کی ابتداء اور آخر میں ”عمل“ کا ایک ہی مفہوم ہے لہذا آیت کی ابتداء میں آشکار و مخفی تمام اعمال کے بارے میں ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان تمام سے آگاہی معمول کے طریق سے ممکن نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں آیت کے کا آخری حصہ تمام اعمال کی جزا کے بارے میں ہے۔ اس لئے آغاز بھی خدا، رسول اور مومنین کی تمام اعمال سے آگاہی سے متعلق ہے۔ ایک آگاہی کا مرحلہ ہے اور دوسرا اجزاء کا اور بات دونوں میں ایک ہی موضوع سے متعلق ہے۔

تیسرا یہ کہ ”مومنین“ کا ذکر اسی صورت میں صحیح ہے کہ مراد سب اعمال ہوں اور غیر معمولی طریقوں سے معلوم ہوں۔ ورنہ جو اعمال آشکار اور واضح ہیں وہ تو مومنین اور غیر مومنین سب دیکھتے ہیں۔

یہاں سے ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں مومنین سے مراد سب صاحب ایمان افراد نہیں ہیں بلکہ ان میں سے کچھ مخصوص افراد ہیں جو حکم خدا سے اسرار غیبی سے آگاہ ہیں یعنی رسول اللہ کے حقیقی جانشین۔ ایک اہم نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہئیے یہ ہے کہ جس طرح پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اعمال کے پیش ہونے کا مسئلہ اس کے معتقدین کے لئے بہت زیادہ تربیتی اثر رکھتا ہے کیونکہ جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ خدا جو کہ ہر جگہ میرے ساتھ ہے اس کے علاوہ پیغمبر اکرم اور ہمارے محبوب پیشوا ہر روز یا ہر ہفتے میرے ہر عمل سے چاہے وہ اچھا ہو یا برا آگاہ ہو جاتے ہیں تو بلاشبہ ہم زیادہ احتیاط کریں گے اور اپنے اعمال کی طرف متوجہ رہیں گے بالکل اسی طرح جیسے کسی ادارے میں کام کرنے والوں کو معلوم ہو کہ ہر روز ہر ہفتے ان کے تمام پوری تفصیل سے اعلیٰ افسروں کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں اور وہ ان سب سے باخبر ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے کاموں کو بڑی توجہ سے انجام دیں گے۔

۲۔ کیا رویت یہاں دیکھنے کے معنی میں ہے؟ بعض مفسرین میں مشہور ہے کہ ”فسیری اللہ عملکم“ میں رویت معرفت کے معنی میں ہے نہ کہ علم کے معنی میں کیونکہ اس کا ایک سے زیادہ مفعول نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ اگر رویت علم کے معنی میں ہو تو اس کے دو مفعول چاہئیے ہوں گے۔

لیکن اس میں کوئی حرج نہیں کہ رویت کو اس کے اصل معنی میں لیا جائے یعنی محسوسات کا مشاہدہ نہ کہ علم یا معرفت۔ یہ بات خدا کے بارے میں تو جو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور تمام محسوسات پر احاطہ رکھتا ہے قابل، بحث نہیں

لیکن پیغمبر اور آئمہ علیہم السلام کے متعلق بھی کوئی مانع نہیں کہ وہ خود اعمال کو دیکھیں کہ جب ان کے سامنے پیش ہوں کوینکہ ہم جانتے ہیں کہ انسانی املا فانی نہیں ہیں بلکہ قیامت تک باقی رہیں گے۔

۳۔ عنقریب خدا اعمال دیکھے گا“ سے کیا مراد ہے: اس میں شک نہیں کہ خدا اعمال سے پہلے ہیں ان سے آگاہ ہے اور یہ جو آیت میں ”فسیری اللہ“ یعنی عنقریب تمہارے اعمال دیکھے گا“ آیا ہے، یہ اعمال کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے جو ان کے وجود اور تحقیق کے بعد ہوگی۔

۱ اصول کافی جلد ۱ ص ۱۷۱ (باب عرض الاعمال)

۲۔ تفسیر برہان جلد ۲ ص ۱۵۸۔

۳۔ اصول کافی جلد ۱ ص ۱۷۱ (باب عرض الاعمال)۔

آیت ۱۰۶

۱۰۶۔ ﴿وَأَخْرُونَ مُرْجُونَ لِأَمْرِ اللَّهِ إِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَإِمَّا يَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾۔

ترجمہ

۱۰۶۔ ایک اور گروہ فرمان خدا سے نکل گیا۔ وہ تو انھیں سزا دے گا اور یا ان کی توبہ قبول کر لے گا (جس کے وہ لائق ہوں گے) خدا دانا اور حکیم ہے۔

شان نزول

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ مندرجہ بالا آیت جنگ تبوک سے واپس رہ جانے والے تین اشخاص ہلال بن امیہ، مرارہ بن ربیع اور کعب بن مالک کے بارے میں ہے۔ کہ جن کی پشیمانی کی تشریح اور توبہ کی کیفیت اسی سورہ کی آیہ ۱۱۸ کے ذیل میں آئے گی۔

کچھ اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت بعض کفار کے بارے میں ہے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف مختلف جنگوں میں عظیم شخصیتوں مثلاً سید الشہداء حضرت حمزہ اور ایسے دیگر افراد کو شہید کیا تھا۔ اس کے بعد وہ شرک سے دستبردار ہو گئے اور دین اسلام کی طرف آ گئے۔

تفسیر

اس آیت میں ایک اور گنہگار کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ان لوگوں کا انجام صحیح طور پر واضح نہیں ہے نہ تو وہ ایسے ہیں کہ رحمت الہی کے مستحق سمجھے جائیں اور نہ ایسے ہیں کہ ان کی بخشش سے بالکل مایوس ہو جائے لہذا قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے: ایک اور گروہ کا معاملہ فرمان خدا پر موقوف ہے یا وہ انھیں سزا دے گا اور یا ان کی توبہ قبول کر لے گا ﴿وَأَخْرُونَ مُرْجُونَ لِأَمْرِ اللَّهِ إِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَإِمَّا يَتُوبُ عَلَيْهِمْ﴾۔

”مرجون“ کا مادہ ”ارجاء“ سے ہے۔ یہ تاخیر اور توقف کے معنی میں ہے۔ اصل میں یہ ”رجاء“ سے لیا گیا ہے۔ جس کا معنی امید ہے۔ اس لحاظ سے کہ بعض اوقات انسان کسی کام کو کسی ہدف کے ماتحت تاخیر میں ڈال دیتا ہے یہ لفظ تاخیر کے معنی میں آیا ہے لیکن ایسی تاخیر جس میں امید شامل ہو۔

حقیقت میں یہ لوگ نہ تو ایسے پاک مضبوط ایمان اور نیک اعمال کے مالک ہیں کہ انھیں سعادت مند اور اہل نجات سمجھا جاسکے اور نہ ہی ایسے آلودہ اور منحرف ہیں کہ ان کے رخ پر سرخ خط کھینچ دی اجائے اور انھیں بد بخت سمجھ لیا جائے یہاں تک کہ (ان کے روحانی مقام و مرتبہ کے مطابق) لطفِ الہی ان کے بارے میں فیصلہ کرے گا۔

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے کہ خدا ان کے ساتھ حساب کتاب کے بغیر کوئی سلوک نہیں کرے گا۔ بلکہ علم و حکمت کے تقاضے کے مطابق ہی ان سے سلوک کرے گا کیونکہ ”خدا علیم و حکیم ہے“ ﴿وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ﴾۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے اس کے بارے میں مفسرین نے بہت کم ہی کہیں جامع بحث کی ہے سوال یہ ہے کہ اس گروہ میں اور اس گروہ میں جس کی حالت اسی سورہ کی آیہ ۱۰۲ میں گزر چکی ہے کیا فرق ہے دونوں گروہ گنہ گار تھے اور دونوں نے اپنے گناہ سے توبہ کی۔ پہلے گروہ نے اپنے گناہ کا اعتراف کر کے پشیمانی کا اظہار کیا اور دوسرے گروہ کے بارے میں ”امایتوب علیہم“ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بھی توبہ کی۔ اسی طرح دونوں گروہ رحمت الہی کی توقع رکھتے تھے۔ اور دونوں خوف و رجاء کے درمیان تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم دو طریقوں سے ان دونوں گروہوں میں فرق کر سکتے ہیں۔

۱۔ پہلے گروہ نے فوراً توبہ کی اور کھلے بندوں پشیمانی کی علامت کے طور پر آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دیا جیسے ابو لبابہ کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ انھوں نے اپنی ندامت کا اظہار صراحت کے ساتھ کیا اور ربی اور مالی طور پر ہر قسم کی تلافی کے لئے اپنی آمدگی ظاہر کر دی۔

جبکہ دوسرے گروہ کے افراد ایسے تھے جنھوں نے اپنی پشیمانی کی ابتداء میں اپنی کیفیت ظاہر نہیں کی اگرچہ وہ دل میں پشیمان ہوئے تھے اور انھوں نے گزشتہ کی تلافی کے لئے اپنی آمدگی کا اظہار نہیں کیا۔ حقیقت میں وہ چاہتے تھے کہ سادگی اور آسانی سے اپنے گناہوں سے گزر جائیں۔ ان کی واضح مثال وہ تین افراد تھے جن کی طرف سطور بالا میں اشارہ ہوا ہے۔ ان کی حالت کی وضاحت عنقریب آئے گی یہ لوگ خوف و رجاء کے درمیان تھے لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ نے حکم دیا کہ لوگ ان سے علیحدہ رہیں اور ان سے روابط منقطع رکھیں۔، اس طرح وہ معاشرے کے شدید دباؤ کا شکار تھے اور آخر کار وہ مجبور ہوئے کہ پہلے گروہ کا سارا ستہ اختیار کریں۔

ایسے اشخاص کی توبہ کی قبولیت کا اعلان چونکہ آیت نازل ہونے کی صورت میں ہوا لہذا پیغمبر اکرم اس مدت تک وحی کے انتظار میں تھے یہاں تک کہ پچاس دنوں میں یا اس سے کم مدت میں ان کی توبہ قبول ہوئی اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے گمراہ کے بارے میں جب تک انھوں نے اپنی روش کو تبدیل نہیں کیا ”واسلہ علیم حکیم“ کا جملہ آیا ہے۔ کہ جس میں توبہ قبول ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔

البتہ باعث تعجب نہیں کہ بڑے بڑے گناہوں کے بارے میں خصوصاً غزول آیات کے زمانے میں صرف ندامت و پشیمانی توبہ قبول ہونے کے لئے کافی نہ ہو۔ بلکہ تلافی کے لئے اقدام، واضح طور پر گناہ کا اعتراف اور اس کے بعد آیت کا نزول توبہ قبول ہونے کے لئے شرط ہو۔

۲۔ دوسرا فرق جو ممکن ہے دونوں گروہوں کے درمیان ہو یہ ہے کہ پہلے گمراہ نے اگرچہ ایک عظیم اسلامی فریضہ یعنی جہاد سے تخلف کیا تھا یا بعض جنگی اسرار دشمن کو بتائے تھے تاہم ان کے ساتھ سید الشہداء حمزہ کے قتل جیسے عظیم گناہوں سے آلودہ نہ تھے اس لئے ان کی توبہ اور تلافی کے لئے آمادگی کے بعد خدا تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی لیکن جناب حمزہ کا قتل ایسا گناہ نہ تھا ج سکی تلافی ہو سکے۔ اس لئے اس گمراہ کی نجات حکم خدا سے وابستہ تھی کہ وہ انھیں اپنی عفو بخشش سے نوازتا ہے یا انھیں سزا اور عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔

بہر حال پہلا جواب آیت کی شان نزول کے بارے میں مروی ان روایات سے مطابقت رکھتا ہے جو محل بحث آیت کو جنگ تبوک سے متخلف تین افراد کے ساتھ ربط رکھتی ہیں دوسرا جواب ان روایات سے موافقت رکھتا ہے جو طرق اہل بیت سے پہنچی ہیں اور جن میں ہے کہ یہ آیت حمزہ، جعفر اور اس قسم کے دیگر افراد کے بارے میں ہے۔ ۱

اگر صحیح غور و فکر کیا جائے تو یہ دونوں جوابات ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ آیت کی تفسیر میں دونوں ہی مراد ہوں۔

۱۔ ان روایات کو جاننے کے لئے تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۲۶۵ اور تفسیر برہان جلد ۲ ص ۱۰۶ کی طرف رجوع فرمائیں۔

آیات ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰

۱۰۷۔ ﴿وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِزْوَاجًا لِمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلُقَنَّ
إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ﴾۔

۱۰۸۔ ﴿لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا لِمَسْجِدٍ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُمْ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَّخِذُوا
وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ﴾۔

۱۰۹۔ ﴿أَفَمَنْ أُسِّسَ بُنْيَانُهُ عَلَى تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَمْ مَنْ أُسِّسَ بُنْيَانُهُ عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي
نَارٍ جَهَنَّمَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾۔

۱۱۰۔ ﴿لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾۔

ترجمہ

۱۰۷۔ (مزید بر آں) وہ لوگ ہیں جنہوں نے (مسلمانوں کو) نقصان پہنچائے اور کفر (کو تقویت دینے) کے لئے اور
مومنین میں تفرقہ ڈالنے کی خاطر ایسے افراد کے لئے کمین گاہ مہیا کرنے کے جنہوں نے پہلے ہی اللہ اور اس کے رسول
کے ساتھ جنگ کی ہے، مسجد بنائی ہے وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہمارا مقصد سوائے نیکی (اور خدمت) کے اور کچھ نہیں لیکن
خدا گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

۱۰۸۔ اس میں ہرگز قیام (اور عبادت) نہ کرنا۔ وہ مسجد جو روز اول سے تقویٰ کی بنیاد پر بنی ہے زیادہ حق رکھتی ہے کہ
تم اس میں قیام (اور عبادت) کرو۔ اس میں ایسے مرد ہیں جو پاک اور پاکیزہ رہنا پسند کرتے ہیں اور خدا پاک رہنے والوں
کو دوست رکھتا ہے۔

۱۰۹۔ کیا وہ شخص جس نے اس کی بنیاد تقویٰ الہی اور اس کی خوشنودی پر رکھی ہے بہتر ہے یا وہ شخص جو نے اس کی
بنیاد کرنے والی کمزور جگہ پر رکھی ہے کہ جو اچانک جہنم کی آگ میں گر جائے گی اور خدا کی ظالم گروہ کو ہدایت نہیں کرتا۔
۱۱۰۔ (لیکن) یہ بنیاد جو انہوں نے رکھی ہے، اس کے دلوں میں ہمیشہ شک اور تردد کے ذریعے کے طور پر باقی رہے
گی۔ مگر یہ کہ ان کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں (اور وہ مرجائیں ورنہ چیز ان کے دلوں سے نہیں نکلے گی) اور خدا دانا و
حکیم۔

شان نزول

زیر نظر آیات منافقین کے ایک گروہ کے بارے میں ہیں۔ جنہوں نے اپنی منحوس سازشوں کی تکمیل کے لئے مدینہ میں ایک مسجد قائم کی تھی جو بعد میں ”مسجد ضرار“ کے نام سے مشہورہ وئی۔ یہ بات تمام اسلامی مفسرین اور بہت سی کتب حدیث و تاریخ نے ذکر کی ہے، اگرچہ اس کی تفصیلات میں کچھ فرق نظر آتا ہے۔ مختلف تفاسیر اور احادیث سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کے پیش نظر اس واقعہ کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:

کچھ منافقین رسول اللہ کے پاس آئے عرض کی: ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم قبیلہ بنی سالم کے درمیان، مسجد قبا کے قریب ایک مسجد بنالیں تاکہ ناتواں، بیمار اور بوڑھے جو کوئی کام نہیں کر سکتے اس میں نماز پڑھ لیا کریں۔ اسی طرح راتوں میں بارش ہوتی ہے ان میں جو لوگ آپ کی مسجد میں نہیں آسکتے اپنے اسلامی فریضہ کو اس میں انجام دے لیا کریں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب پیغمبر خدا جنگ تبوک کا عزم کر چکے تھے آنحضرت نے انہیں اجازت دے لیا کریں۔ انہوں نے مزید کہا: کیا یہ بھی ممکن ہے کہ آپ خود آکر اس میں نماز پڑھیں؟ بنی اکرم نے فرمایا: اس وقت تو میں سفر کا ارادہ کر چکا ہوں البتہ واپسی پر خدا نے چاہا تو اس مسجد میں آکر نماز پڑھوں گا۔

جب آپ جنگ تبوک سے لوٹے تو یہ لوگ آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے: ہماری درخواست ہے کہ آپ ہماری مسجد میں آکر نماز پڑھائیں اور خدا سے دعا کریں ہمیں برکت دے۔

یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب ابھی آنحضرت مدینہ کے دروازے میں داخل نہیں ہوئے تھے اس وقت وحی خدا کا حامل فرشتہ نازل ہوا اور مندرجہ بالا آیات لایا اور ان کے کروت سے پردہ اٹھایا۔

اس کے فوراً بعد رسول اللہ نے حکم دیا کہ مذکورہ مسجد کو جلا دیا جائے اور اس کے باقی حصے کو مسمار کر دیا جائے اور اس کی جگہ کوڑا کرکٹ ڈال جایا کرے۔

ان لوگوں کے ظاہر اکام کو دیکھا جائے تو ہمیں شروع میں تو اس حکم پر حیرت ہو گئی کہ کیا بیماروں اور بوڑھوں کی سہولت کے لئے اور اضطراری مواقع کے لئے مسجد بنانا برا کام ہے جبکہ یہ ایک دینی اور انسانی خدمت معلوم ہوتی ہے کیا ایسے کام کے بارے میں یہ حکم صادر ہوا ہے؟ لیکن اگر ہم اس معاملہ کی حقیقت پر نظر کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ حکم کس قدر بر محل و چا تلا تھا۔

اس کی وضاحت یہ کہ ابو عامر نامی ایک شخص نے عیسائیت قبول کر لی تھی اور راہبوں کے مسلک سے منسلک ہو گیا تھا۔ اس کا شمار عابدوں اور زاہدوں میں ہوتا تھا۔ قبیلہ خزرج میں اس کا گہرا رسوخ تھا۔ رسول اللہ نے جب مدینہ کی طرف ہجرت کی اور مسلمان آپ کے گرد جمع ہو گئے تو با و عامر جو خود کبھی پیغمبر کے ظہور کے خبر دینے والوں میں سے تھا نے دیکھا کہ اس کے گرد اگر دسے لوگ چھٹ گے ہیں اس پر وہ اسلام کے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مدینہ سے نکلا اور کفار کے پاس پہنچا اس نے ان سے پیغمبر اکرم کے خلاف جنگ کے لئے مدد چاہی اور قبائل عرب کو بھی تعاون کی دعوت دی۔ وہ خود مسلمانوں کے خلاف جنگ اہد کی منصوبہ بندی میں شریک رہا تھا اور راہنمائی کرنے والوں میں سے تھا۔ اس نے حکم دیا کہ لشکر کی دو صفوں کے درمیان گڑھے کھودے جائیں۔ اتفاقاً پیغمبر اسلام ایک گڑھے میں گر پڑے، آپ کی پیشانی پر زخم آئے اور دندان مبارک ٹوٹ گئے۔

جنگ احد ختم ہوئی، مسلمانوں کو اس میدان میں آنے والی مشکلات کے باوجود اسلام کی آواز بلند تر ہوئی اور ہر طرف صدائے اسلام گونجنے لگی۔ تو مدینہ سے بھاگ گیا اور بادشاہ روم ہرقل کے پاس پہنچا تا کہ اس سے مدد چاہے اور مسلمانوں کی سرکوبی کے لئے ایک لشکر مہیا کرے۔

اس نکتے کا بھی ذکر ضروری ہے کہ ان کی ان کارستانیوں کی وجہ سے پیغمبر اسلام نے اسے ”فاسق“ کا لقب دے رکھا تھا۔

بعض کہتے ہیں کہ موت نے اسے مہلت نہ دی کہ اپنی آرزو ہرقل سے کہتا لیکن بعض دوسری کتب میں ہے کہ وہ ہرقل سے جا کر ملا اور اس کے وعدوں سے مطمئن اور خوش ہوا۔

بہر حال اس نے مرنے سے پہلے مدینہ کے منافقین کو ایک خط لکھا اور انھیں خوشخبری دی کہ روم کے ایک لشکر کے ساتھ وہ ان کی مدد کو آئے گا۔ اس نے انھیں خصوصی تاکید کی کہ وہ اس کے لئے ایک مرکز بنائیں تاکہ اس کے آئندہ کی گزاریوں کے لئے وہ کام دے سکے لیکن ایسا مرکز چونکہ مدینہ میں اسلام دشمنوں کی طرف سے اپنے نام پر قائم کرنا عملی طور پر ممکن نہ تھا۔ لہذا منافقین نے مناسب یہ سمجھا کہ مسجد کے نام پر بیماروں اور معذروں کی مدد کی صورت میں اپنے پروگرام کو عملی شکل دیں۔

آخر کار مسجد تعمیر ہو گئی یہاں تک کہ مسلمانوں میں سے مجمع بن حارثہ (یا مجمع جاریہ) نامی ایک قرآن فہم نوجوان کو مسجد کی امامت کے لئے بھی چن لیا گیا لیکن وحی الہی نے ان کے کام سے پردہ اٹھا دیا۔

یہ جو پیغمبر اکرم نے جنگ تبوک کی طرف جانے سے قبل ان کے خلاف سخت کارروائی کا حکم نہیں دیا اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ایک تو ان کی حقیقت زیادہ واضح ہو جائے اور دوسرا یہ کہ تبوک کے سفر میں اس طرف سے کوئی اور ذہنی پریشانی نہ ہو۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا رسول اللہ نے نہ صرف یہ کہ مسجد میں نماز پڑھی بلکہ بعض مسلمانوں (مالک بن خشم، معنی بن عدی اور عامر بن سکریا عاصم بن عدی) کو حکم دیا کہ مسجد کو جلا دیں اور پھر اس کی دیواروں کو مسمار کروادیا۔ اور آخر کار اسے کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ قرار دے دیا۔ ۱

۱۔ مجمع البیان، تفسیر ابو الفتوح رازی، تفسیر المنار، تفسیر المیزان، تفسیر نور الثقلین اور دیگر کتب۔

مسجد کے روپ میں بت خانہ

گذشتہ آیات میں مختلف مخالف گروہوں کی کیفیت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ زیر بحث آیات ایک اور گروہ کا تعارف کرواتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے ماہرانہ منصوبہ اور سازشوں کے تحت میدان میں داخل ہوئے اللہ کی رحمت مسلمانوں کے شامل حال ہوئی اور ان کا یہ منصوبہ اور سازش نقش بر آب ہو گئی۔

پہلی آیت میں قرآن کہتا ہے: ان میں سے ایک گروہ نے مدینہ میں ایک مسجد بنائی۔ مسجد کے مقدس نام کے پیچھے انھوں نے اپنے منحوس مقاصد چھپا رکھے تھے (وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا)۔ ۲

۲۔ مفسرین نے اس جملے کی ترکیب کے سلسلے میں اگرچہ ادبی لحاظ سے مختلف نظریات پیش کئے ہیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ گذشتہ جملوں پر عطف ہے جو منافقین کے بارے میں ہیں اور اس کی تقدیر یہ ہے ”منھم الذین اتخذوا مسجداً“۔ اس کے بعد ان کے چار طرح کے مقاصد کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے:

۱۔ ایک مقصد ان کا یہ تھا کہ اس طرح سے مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں (ضِرَارًا)۔ ”ضرار“ کا معنی ہے ”جان بوجھ کر نقصان پہنچانا“۔ دعویٰ تو یہ کرتے تھے کہ ان کا مقصد مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ ہے اور وہ بیمار اور ناتواں لوگوں کو مدد کرنا چاہتے ہیں۔ درحقیقت وہ اس کے برعکس اپنے کاموں سے پیغمبر اسلام کا خاتمہ اور مسلمانوں کی سرکوبی چاہتے تھے یہاں تک کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو اسلام ہی کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے۔

۲۔ دوسرا مقصد ان کا کفر کی بنیادوں کو تقویت پہنچانا تھا۔ وہ ان لوگوں کو اسلام سے پہلے کی سسی حالت پر پلٹا دینا چاہتے تھے۔ (وَكُفْرًا)۔

۳۔ وہ مسلمانوں میں صف میں تفرقہ ڈالنا چاہتے تھے کیونکہ اس مسجد میں کچھ لوگ جمع ہونے لگتے تو اس سے مسجد قبا جو اس کے نزدیک تھی یا مسجد نبوی جو اس سے کچھ فاصلے پر تھی، کی رونق ختم ہو جاتی (وَتَقْرِيفًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ)۔

جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے، اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کے درمیان فاصلہ اتنا کم نہیں ہونا چاہیے کہ دوسری مسجد کے اجتماع پر اثر انداز ہو۔ اس بناء پر وہ لوگ جو قومی تعصب یا ذاتی اغراض کی بنیاد پر مسجد کے پاس ایک مسجد بنالیتے ہیں، اوریوں مسلمانوں کے اجتماعات کے منتشر کرتے ہیں اور ان کے اس اقدام سے دوسری مساجد کی صفیں خالی، بے رونق اور بے روح ہو جاتی ہیں وہ اہداف اسلامی کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

۴۔ ان کا آخری مقصد یہ تھا کہ ایسے شخص کے لئے ایک مرکز قائم کریں جو پہلے سے خدا اور اس کے رسول کے خلاف برسرِ پیکار تھا اور اس کے سابقہ برے کارنامے لوگوں پر واضح تھے اور وہ اس مرکز سے اپنے منصوبوں کی تکمیل چاہتا تھا ﴿وَإِصْدَآءًا لِّمَنۢ حَارَبَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ مِنْ قَبْلُ﴾۔

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ان تمام برے اغراض اور منحوس مقاصد کو انھوں نے ایک خوب صورت اور پر فریب لباس میں چھپا رکھا تھا۔ یہاں تک کہ وہ قسم کھاتے تھے کہ ہمارا نیکی کرنے کے علاوہ اور کوئی مقصد اور ارادہ نہیں ﴿وَلَيَخْلُقَنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰی﴾۔

منافقین کا ہر دور اور زمانے میں یہی دستور رہا ہے وہ اپنے مقاصد کو خوشنما پردوں میں چھپائے رکھتے ہیں اور عام لوگوں کو منحرف کرنے کے لئے طرح طرح کی قسموں کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن قرآن مزید کہتا ہے: وہ خدا جو سب کے اندرونی رازوں سے واقف ہے اور جس کے لئے غیب و شہود یکساں ہے، گواہی دیتا ہے کہ یقیناً وہ جھوٹے ہیں ﴿وَاللّٰہُ یَشْہَدُ اِنَّہُمْ لَکَاذِبُوْنَ﴾۔

اس جملے میں ان کے مختلف تاکیدیں نظر آتی ہیں:

پہلی یہ کہ یہ جملہ اسمیہ ہے۔

دوسری یہ کہ لفظ ”ان“ تاکید کے لئے۔

تیسری یہ کہ ”لکاذبون“ میں لام ابتداء اور تاکید کے لئے۔

چوتھی یہ کہ فعل ماضی کی جگہ ”کاذبون“ کا آنا ان کے جھوٹ بولنے کے استمرار اور دوام کی دلیل ہے۔

اس طرح سے خدا تعالیٰ ان کی بڑی بڑی قسموں کا شدید ترین طریقے سے تکذیب کرتا ہے۔

بعد والی آیت میں اس حیات بخش حکم کی مزید تاکید کے لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے: اس مسجد میں ہرگز قیام نہ کرو اور اس

میں نماز نہ پڑھو ﴿لَا تَقُومُ فِیْہِ اَبَدًا﴾۔

بلکہ اس مسجد کی بجائے زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس مسجد میں عبادت قائم کرو جس کی بنیاد پہلے تقویٰ پر رکھی گئی ہے

﴿لَمَسْجِدُ اُسِّسَ عَلٰی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُومَ فِیْہِ﴾۔ نہ یہ کہ یہ مسجد جس کی بنیاد روز اول ہی سے کفر، نفاق،

بے دینی اور تفرقہ پر رکھی گئی ہے۔

لفظ ”احق“ (یعنی زیادہ مناسب اور سزاوار) اگرچہ افضل التفضیل ہے لیکن یہاں لیاقت اور اہلیت کے لئے دو چیزوں کے درمیان موازنہ کے معنی میں نہیں آیا بلکہ مناسب، لیاقت اور عدم لیاقت کے موازنہ کے لئے آیا ہے۔ قرآنی آیات، احادیث اور روزمرہ میں ایسی گفتگوؤں کے بہت سے نمونے موجود ہیں۔ مثلاً بعض اوقات ناپاک اور برے آدمی سے ہم کہتے ہیں کہ پاکیزگی اور اچھا کام کرنا تیرے لئے بہتر ہے اس بات کا یہ معنی نہیں کہ ناپاک رہنا اور برکام کرنا اچھا ہے لیکن بری چیز)۔

مفسرین نے کہا ہے کہ جس مسجد کے بارے میں مندرجہ بالا جملے میں کہا گیا ہے کہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ پیغمبر اس میں نماز پڑھیں اس سے مراد مسجد قبا ہے کہ جس کے قریب منافقین نے مسجد ضرار بنائی تھی۔

البتہ یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے مراد مسجد نبوی یا وہ تمام مساجد ہوں کہ جن کی بنیاد تقویٰ پر ہو لیکن ”اول یوم“ (روز اول) کی تعبیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ مسجد قبا پہلی مسجد تھی جو مدینہ میں بنائی گئی۔ (کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۱۰۷)۔

پہلا احتمال ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اگرچہ دوسری مساجد مثلاً مسجد نبوی کے لئے بھی یہ لفظ مناسب ہے۔ اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ علاوہ اس کے کہ اس مسجد کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے، مردوں کا ایک گروہ اس میں مشغول عبادت ہے جو پسند کرتا ہے کہ اپنے آپ کو پاکیزہ رکھے اور خدا پاکزاد لوگوں کو دوست رکھتا ہے ﴿فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهَّرِينَ﴾۔

اس سلسلے میں اس پاکیزگی سے مراد ظاہری اور جسمانی پاکیزگی ہے یا معنوی اور باطنی پاکیزگی، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ تفسیر تبیان اور مجمع البیان میں اس آیت کے ذیل، میں رسول اللہ سے ایک روایت نقل ہوئی ہے جس میں ہے کہ آپ نے مسجد قبا والوں سے فرمایا: مَاذَا تَفْعَلُونَ فِي طَهْرِكُمْ فَإِنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَدْ أَحْسَنَ عَلَيْكُمْ الشَّاءَ ، قَالَوا الْغَسْلُ أَثَرُ الْغَائِطِ

تم اپنے آپ کو پاک کرتے وقت کیا کام انجام دیتے ہو کہ خدا نے تمہاری اس طرح سے مدح و ثناء کی ہے۔ انھوں نے کہا: ہم اپنے پائخانہ کے اثر کو پانی سے دھوتے ہیں۔

اسی مضمون کی روایات امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہیں لیکن جیسا کہ ہم نے بارہا اشارہ کیا ہے ایسے مصداق کے لئے اس قسم کی روایات مفہوم آیت کو منحصر کرنے کے لئے نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ آیت کا ظہور مطلق ہے

اور یہ گواہی دیتا ہے کہ طہارت یہاں ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے اس میں شرک و گناہ کے آثار سے روح کی پاکیزگی اور جسمانی کثافتوں کے آثار سے جسم کی پاکیزگی سب شامل ہیں۔

زیر بحث تیسری آیت میں دو گروہوں کے مابین موازنہ کیا گیا ہے ایک گروہ مومنین کا ہے جو مسجد قبا کی طرح کو مساجد کو تقویٰ کی بنیاد پر بناتے ہیں اور دوسرا گروہ منافقین کا ہے جو مسجد کو کفر و نفاق اور تفرقہ و فساد کی اساس پر تعمیر کرتے ہیں

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا وہ شخص جس نے مسجد کی بنیاد تقویٰ، حکم الہی کی مخالفت سے پرہیز اور اس کی رضا طلب کرتے ہوئے رکھی ہے بہتر یا وہ شخص جس نے اس کی بنیاد کمزور اور گرجانے والی جگہ پر جہنم کے کنارے رکھی ہے جو عنقریب جہنم میں گرجانے لگی ﴿أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ حَيِّزٍ أَمْ مَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارٍ جَهَنَّمَ﴾۔

”بنیان“ مصدر ہے اور اسم مفعول کے معنی میں ہے یعنی بنیاد اور عمارت۔

”شفا“ کسی چیز کے کنارے یا کنارہ کو کہتے ہیں۔

”حرف“ نہر یا کنوئیں کا وہ حاشیہ اور کنارہ ہے جس کے نچلے حصے کو پانی نے خالی کر دیا ہو۔

”ہار“ اس کمزور شخص یا کمزور عمارت کو کہتے ہیں جو گر رہی ہو۔

مندرجہ بالا تشبیہ منافقین کے کام کی بے ثباتی اور کمزوری کو اور اہل ایمان کے کام اور لائحہ عمل کے استحکام اور بقا کو روشن اور واضح کر رہی ہے۔

مومن کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک عمارت بنانے کے لئے بڑی مضبوط زمین منتخب کرے اور اس کی بنیاد بھی مضبوط اور قابل اطمینان مصالح سے رکھے۔

دوسری طرف مناطق کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنی عمارت دریا کے کنارے ایسی جگہ بنائے جس کے نچلے حصہ کی مٹی سیلاب بہا لے گیا ہو اور جو ہر وقت گرنے کو تیار ہو۔ نفاق کی بھی یہی صورت ہے اس کا بھی ظاہر ہے اور باطن کچھ نہیں اسی طرح اس عمارت کا بھی ظاہر ہے لیکن جس کی کوئی اساس نہیں یہ عمارت کسی بھی وقت گر سکتی ہے۔ اہل نفاق کا مکتب و مذہب بھی اپنے کھلے باطن کے باعث کسی بھی وقت تباہی اور رسوائی کے انجام کو پہنچ سکتا ہے۔

پرہیز گاریا اور رضائے الہی کو طلب کرنا یعنی حقیقت سے ہم آہنگ ہونا، جہاں خلقت اور اسرار حیات سے ہم قدم ہونا بلاشبہ بقاء اور ثبات کا عامل ہے۔ لیکن نفاق یعنی حقائق سے بے گانگی اور قوانین فطرت سے بغاوت بلاشبہ زوال اور فنا کا عامل ہے۔

منافقین چونکہ اپنے آپ سے بھی ظلم کرتے ہیں اور معاشرے سے بھی لہذا آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، خدا ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔ ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾۔

جیسا کہ ہم نے برہا کہا ہے، ہدایت خداوندی یعنی مقصد تک پہنچنے کے لئے مقدمات کی فراہمی صرف ان کے لئے ہے

جو اس کا استحقاق اور اہلیت رکھتے ہیں۔ لیکن وہ ظالم جن میں یہ اہلیت نہیں ہے یہ لطف و کرم ہرگز ان کے شامل حال نہیں ہوتا کیونکہ خدا حکیم ہے اور اس کی مشیت حساب و کتاب پر مبنی ہے۔

زیر نظر آخری آیت میں منافقین کی ہٹ دھرمی ڈھٹائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ اس طرح اپنے کام میں ہٹ دھرم ہیں اور نفاق و کفر کی تاریکی میں اس طرح سے سرگرداں ہیں کہ جو عمارت وہ خود کھڑی کرتے ہیں وہ شک و تردد کے عامل کے طور پر یا شک و تردد کے نتیجے کے طور پر ان کے دلوں میں باقی رہ جاتی ہے مگر یہ کہ ان کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور وہ موت کی آغوش میں چلے جائیں ﴿لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ﴾۔

وہ ہمیشہ حیرت و سرگردانی کے عالم میں زندگی بسر کرتے ہیں اور یہ مرکز نفاق اور مسجد ضرار جو انھوں نے بنا تھی ایک ہٹ دھرمی اور تردد کے عامل کی صورت میں ان کی روح میں اسی طرح باقی تھی۔ اگرچہ رسول اللہ نے عمارت کو جلودیا تھا اور مسمار کروادیا تھا؛ لیکن ایسے تھا جیسے اس کا نقش ان کے شک زدہ دل سے کبھی زائل نہ ہوگا۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اور خدا دانا و حکیم ہے ﴿وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾۔

خدا تعالیٰ نے اگر رسول اللہ کو ان کے خلاف اقدام کا حکم دیا اور ان کی ایسی عمارت کو مسمار کرنے کے لئے کہا کہ جو ظاہر حق کے لئے تھی تو یہ اس لئے تھا کہ وہ بنانے والوں کی بری نیتوں سے، بدباطنی اور اس عمارت کی حقیقت سے آگاہ تھا۔۔۔ یہ حکم عین حکمت و مصلحت کے مطابق تھا اس کا مقصد اسلامی معاشرے کی بھلائی اور درستی تھا۔ یہ نہیں کہ یہ کوئی جلد بازی کا فیصلہ تھا اور نہ ہی یہ غیض و غضب کا نتیجہ تھا۔

چند اہم نکات

۱۔ عظیم درس:

مسجد ضرار کا واقعہ تمام مسلمانوں کے لئے پوری زندگی میں ایک درس ہے۔ کلامِ خدا اور عملِ رسول واضح طور پر نشان دہی کرتا ہے کہ مسلمانوں کو کبھی بھی ایسا ظاہر بین بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ صرف ظاہری طور پر کاموں کے حق بجانب ہونے پر نظر رکھیں اور ان کے اصلی اغراض و مقاصد سے بے خبر اور لاتعلق رہیں۔ مسلمان وہ ہے جو نفاق اور منافق کو ہر وقت، ہر جگہ، ہر لباس میں اور چہرے میں پہچان لے۔ اگرچہ دین و مذہب کے چہرے اور قرآن مسجد کی حمایت کے لباس ہی میں کیوں نہ ہو۔

مذہب سے مذہب کے خلاف فائدہ اٹھانا کوئی نئی چیز نہیں۔ استعمار گروں، جابر حکمرانوں اور منافقوں کے طور طریقے ہمیشہ ہر معاشرے میں یہی رہے ہیں۔ اگر لوگ کسی خاص مطلب کی طرف جھاو رکھتے ہیں تو وہ پہلے انھیں تو وہ پہلے انھیں اسی جھاو سے غافل کرتے ہیں اور پھر اپنے استعماری مقاصد بروئے کار لاتے ہیں یہاں تک کہ وہ مذہب کے خلاف مذہب ہی کی قوت سے مدد لیتے ہیں۔

اصولی طور پر جعلی پیغمبروں اور باطل مذاہب گھڑنے کا یہی فلسفہ تھا کہ اس راستے سے لوگوں کے مذہبی جھکاؤ اور میلان کو اپنی پسند کی راہ پر ڈال دیا جائے۔

واضح رہے کہ مدینہ کے ماحول میں، وہ بھی رسول اللہ کے زمانے میں جب اسلام اور قرآن لوگوں میں بہت زیادہ نفوذ کر چکا تھا، اسلام کے خلاف کھلے بندوں جنگ ممکن نہ تھی بلکہ ضروری تھا کہ بے دینی کو دین کے پیکٹ میں پیش کیا جائے اور باطل کو حق لباس پہنا کر لایا جائے تاکہ سادہ دل لوگوں کو کھینچا جاسکے اور یوں برے مقاصد کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔ لیکن سچا مسلمان وہ نہیں جو ایسا سطحی اور سادہ ہو کہ ایسے ظواہر سے دھوکا کھالے۔ اسے چاہیئے کہ ایسے کاموں کے عوامل، ان کے پیچھے کار فرمایا تھوں اور دوسرے قرائن کو سامنے رکھ کر ان کی حقیقت معلوم کرے اور ظاہری چہرے کے پیچھے لوگوں کے باطنی چہرے کو بھی دیکھے۔

مسلمان وہ نہیں جو ہر پکار کو صرف یہ دیکھ کر قبول کر لے کہ یہ حق کی آواز ہے چاہے وہ جس گلے سے بھی نکل رہی ہو اور نہ وہ مسلمان ہے جو اپنی طرف بڑھنے والے ہر ہاتھ کو پکڑ لے۔ ہر کام جو ظاہر دینی ہو اسے دیکھتے ہیں اس کے ہم قدم ہو جائے، اسلام کو ہوشیار، آگاہ، حقیقت شناس، مستقبل پر نظر رکھنے والا اور تمام معاشرتی مسائل کا تجزیہ و تحلیل

کرنے کے قابل ہونا چاہیے۔ چاہیے کہ وہ فرشتوں کے لباس میں جنو کو پہچان لے۔ چرواہے کے لباس میں بھڑئیے کو پہچان لے اور اپنے آپ کو دوست نماز دشمنوں سے مقابلے کے لئے تیار کرے۔

اسلام میں ایک بنیادی چیز یہ ہے کہ ہر چیز سے پہلے نیتوں اور ارادوں کو دیکھا جائے۔ اسلام کی نظر میں ہر عمل کی قدر و قیمت اس کی نیت کے ساتھ وابستہ ہے نہ کہ اس کے ظاہر کے ساتھ۔ نیت اگرچہ ایک باطنی چیز ہے تاہم ممکن نہیں کہ کوئی شخص اپنی نیت صرف دل میں رکھے رہے اور اس کا اثر اس کے عمل میں ظاہر ہو اگرچہ وہ رازی داری میں بڑا ماہر اور استاد ہی کیوں نہ ہو۔

یہاں سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ اتنا با عظمت مقام یعنی مسجد اور خانہ خدا ہونے کے باوجود اسے جلانے کا حکم کیوں دیا؟ وہ مسجد جس کی ریت کا ایک ذرہ باہر نہیں جاسکتا اسے کیوں تباہ کر دیا اور وہ مقام کہ اگر نجس ہ و جائے تو فوراً پاک کرنا چاہیے اسے شہر کی گندگی پھینکنے کا مقام کیوں قرار دیا؟

ان سوالات کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ مسجد ضرار مسجد ہی نہ تھی، درحقیقت وہ بت خانہ تھا۔ مقدس جگہ نہ تھی افتراق اور نفاق کا مرکز تھا خدا کا گھر نہ تھا بلکہ شیطان کا گھر تھا۔ ظاہر نام اور نقاب کسی چیز کی حقیقت کو نہیں بدل سکتے۔

یہ ہے وہ عظیم درس جو مسجد ضرار کی داستان نے ہر دور کے تمام مسلمانوں کو دیا ہے۔ اس بحث سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد و اتفاق کی اسلام کی نظر اس قدر اہمیت ہے کہ اگر ایک مسجد کا دوسری مسجد کے قریب بنانا مسلمانوں کی صفوں کے درمیان تفرقہ بازی، اختلاف اور شگاف پیدا ہونے کا باعث ہو تو وہ تفرقہ انداز مسجد غیر مقدس ہے۔

۲۔ صرف نفی کافی نہیں:

دوسرا درس جو ہمیں مندرجہ بالا آیات سے ملتا ہے یہ ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ مسجد ضرار میں نماز نہ پڑھو بلکہ اس مسجد میں نماز پڑھو جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔

یہ ”نفی“ اور ”اثبات“ اسلام کے اصلی شعار ”لا الہ الا اللہ“ سے لے کر اس کے ہر چھوٹے بڑے پرگرام میں جلوہ گر ہے یہ امر اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ ہمیشہ ر نفی کے ساتھ ایک اثبات ہونا چاہیے تاکہ وہ خود جامہ عملی پہنے۔ اگر ہم لوگوں کو برائی کے مراکز میں جانے سے منع کرتے ہیں تو ضروری ہے کہ ان کے مقابلے میں پاک و پاکیزہ مراکز قائم کریں جو

معاشرے اور جمعیت کی روح تسکین کا باعث ہوں۔ اگر غلط تفریح سے لوگوں کو روکتے ہیں تو ہمیں صحیح تفریح کے مواقع فراہم کرنا چاہئیں۔ اگر ہم سامراجی مدارس اور تعلیمی اداروں میں جانے سے منع کرتے ہیں تو ضروری ہے کہ صحیح مراکز تعلیم و تربیت مہیا کریں۔ اگر ہم بے حیائی اور بے عفتی کی مذمت کرتے ہیں تو ہمیں نوجوانوں کے لئے شادی کے آسان وسائل فراہم کرنا چاہئیں۔

وہ لوگ جو اپنی تمام تر قوت ”نفی“ میں استعمال کرتے ہیں اور ان کے لائحہ عمل میں اثبات کا کوئی نام و نشان نہیں، انہیں یقین کر لینا چاہئے کہ ان کی نفی کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے کیونکہ سنت خلقت ہے کہ تماغرائز اور جذبات کو صحیح راستے سے سیراب کیا جائے۔ کیونکہ اسلام کا یہ مسلمہ طریقہ ہے کہ ”لا“ کو ”الا“ کے ساتھ باہم ہونا چاہئے تاکہ اس سے حیات بخش توحید پیدا ہو سکے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ یہ درس ہے کہ جسے بہت سے مسلمان فراموش کر چکے ہیں اور پھر بھی شکایت کرتے ہیں کہ اسلامی پرگراموں میں پیش رفت کیوں نہیں ہوتی حالانکہ ان کے خیالات کے برعکس اسلام کا پرگرام نفی میں منحصر نہیں ہے اگر وہ نفی اور اثبات کو ساتھ ساتھ رکھتے تو اسلامی پیش رفت حتمی اور یقینی ہوتی۔

۳۔ دو بنیادی شرطیں:

تیسرا قیمتی درس جو ہمیں مسجد ضرار کے واقعہ سے اور زیر بحث آیت سے ملتا ہے یہ ہے کہ ایک فعال اور مثبت دینی اور اجتماعی مرکز وہ ہے جو دو مثبت عناصر سے تشکیل پائے۔

پہلا یہ کہ اس کی بنیاد اور مقصد پاک ہو (اسس علی التقویٰ من اول یوم)۔

دوسرا یہ کہ اس کے حامی اور نگہبان پاک، صالح، صاحب ایمان، مضبوط دل اور مخلص ہوں ﴿فیه رجال یحبون ان

یتطہروا﴾۔

ان دو بنیادی ارکان کے نتیجہ اور مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

آیات ۱۱۱، ۱۱۲

۱۱۱۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعَدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾۔

۱۱۲۔ ﴿التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِنُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ﴾۔

ترجمہ

۱۱۱۔ خدا مومنین سے ان کی جانیں اور مال خریدتا ہے کہ تاکہ (ان کے بدلے) ان کے لئے جنت ہو (اس طرح سے کہ) وہ راہِ خدا میں جنگ کرتے ہیں، قتل کرتے ہیں۔ یہ سچا وعدہ اس کے ذمہ ہے جو اسنے توریت، انجیل اور قرآن میں ذکر فرمایا ہے اور خدا سے بڑھ کر اپنا وعدہ وفا کرنے والا کون ہے۔ اب تمہارے لئے خوش خبری ہے اس خرید و فریخت کے بارے میں جو تم نے خدا سے کی ہے اور یہ (تمہارے لئے) عظیم کامیابی ہے۔

۱۱۲۔ (مومن وہ ہیں جو) توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد و ثنا کرنے والے، سیاحت کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، برائی سے روکنے والے اور خدائی حود (اور سرحدوں) کی حفاظت کرنے والے ہیں اور (ایسے) مومنین کو خوشخبری دو۔

ایک بے مثال تجارت

گذشتہ آیات میں چونکہ جہاد سے پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے لہذا ان دو آیات میں ایک عمدہ مثال کے ساتھ صاحب ایمان مجاہدین کے بلند مقام کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مثال میں خدا نے اپنا خریدار کی حیثیت سے تعارف کروایا ہے ارشاد ہوتا ہے: خدا نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لئے ہیں اور اس مال و متاع کے بدلے انھیں جنت دے گا ﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾۔

ہر خرید و فروخت کے معاملے میں پانچ بنیادی اراکین ہوتے ہیں جو یہ ہیں:-

۱۔ خریدار

۲۔ بیچنے والا

۳۔ مال و متاع

۴۔ قیمت اور

۵۔ معاملہ کی سند۔

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اپنے آپ کو خریدار، مومنین کو بیچنے والا، مومنین کی جانوں اور مالوں کو مال متاع اور جنت کو اس معاملے کی قیمت قرار دیا ہے البتہ اس مال و متاع کو ادا کرنے کی طرز کے لئے ایک لطیف تعبیر استعمال کی گئی ہے یعنی ”وہ راہ خدا میں جنگ کرتے ہیں اور دشمنانِ حق کو قتل کرتے ہیں یا اس راہ میں قتل ہو جاتے ہیں اور جامِ شہادت نوش کرتے ہیں“ ﴿يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ﴾۔

در حقیقت خدا کا ہاتھ میدانِ جہاد میں صرف ہونے والے متاعِ جان و مال کو لینے کے لئے کھلا ہے۔

اس کے بعد پانچویں رکن کی طرف اشارہ ہے جو کہ معاملے کی محکم سند ہے فرمایا گیا ہے: یہ خدا کے ذمہ سچا وعدہ ہے جو تین آسمانی کتابوں تورات، انجیل اور قرآن میں آیا ہے ﴿وَعَدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ﴾۔

البتہ ”فی سبیل اللہ“ کی تعبیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ خدا ان جانوں مساعی اور مجاہدات کا خریدار ہے جو اس راہ میں صرف ہوتی ہیں یعنی خدا ہر اس کوشش کو خریدار ہے جو حق و عدالت کے لئے ہو اور جو انسانوں کو کفر ظلم اور فساد کے چنگل سے نجات دلانے کے لئے ہو۔

اس کے بعد قرآن اس عظیم معاملے کے لئے تاکید کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: خدا سے زیادہ اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہے ﴿وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ﴾۔ یعنی اگرچہ اس معاملے کی قیمت فوراً ادا نہیں کی جائے گی تاہم بیعِ نسبیہ^(۱)

کے خطرات میں نہیں کیونکہ خدا اپنی قدرت اور بے نیازی کے سبب ہر شخص کی نسبت اپنے عہد و پیمان کو زیادہ پورا کرنے والا ہے۔ نہ وہ بھولتا ہے اور نہ ادا کرنے سے عاجز ہے اور نہ ہی پورا کرنے کے بارے میں اور وعدہ کے مطابق قیمت ادا کرنے سے متعلق کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔

سب سے زیادہ جالبِ نظر امر یہ ہے کہ اس معاملے کے مراسم کی انجام دہی کے بعد کہ تجارت کرنے والوں کا معمول ہے کہ دوسرے کو مبارکبادی دی جاتی ہے، خدا تعالیٰ معاملے کو سود مند قرار دے تے ہوئے کہتا ہے: تمہیں خوشخبری ہو اس معاملہ پر، جو تم نے انجام دیا ہے ﴿فَاسْتَبَشِّرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ﴾۔^(۲)

ایسی نظیر دوسری عبارتوں میں بھی آئی ہے۔ مثلاً سورہ صف کی آیات ۱۰، ۱۱، ۱۲ میں فرمایا گیا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابِ إِلَهِ تَوَّابُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ خَيْرَ لَّكُمْ أَنْ تَكُنْتُمْ تَعْلَمُونَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرَىٰ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسْكَنٌ طَيِّبٌ فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ -

یعنی اے ایمان والو! کیا تمہیں ایسی تجارت کی رہبری کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دے - اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اگر تم جانو۔ وہ تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور تمہیں ایسی بہشتوں میں داخل کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور جنات عدن میں رہنے کی پاکیزہ جگہیں ہوں گی۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

یہاں انسان پروردگار کے اس لطیف پر حیرت میں ڈوب جاتا ہے وہ خدا جو تمام عالم ہستی کا مالک ہے اور تمام جہاں آفرینش پر حاکم مطلق ہے اور ہر شخص کے پاس جو کچھ ہے اسی کی طرف سے ہے جب وہ اپنی ہی عطا کردہ نعمتیں اپنے بندوں سے خریدنے پر آتا ہی ہے تو انہیں ہزار ہا گنا قیمت پر خریدتا ہے۔

زیادہ عجیب تو یہ بات ہے کہ جہاد جو انسان کی اپنی سر بلندی اور ہر قوم و ملت کی کامیابی و افتخار کا ذریعہ ہے اور اس کے ثمرات آخر کار خود انسان ہی کو حاصل ہوتے ہیں اسے اس متاع کی ادائیگی کا ذریعہ شمار کیا گیا ہے۔ نیز اگرچہ ضروری ہے مال و متاع اور قیمت کے درمیان کچھ توازن ہونا چاہئے لیکن اس پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے اور ایک نائیدار متاع جو بہر حال فنا ہونے والی سے (چاہے بیماری کے بستر پر ختم ہو جائے یا میدان جنگ میں) اس کے بدلے سعادت ابدی عطا کرتا ہے۔

اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اگرچہ خدا تمام سچوں سے زیادہ سچا ہے اور اسے کسی سند اور ضمانت کی احتیاج نہیں اس کے باوجود وہ اپنے بندوں کے لئے اہم ترین اسناد اور ضمانتیں پیش کرتا ہے۔ پھر اس عظیم معاملہ کے آخر میں انہیں مبارک دیتا ہے اور بشارات دیتا ہے کیا اس سے بالاتر کسی لطف و کرم اور محبت و رحمت کا تصور ہو سکتا ہے اور کیا کوئی معاملہ اس سے بڑھ کر سود مند ہو سکتا ہے۔ اسی لئے ایک حدیث میں جابر بن عبد اللہ انصاری سے مروی ہے کہ جب زیر نظر آیت نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم مسجد میں تھے آپ نے اس آیت کو بلند آواز میں تلاوت کیا، اور لوگوں نے تکبیر کہی۔ انصار میں سے ایک شخص سامنے آیا۔ اس نے بڑے تعجب سے پیغمبر سے پوچھا: کیا واقعاً یہ آیت تھی جو نازل ہوئی ہے

پیغمبر نے فرمایا: ہاں

وہ انصاری کہنے لگا: بیع ریح لانقیل ولا نستقیل

یعنی ہم اس معاملہ کو نہیں لوٹائیں گے اور اگر ہم سے چاہا گیا کہ اس سودے کو واپس کر دیں تو تو ہم قبول نہیں کریں گے۔ (۳)

جیسا کہ قرآن کی روش ہے کہ ایک آیت میں ایک بات کو اجمال کے ساتھ پیش کرتا ہے اور بعد والی آیت میں اس کی تشریح و توضیح کرتا ہے۔ دوسری محل بحث آیت میں مومنین جو خدا کے پاس اپنی جان و مال بچنے والے ہیں، کا واضح صفات کے ساتھ کا تعارف کرواتا ہے:

۱۔ وہ توبہ کرنے والے ہیں اپنے قلب و روح کی آلودگی کو توبہ کے پانی سے دھوتے ہیں ﴿التَّائِبُونَ﴾۔
۲۔ وہ عبادت کرنے والے ہیں خدا سے راز و نیاز کے ذریعے اور اس کی پاک ذات کی پرستش سے خود سازی کرتے ہیں اور اپنی اصلاح کرتے ہیں۔ ﴿الْعَابِدُونَ﴾۔

۳۔ وہ پروردگار کی مادی اور معنوی نعمتوں پر اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں ﴿الْحَامِدُونَ﴾۔
۴۔ وہ ایک مرکز عبادت سے دوسرے مرکز کی طرف آتے جاتے ہیں ﴿السَّائِحُونَ﴾۔ اسی طرح ان کا عبادت کے ذریعے خود سازی کا لائحہ عمل محدود ماحول میں منحصر نہیں رہتا اور کسی خاص علاقے سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ ان کے لئے ہر جگہ پروردگار کی عبادت خود سازی اور تربیت کا مرکز موجود ہے اور جہاں کہیں بھی اس سلسلے میں کوئی درس مل سکتا ہو وہ اس کے طالب ہیں۔

”سائح“ اصل میں ”سیح“ اور ”سیاحت“ کے مادہ سے جاری رہنے اور استمرار کے معنی میں لیا گیا ہے۔
یہ کہ زیر نظر آیت میں ”مسائح“ سے مراد کس قسم کی سیاحت اور استمرار مراد لی ہے۔ رسول اللہ کی ایک حدیث میں ہے:-

سِیَاحَةُ امْتِی فِی الْمَسَاجِدِ

میری مات کی سیر و سیاحت مساجد میں ہے۔ (تفسیر المیزان، زیر بحث آیت کے ذیل میں)
بعض نے ”صائح“ کو ”صائم“ یعنی روزہ دار کے معنی میں لیا ہے کیونکہ روزہ پورے دن میں ایک مسلسل کام ہے۔
ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم نے فرمایا ہے:- ان السائحین هم الصائمون

سائحون روزہ دار ہی ہیں۔ (تفسیر نور الثقلین اور دیگر تفاسیر)

بعض دوسرے مفسرین نے سیاحت کو روئے زمین میں سیر و گردش، عظمتِ خدا کے آثار کا مشاہدہ، انسانی معاشروں کی پہچان اور مختلف اقوام کی عادات و رسوم اور علوم و دانش سے آشنائی جو کہ انسانی افکار کو زندہ اور پختہ کرتی ہے، سمجھا ہے۔

بعض دوسرے مفسرین سیاحت کو میدانِ جہاد و دشمن سے مقابلے کے لئے سیر و حرکت کے معنی میں سمجھتے ہیں اس سلسلے میں وہ اس مشہور حدیثِ رسول کو شاہد قرار دیتے ہیں، کہ: ان سیاحۃ امتی الجہاد فی سبیل اللہ میری امت کی سیر و سیاحت اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ (تفسیر المیزان اور تفسیر المنار، محل بحث آیت کے ذیل میں)۔

کچھ نے اسے جہانِ ہستی، عواملِ سعادت اور اسبابِ شکست سے مربوط عقل و فکر کی سیر کے معنی میں سمجھا ہے۔ لیکن قبل اور بعد کے جو اوصاف شمار کئے گئے ہیں ان کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام معانی میں پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم نظر آتا ہے۔ اگرچہ تمام معانی بھی اس لفظ سے مراد لئے جاسکتے ہیں کیونکہ یہ تمام مفہام سیر و سیاحت کے مفہوم میں جمع ہیں۔

۵۔ وہ عظمتِ الہی کے سامنے رکوع کرتے ہیں ﴿الرَّاكِعُونَ﴾۔

۶۔ وہ اس کے آستانہ پر جبہ آسانی کرتے ہیں ﴿السَّاجِدُونَ﴾۔

۷۔ وہ لوگوں کو نیکیوں کی دعوت دیتے ہیں ﴿الْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ﴾۔

۸۔ وہ صرف نیکی کی دعوت دینے کا فریضہ ادا نہیں کرتے بلکہ ہر قسم کی برائی اور منکر سے بھی جنگ کرتے ہیں

﴿وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾۔

۹۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ادائیگی کے بعد اپنی آخری اور زیادہ اہم اجتماعی ذمہ داری یعنی حدودِ خداوندی کی

حفاظت، اس کے قوانین کا اجراء اور حق و عدالت کے قیام کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ﴿وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ﴾۔

یہ نو صفات بیان کرنے کے بعد خدا تعالیٰ دوبارہ ایسے سچے اور مکتبِ ایمان و عمل کے تربیت یافتہ مومنین کو تشویق دلاتا ہے اور پیغمبر اکرم سے کہتا ہے: ان مومنین کو بشارت دو: ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ﴾۔

یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ کس چیز کی بشارت ہے یا دوسرے لفظوں میں بشارت بطور مطلق آئی ہے لہذا وہ ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جس میں ہر طرح کی خیر و سعادت شامل ہے یعنی انھیں ہر خیر، ہر سعادت، ہر افتخار اور ہر اعزاز کی بشارت دو۔

اس نکتے کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ ان نو قسم کی صفات میں سے بعض (چھ پہلی صفات) خود سازی اور افراد کی تربیت کے ساتھ مربوط ہیں اور ان کا دوسرا حصہ (ساتویں اور آٹھویں صفت) اجتماعی فرائض سے متعلق ہے اور معاشرے کو پاک رکھنے کی طرف اشارہ ہے اور آخری صفت سب لوگوں کی ذمہ داری بیان کر رہی ہے اور وہ ہے صلح حکومت کا قیام اور مثبت سیاسی امور میں بھرپور شرکت۔

۱۔ بیع نسبیہ یہ ہے کہ جو چیز بیچی جائے وہ تو خریدنے والے کو دے دی جائے لیکن اس کی قیمت بعد میں ادا کرنا ہو۔ (مترجم)

۲۔ ”فاستبشروا“ مادہ ”بشارت“ در اصل ”بشرہ“ یعنی چہرہ کے معنی سے لیا گیا ہے اور خوشی کی طرف اشارہ ہے جس کے آثار چہرے پر ظاہر ہوتے ہیں۔

اور یہ تم سب کے لئے عظیم کامیابی ہے (وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ)۔

۳۔ تفسیر المیزان بحوالہ در المنثور۔

آیات ۱۱۳، ۱۱۴

۱۱۳۔ ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولَىٰ قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ

الْجَحِيمِ﴾۔

۱۱۴۔ ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ

لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ﴾۔

ترجمہ

۱۱۳۔ پیغمبر اور مومنین کے لئے مناسب نہیں تھا کہ مشرکین کے لئے (خدا سے) بخشش طلب کریں اگرچہ وہ ان کے قریبی کیوں نہ ہوں جبکہ ان پر روشن ہو گیا کہ یہ لوگ اصحابِ دوزخ ہیں۔

۱۱۴۔ اور ابراہیم علیہ السلام کی استغفار اپنے (بمنزلہ) باپ (پچا آزر) کے لئے صرف اس وعدہ کی وجہ سے تھی کہ جو اس سے کیا گیا تھا (تاکہ اسے ایمان کی طرف ترغیب دیں) لیکن جب اس پر واضح ہو گیا کہ وہ دشمنِ خدا ہے تو اس سے بیزاری کی۔ کیونکہ ابراہیم علیہ السلام مہربان اور بردبار ہے۔

شان نزول

تفسیر مجمع البیان میں مندرجہ بالا آیات کی شان نزول کے ابرے میں یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ بعض مسلمان پیغمبر اکرم سے کہتے تھے کہ کیا آپ ہمارے آباء و اجداد جو زمانہ جاہلیت میں مر گئے تھے، کے لئے طلبِ بخشش نہیں کرتے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انھیں خبردار کیا گیا کہ کوئی شخص حق نہیں رکھتا کہ مشرکین کے لئے استغفار کرے۔ ان آیات کی شان نزول کے بارے میں کچھ اور مطالب بھی بیان کئے گئے ہیں جو آیت کی تفسیر کے آخر میں آئیں گے۔

دشمنوں سے لاتعلقی ضروری ہے

پہلی آیت ایک اچھی اور قطعی تعبیر کے ساتھ پیغمبر اور مومنین کو مشرکین کے لئے استغفار سے منع کرتی ہے اور کہتی ہے: مناسب نہیں کہ پیغمبر اور صاحب ایمان افراد مشرکین کے لئے طلبِ مغفرت کریں ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا

أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ﴾۔

اس کے بعد تاکید کے طور پر اور عمومیت کے لئے مزید کہا گیا ہے: یہاں تک کہ وہ ان کے نزدیکی ہی کیوں نہ ہوں ﴿وَلَوْ كَانُوا أُولَىٰ قُرْبَىٰ﴾۔

اس کے بعد اس امر کی دلیل بیان کی گئی ہے: جب مسلمانوں پر واضح ہو گیا کہ مشرکین اہل جہنم ہیں اب ان کے لئے طلب مغفرت کے کوئی معنی نہیں ہیں ﴿مَنْ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ﴾۔ یہ بالکل فضول کام اور نامناسب آرزو ہے۔ کیونکہ مشرک کسی طرح بھی قابل بخشش نہیں ہے اور جو شرک کی راہ پر ہیں ان کے لئے راہ نجات کا تصور نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں استغفار اور طلب بخشش ایک طرح سے مشرکین کے ساتھ محبت، وابستگی اور لگاؤ کا اظہار بھی ہے اور یہ وہ چیز ہے جس سے قرآن میں بارہا منع کیا گیا ہے۔

قرآن سے آگاہ اور آشنا مومنین نے چونکہ اس آسمانی کتاب میں پڑھ رکھا تھا کہ حضرت ابراہیم ؑ نے اپنے چچا آزر کے لئے استغفار کی تھی تو ممکن تھا ان کے ذہن میں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا کہ آزر مشرک تھا اور اگر یہ کام ممنوع ہے تو خدا کے اس عظیم پیغمبر ؑ نے کیوں انجام دیا لہذا زیر نظر آیت میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ابراہیم کی استغفار اپنے بات (کے بمنزلہ چچا) کے لئے ایک وعدہ کی بنا پر تھی جو انھوں نے اس سے کیا تھا لیکن جب وہ ان پر واضح ہو گیا کہ وہ دشمن خدا ہے تو انھوں نے اس سے بیزاری اختیار کر لی اور پھر اس کے لئے استغفار نہیں کی ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ﴾۔

آیت کے آخر میں قرآن مزید کہتا ہے: ابراہیم وہ تھے جو بارگاہ خدا میں خاضع اور غضب الہی سے خائف بزرگوار تھے اور حلیم و بردبار تھے۔ ﴿إِن اِبْرَاهِيمَ لَا وَاهٍ حَلِيمٌ﴾۔

ہو سکتا ہے یہ جملہ ابراہیم ؑ کے آزر کے لئے استغفار کرنے کے وعدہ کی دلیل کے طور پر ہو کیونکہ ایک تو آپ حلیم و بردبار تھے اور دوسری صفت آپ کی ”واہ“ بیان ہوئی ہے جو بعض تفاسیر کے مطابق رحیم اور رحمن کے معنی میں ہے۔ ان صفات کا تقاضا تھا کہ آپ آزر کی ہدایت زیادہ کوشش کرتے اگرچہ وہ وعدہ استغفار اور اس کے گزشتہ گناہوں کے لئے طلب بخشش کی صورت میں ہو۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مندرجہ بالا جملہ اس امر کے لئے ہو کہ حضرت ابراہیم ؑ میں جو خشوع و خضوع تھا اور آپ میں خدا کی مخالفت کا جو خوف تھا اس کی وجہ سے وہ حق کے دشمنوں کے لئے استغفار کرنے کو بالکل تیار نہ تھے۔ بلکہ یہ

کام اس زمانے سے مخصوص تھا جب آپ کو آزر کی ہدایت کی امید تھی لہذا صرف اس کی دشمنی واضح ہوتے ہی آپ نے اس کام سے صرف نظر کر لیا۔

اگر سوال ہو کہ اس وقت مسلمانوں کو کیسے معلوم ہو گیا کہ ابراہیم ؑ نے آزر کے لئے استغفار کی تھی تو ہم جواب میں کہیں گے سورہ توبہ کی یہ آیات، جیسا کہ ہم ابتداء میں اشارہ کر چکے ہیں پیغمبر خدا کی عمر کے آخری حصے میں نازل ہوئی تھیں جبکہ مسلمان پہلے سے سورہ مریم کی آیت ۴۷ پڑھ چکے تھے۔ اس میں ہے کہ حضرت ابراہیم ؑ نے ”سا ستغفرک ربی“ کہہ کر آزر سے استغفار کا وعدہ کیا تھا۔ اور یہ بات مسلم ہے کہ خدا کا پیغمبر کسی سے فضول اور بلا وجہ وعدہ نہیں کرتا اور جب وہ وعدہ کرتا ہے تو اس کی وفا بھی کرتا ہے۔

نیز سورہ منتہ کی آیت ۴ میں بھی وہ پڑھ چکے تھے کہ حضرت ابراہیم کی استغفار صراحت سے آئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ اغْفِرْ لِي يَا اَبِي اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ﴾ (الشعراء - ۸۶)

چند اہم نکات

۱۔ ایک جعلی روایت:

کئی سنی مفسرین نے صحیح بخاری، مسلم اور دیگر کتب سے سعید بن مسیب کے واسطے سے اس کے باپ سے ایک جعلی روایت نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ جب ابو طالب کی موت کا وقت آیا تو پیغمبر اکرم ان کے پاس گئے جبکہ ابو جہل اور عبد اللہ بن امیہ ان کے پاس بیٹھے تھے تو پیغمبر اکرم نے ان سے فرمایا: اے چچا آپ ”لا الہ الا اللہ“ کہیں تاکہ میں اس کے ذریعے پروردگار کے ہاں آپ کی شفاعت کروں۔ اس وقت ابو جہل اور عبد اللہ بن امیہ نے ابو طالب کی طرف رخ کیا اور کہا: کیا تم چاہتے ہو کہ (اپنے باپ) عبد اللہ کے دین سے منہ پھیر لو۔ پیغمبر خدا نے ان سے وہی بات بار بار کہی۔ مگر ابو جہل اور عبد اللہ وہی کہتے ہوئے روکتے رہے۔ آخری بات جو ابو طالب نے کہی وہ یہ تھی۔ ”عبد المطلب کے دین پر اور ”لا الہ الا اللہ“ کہنے سے اجتناب کیا۔ اس وقت پیغمبر اکرم نے فرمایا: میں آپ کے لئے استغفار کرتا رہوں گا یہاں تک کہ مجھے اس سے روکا جائے اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ اٰمَنُوْا﴾ (تفسیر المنار اور اہل سنت کی دیگر تفاسیر)

اس حدیث میں جعلی ہونے کی نشانیاں صاف نظر آرہی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ مفسرین اور محدثین کے درمیان مشہور ہے کہ سورہ برات ۹ھ میں نازل ہوئی بلکہ بعض کے نظریے کے مطابق یہ آخری سورت ہے جو پیغمبر اکرم پر نازل ہوئی۔ جبکہ مورخین نے لکھا ہے کہ جناب ابوطالب کی وفات مکہ میں رسول اللہ کی ہجرت سے پہلے ہوئی ہے۔

اسی واضح تضاد کی بناء پر متعصبین مثلاً صاحب المنار نے ہاتھ پاؤں مارے ہیں۔ کبھی کہا ہے کہ یہ آیت دو مرتبہ نازل ہوئی، ایک دفعہ مکہ میں اور ایک دفعہ مدینہ میں ۹ھ میں۔ اس بے دلیل دعویٰ سے انھوں نے اپنے خیال میں اس واضح تضاد کو برطرف کرنے کی کوشش کی ہے کبھی کہا ہے کہ ہو سکتا ہے یہ آیت مکہ میں وفات ابوطالب کے وقت نازل ہوئی ہو۔

پھر بعد میں رسول اللہ کے حکم سے سورہ توبہ میں رکھ دی گئی ہو جبکہ یہ دعویٰ بھی بالکل دلیل سے عاری ہے۔ کیا بہتر نہ تھا کہ بجائے ایسے بے سند توجہات کرنے مذکورہ روایت اور اس کی صحت میں تردد کیا جاتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ حضرت ابوطالب کی وفات سے پہلے خدا تعالیٰ قرآن کی چند آیات میں مسلمانوں کو مشرکین کی دوستی اور محبت سے منع کر چکا تھا اور ہم جانتے ہیں کہ استغفار کرنا دوستی اور محبت کے اظہار کا ایک واضح ترین مصداق ہے اس کے باوجود کسی طرح ممکن ہے کہ ابوطالب دنیا سے مشرک کے طور پر چلے جائیں اور پھر رسول اللہ قسم کھائیں کہ میں تو اسی طرح تمہارے لئے استغفار کرتا رہوں گا جب تک خدا مجھے اس سے منع نہ کر دے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ فخر الدین رازی اس کا تو انکار نہیں کر سکا کہ یہ آیت باقی سورہ توبہ کی آیات کی طرح مدینہ میں پیغمبر اکرم کی آخری عمر میں نازل ہوئی ہے لیکن ایسے مسائل میں اپنے مشہور تعصب کی بناء پر ایک اور توجیہ کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ابوطالب کی وفات کے بعد اسی طرح مسلسل سورہ توبہ کے فزول تک ان کے لئے استغفار کرتے رہے۔ یہاں تک ایک مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انھیں منع کیا گیا۔ اس کے بعد کہتا ہے: اس میں کیا صرح ہے کہ یہ چیز پیغمبر اور مومنین کے لئے اس وقت تک جائز ہو۔

اگر فخر الدین رازی اپنے آپ کو تعصب کی قید سے آزاد کر لیتا تو اس حقیقت کی طرف متوجہ ہو جاتا کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ پیغمبر اکرم اتنی طویل مدت تک ایک مشرک شخص کے لئے استغفار کریں جبکہ بہت سی قرآنی آیات جو اس وقت تک نازل ہو چکی تھیں۔ مشرکین کے ساتھ ہر قسم کی محبت اور دوستی کی مذمت کر چکی تھیں۔^(۱)

تیسری بات یہ ہے کہ وہ اکیلا شخص جس نے یہ روایت نقل کی ہے وہ سعید بن مسیب ہے اور اس کی امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام سے دشمنی مشہور ہے۔ اس بناء پر اس کی بات پر حضرت علی ؑ ان کے والد اور ان کی اولاد کے بارے میں ہرگز اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

علامہ ابنی نے مذکورہ بات کی طرف اشارہ کرنے کے بعد واقدی سے ایک بات نقل کی ہے جو قابل توجہ ہے واقدی کہتا ہے:-

سعید بن مسیب حضرت امام سجاد علی بن الحسین علیہ السلام کے جنازے کے قریب سے غذا اور ان کی نماز جنازہ نہ پڑھی (اور ایک فضول عذر کے) اس کام سے اجتناب کیا لیکن ابن حزم کے بقول جب لوگوں نے اسے پوچھا کہ کیا تم حجاج کے پیچھے نماز پڑھتے ہو یا نہیں تو اس نے کہا کہ ہم حجاج سے بدتر کے پیچھے نما پڑھ لیتے ہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ جیسا کہ اسی تفسیر کی پانچویں جلد میں ہم کہہ آئے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ حضرت ابو طالب پیغمبر اسلام پر ایمان لے آئے تھے۔ اس سلسلے میں ہم نے واضح مدرک اور دلائل پیش کئے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ جو کچھ جناب ابو طالب کے ایمان نہ لانے کے بارے میں کہا گیا ہے وہ ایک بہت بڑی تہمت ہے۔ تمام شیعہ علماء اور بہت سے سنی علماء مثلاً ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں قسطلانی نے ارشاد الباری میں اور زینی و حلان نے تفسیر حلبی کے حاشیہ پر اس امر کی تصریح کی ہے۔

ایک باریک بین محقق اگر اس لہر کی طرف توجہ کرے جو بنی امیہ کے حکام کی طرف سے حضرت علی ؑ کے خلاف سیاسی مقاصد کے تحت اٹھی تھی تو وہ اچھی طرح اندازہ لگا سکتا ہے کہ جو شخص بھی آپ سے رشتہ اور تعلق رکھتا تھا وہ اس سازش سے امان میں نہیں تھا۔ درحقیقت حضرت ابو طالب کا اس کے علاوہ کوئی گناہ نہیں تھا کہ وہ اسلام کے عظیم پیشوا علی بن ابی طالب علیہ السلام کے باپ تھے۔ کیا ان لوگوں نے ابوذر جیسے عظیم مجاہد اسلام پر حضرت علی ؑ سے عشق و محبت اور مکتب عثمان سے مقابلے کی وجہ سے ایسی تہمتیں نہیں لگائیں۔

حضرت ابو طالب جو ساری زندگی پیغمبر اسلام کے حامی اور ان کے محافظ رہے اور آپ ہر طرح سے فرمانبرداری کرتے رہے، ان کے ایمان کے سلسلے میں مزید اطلاع کے لئے اسی تفسیر کی جلد پانچ کے صفحہ ۶۶ تا صفحہ ۱۷۱ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

۲۔ حضرت ابراہیم ؑ نے آزر سے استغفار کا وعدہ کیوں کیا؟

دوسرا سوال جو یہاں سامنے آتا ہے یہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے چچا آزر سے استغفار کا وعدہ کیوں کیا جبکہ زیر بحث آیت اور قرآن کی دیگر آیات کے مطابق آپ نے یہ وعدہ پورا کیا، حالانکہ وہ ہرگز ایمان نہیں لایا اور وہ مشرکوں اور بت پرستوں میں سے تھا اور ایسے افراد کے لئے استغفار کرنے کی ممانعت ہے۔

اس سوال کے جواب میں اس نکتے کی طرف توجہ کرنا چاہیے کہ مندرجہ بالا آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کو توقع تھی کہ انتظار تھا کہ اس طریقے سے آزر، ایمان اور توحید کی طرف مائل ہو جائے گا اور ان کی استغفار حقیقت میں یہ تھی کہ خداوند اسے ہدایت کر اور اس کے گزشتہ گناہوں کو بخش دے لیکن جب آزر نے حالت شرک میں اپنی آنکھیں دنیا سے بند کیں اور حضرت ابراہیم کے لئے مسلم ہو گیا کہ وہ پروردگار کی دشمنی میں امر ہے اور اب اس کی ہدایت کی کوئی گنجائش نہیں رہی تو آپ نے اس کے لئے استغفار کو ختم کر دیا۔

اس معنی کے مطابق مسلمان بھی اپنے مشرک دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے، جب تک وہ بقید حیات ہیں اور ان کی ہدایت کی امید ہو سکتی ہے استغفار کریں یعنی خدا سے ان کے لئے ہدایت اور بخشش دونوں طلب کریں لیکن جب وہ حالت کفر میں مرجائیں تو ان کے لئے اب استغفار کا کوئی موقع نہ رہے گا۔

باقی رہا یہ جو بعض روایات میں آیا ہے کہ امام صادق ؑ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم ؑ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر آزر اسلام لے آیا تو اس کے لئے استغفار کریں گے (نہ کہ اسلام لانے سے پہلے) اور جس وقت ان پر واضح ہو گیا کہ وہ دشمن خدا ہے تو آپ نے اس سے بیزاری اختیار کی۔ اس بناء پر ابراہیم کا وعدہ مشروط تھا اور چونکہ شرط پوری نہ ہوئی اس لئے انھوں نے کبھی اس کے لئے استغفار نہیں کی۔

یہ روایت مرسل اور ضعیف ہونے کے علاوہ ظاہر یا صریح آیات قرآن کے مخالف ہے کیونکہ زیر بحث آیت کا ظہور یہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے استغفار کی۔ سورہ شعراء کی آیت ۸۶ میں صراحت سے ہے کہ ابراہیم ؑ نے خدا سے اس کی بخشش کا تقاضا کیا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے: **وَاعْفِرْ لَابِيْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ**

اس کا دوسرا شاہد وہ مشہور جملہ ہے جو ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ جن تک آزر زندہ تھا حضرت ابراہیم نے بارہا اس کے لئے استغفار کی لیکن جب وہ حالت کفر میں مر گیا اور اس کی دین حق سے عداوت مسلم ہو گئی تو آپ بھی اس کام سے رک گئے۔

بعض مسلمان چونکہ اپنے بزرگ مشرکین کے لئے جو حالت کفر میں مر گئے تھے استغفار کرنا چاہتے تھے لہذا قرآن نے صراحت کے ساتھ انہیں منع کیا اور تصریح کی ابراہیم کا معاملہ بالکل ان سے مختلف تھا وہ تو آزر کی زندگی میں اور اس کے ایمان کی امید پر ایسا کرتے تھے نہ کہ اس کی موت کے بعد۔

۳۔ دشمنوں سے ہر قسم کا تعلق توڑ لینا چاہیے:

زیر بحث آیت کوئی واحد آیت نہیں ہے جو مشرکین سے ہر قسم کا رابطہ منقطع کرنے کی بات کرتی ہے۔ بلکہ قرآن کی متعدد آیات سے یہ امر اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کا رابطہ، رشتہ داری، قطع تعلق اور عدم رشتہ داری مکتبی اور مذہبی بنیادوں پر ہونا چاہیے اور یہ رشتہ (خدا پر ایمان اور اس قسم کے شرک اور بت پرستی سے مقابلہ) مسلمانوں کے تمام روابط پر حاوی ہونا چاہیے کیونکہ یہ رشتہ داری بنیادی ہے اور یہ رابطہ تمام اجتماعی اور معاشرتی امور پر حاکم ہے۔ سطحی اور ظاہری رشتے ناتے اس کی ہر گز نفی نہیں کر سکتے۔ یہ درس کل کے لئے بھی تھا اور آج کے لئے بھی ہے۔ یہ ہر زمانے اور ہر دور کے لئے ایک سبق ہے۔

آیات ۱۱۵، ۱۱۶

۱۱۵۔ ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُونَ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾۔

۱۱۶۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ﴾۔

ترجمہ

۱۱۵۔ ایسا نہ تھا کہ خدا کسی قوم کو ہدایت (اور ایمان) کے بعد سزا دے مگر یہ کہ جس سے انھیں بچنا چاہیے اسے ان کے لئے بیان کر دے (اور وہ اس کی مخالفت کریں) کیونکہ خدا ہر چیز سے دانا ہے۔

۱۱۶۔ آسمانوں اور زمین کی حکومت اس کے لئے ہے (وہ) زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور خدا کے علاوہ کوئی ولی اور مددگار نہیں ہے۔

شان نزول

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ کچھ مسلمان فرائض، و واجبات کے فزول سے پہلے اس دنیا سے چل بسے۔ کچھ لوگ رسول اللہ کی خدمت میں آئے اور ان کے انجام کے بارے میں پریشانی کا اظہار کیا ان کا خیال تھا کہ شاید فوت شدہ مسلمان عذاب الہی میں گرفتار ہوں کیونکہ انھوں نے یہ فرائض انجام نہیں دیئے تھے اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس بات کی نفی کی گئی۔ (مجمع البیان، محل آیت کے ذیل میں)۔

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت سابقہ آیات میں وارد صریح ممانعت سے پہلے مسلمانوں کے مشرکین کے لئے استغفار کرنے اور ان سے اظہار محبت کرنے کے بارے میں نازل ہوئی اور انھیں اطمینان دلایا ہے کہ ان کی استغفار جو خدا کی ممانعت سے پہلے تھی اس پر ان کا مواخذہ نہیں ہوگا۔

۱۔ سورہ نساءؑ مسلمان سورہ برات سے پہلے نازل ہوئی اس کی آیت ۱۳۹ میں اور سورہ آل عمران بھی برات سے پہلے نازل ہوئی اس کی آیت ۳۸ میں صراحت سے کفار سے دوستی اور محبت کرنے کو منع کیا گیا ہے اور خود اسی سورہ توبہ کی زیر بحث آیت سے پہلے کی آیات میں خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر سے بالصرحت کہتا ہے: ان (کفار) کے لئے استغفار کرو یا نہ کرو خدا انھیں نہیں بخشے گا۔

واضح حکم کے بعد سزا

مندرجہ بالا پہلی آیت ایک عمومی قانون کی طرف اشارہ ہے کہ جس کی عقل بھی تائید کرتی ہے اور وہ یہ کہ جب تک خدا کوئی حکم بیان نہ فرمائے اور شریعت میں اس کے بارے میں وضاحت نہ آجائے کسی شخص کو اس کے سلسلے میں سزا نہیں دے گا دوسرے لفظوں میں مسئولیت اور جوابدہی ہمیشہ احکام بیان کرنے کے بعد ہے اس چیز کو علم اصول میں ”قاعدہ بلا بیان“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

لہذا ابتداء میں فرمایا گیا ہے: ایسا نہ تھا کہ خدا کسی گروہ کو ہدایت کے بعد گمراہ کر دے جب تک جس چیز سے اسے پرہیز کرنا چاہیے وہ اس سے بیان نہ کر دے ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّىٰ يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُونَ﴾۔
 ”یضل“ اصل میں گمراہ کرنے کے معنی میں ہے اس سے مراد گمراہی کا حکم لگانا ہے جیسا کہ بعض مفسرین کو احتمال ہے جیسے تعدیل اور تفسیق۔ عدالت اور فسق۔ عدالت کا حکم لگانے کے معنی میں ہیں۔^(۱)
 و طائفة قد اكفروني بحكم

یعنی ایک گروہ نے آپ کی محبت کی وجہ سے مجھ پر کفر کا حکم لگایا ہے۔

یاد روز قیامت ثواب و جزا کے راستے سے گمراہ کرنے کے معنی میں ہے جو دراصل سزا دینے کے مفہوم میں ہو گا یا پھر ”اضلال“ سے مرد وہی ہے جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں اور وہ ہے نعمتِ توفیق سلب کرنا اور انسان کو اس حالت پر چھوڑ دینا۔ اس کا نتیجہ طریق ہدایت سے گمراہی اور سرگردانی یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ گناہوں کا تسلسل زیادہ گمراہی اور طریق ہدایت سے دور رہنے کا سرچشمہ ہے۔^(۲)

آیت کے آخر میں فرمایا گیا: خدا ہر چیز کو جانتا ہے ﴿إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾۔ یعنی خدا کے علم کا تقاضا ہے کہ جب تک اس نے کسی کے بارے میں اپنے بندوں سے کچھ کہا نہیں اس کے بارے میں کسی کو جوابدہ نہ سمجھے اور اس سے مواخذہ نہ کرے۔

۱۔ بعض یہ خیال کرتے ہیں کہ صرف ”باب تفعیل“ ہے جو کبھی حکم لگانے کے معنی میں بھی آتا ہے حالانکہ یہ ”حکم“ باب افعال میں دیکھا گیا ہے۔ مثلاً کیت شاعر کا مشہو شعر ہے جو اس خاندان رسالت سے اپنے عشق کے اظہار کے لئے کہا ہے، اس میں ہے:-

۲۔ قرآن میں ہدایت و ضلالت کے معنی کے بارے میں مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ جلد اول ص ۱۴۰ تا ۱۴۱ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

بعض مفسرین اور محدثین کا خیال ہے کہ مندرجہ بالا آیت اس پر دلیل کہ مستقلات عقلیہ جب تک شرعی طریق سے بیان نہ ہوں کوئی شخص ان کے بارے میں مسولیت نہیں رکھتا (مستقلات عقلیہ ان چیزوں کو کہتے ہیں جن کی اچھائی یا برائی کو انسان حکم شریعت کے بغیر اپنی عقل سے سمجھ لیتا ہے مثلاً ظلم کی بدی، عدالت کی اچھائی یا چوری، جھوٹ، تجاوز اور قتل ففس وغیرہ کی برائی) گویا ان کے خیال کے مطابق تمام احکام عقلی کی حکم شریعت کے ذریعہ تائید ہونا چاہیے تاکہ لوگوں کی ان کے بارے میں مسولیت ہو۔ اس خیال کی بناء پر شریعت کے فزول سے پہلے لوگ مستقلات عقلیہ کے بارے میں کوئی بھی جواب دہی نہیں رکھتے تھے لیکن اس کا خیال بطلان واضح ہے کیونکہ جملہ ”﴿حتیٰ یبین لہم﴾“ (یہاں تک کہ ان سے بیان کمرے) ان کا جواب دیتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ یہ آیت اور ایسی آیات ان مسائل سے مربوط و مخصوص ہے جو پروہ ابہام میں ہیں اور بیان و وضاحت کے محتاج ہیں اور یہ مسلم ہے کہ مستقلات عقلیہ کے بارے میں یہ بات نہیں ہو سکتی کیونکہ ظلم برا ہے اور عدالت اچھی ہے اس میں کوئی ابہام نہیں ہے جو وضاحت کا محتاج ہو۔

جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں وہ اس طرف متوجہ نہیں ہیں کہ اگر یہ بات صحیح ہو تو لوگوں پر ضروری نہیں رہتا کہ انبیاء کی دعوت پر لبیک کہیں اور ان کی صداقت معلوم کرنے کے لئے دعوی نبوت کے مدعی اور اس کے معجزات کا مطالعہ کریں کیونکہ ان کے تو ابھی پیغمبر کی سچائی اور حکم الہی واضح نہیں ہوا (لہذا ضروری نہیں کہ وہ ان کے دعویٰ کی تحقیقی کریں اور کا مطالعہ کریں۔ لہذا جیسے مدعیان نبوت کے دعویٰ کا مطالعہ عقل و خرد کے حکم سے واجب ہے اور اصطلاح کے مطابق مستقلات عقلیہ میں سے ہے ایسے ہیں دیگر مسائل جنہیں عقل و خرد وضاحت سے پہچانتی ہے، واجب الاتباع ہیں۔

اس گفتگو کی شاہد وہ تعبیر ہے جو طرق اہل بیت علیہ السلام کی بعض احادیث میں نظر آتی ہے۔ کتاب توحید میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

حتیٰ یعرفہم ما یرضیہ و ما یسخطہ

یعنی خدا کسی کو عذاب نہیں کرتا جب تک اسے سمجھانہ لے کہ کونسی چیزیں اس کی رضا کا سبب ہیں اور کون سی اس کے غضب کا موجب ہیں۔ (۱)

بہر حال یہ آیت اور اس قسم کی دیگر آیات ایک کلی حکم اور اصولی قانون کی بنیاد شمار ہوتی ہیں اور وہ یہ کہ جب تک کسی چیز کے وجوب یا حرمت کے لئے ہمارے پاس دلیل نہ ہو اس کے بارے میں ہماری کوئی مسوولیت نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے لئے تمام چیزیں جائز اور مباح ہیں مگر یہ کہ ان کے وجوب یا حرمت کے لئے کوئی دلیل موجود ہو۔ اسی بات کو ”اصل برات کہتے ہیں۔

بعد والی آیت میں اس مسئلہ پر تاکید کے حوالے سے کہا گیا ہے: آسمانوں اور زمینوں کی حکومت خدا کے لئے ہے ﴿إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾۔

(موت و حیات کا نظام اس کے قبضہ قدرت میں ہے وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے ﴿يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾۔ اس بناء پر ”تمہارا خدا کے علاوہ کوئی ولی، سرپرست، دوست اور یا اور نہیں ہے ﴿وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ﴾۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ عالم ہستی کی تمام قدرتیں اور تمام حکومتیں اس کے ہاتھ میں ہیں اور اس کے زیر فرمان ہیں۔ تم اس کے غیر کا سہارا نہ لو۔ غیر خدا کو پناہ گاہ قرار نہ دو اور استغفار وغیرہ کے ذریعے خدا کے دشمنوں سے اپنی محبت کا رشتہ قائم اور محکوم کرو۔

آیات ۱۱۸، ۱۱۷

۱۱۷۔ ﴿لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ يَحْمِلُ رُثُوفَ رَحِيمٍ﴾ -

۱۱۸۔ ﴿وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَنْ لَا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾ -

ترجمہ

۱۱۷۔ خدا اپنی اپنی رحمت پیغمبر اور (اسی طرح ان) مہاجرین و انصار کے شامل حال کی کہ جنہوں نے عسرت و شدت کے وقت کے وقت (جنگ تبوک میں) ان کی پیروی کی کہ جب کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل حق سے منحرف ہو جائیں (اور وہ میدان جنگ سے پلٹ آئیں اس کے بعد خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی وہ ان پر مہربان اور رحیم ہے۔

۱۱۸۔ (اسی طرح) ان تین افراد کہ جو مدینہ میں (وہ گئے تھے) اور انہوں نے تبوک میں شرکت نہیں کی تھی اور مسلمانوں نے ان سے قطع روابط کر لیا گیا) یہاں تک کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر جنت ہو گئی تھی اور (عالم یہ یہ تھا کہ) انہیں اپنے وجود میں بھی کوئی جگہ نہیں ملتی تھی اور انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا کی طرف سوائے اس کے کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔ اس وقت خدا نے اپنی رحمت ان کے شامل حال کی اور خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی کیونکہ خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

شان نزول

ایک عظیم درس

مفسرین نے کہا ہے کہ پہلی آیت جنگ تبوک کے بارے میں اور اس میں مسلمانوں کو پیش آمدہ مشکلات کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ مشکلات اس قدر تھیں کہ کچھ لوگوں نے پلٹ آنے کا راہہ کر لیا۔ لیکن خدا کا لطف و کرم اور اس کی توفیق ان کے شامل حال ہوئی اور وہ اسی طرح سے جے رہے۔

جن افراد کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی، کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک ابو حیثمہ ہے جو اصحاب پیغمبر میں سے تھا، منافقین میں سے نہ تھا لیکن سستی کی وجہ سے پیغمبر اکرم کے ساتھ میدان تبوک میں نہ گیا۔

اس واقعہ کو دس دن گزر گئے۔ ہو اگرم اور جلا دینے والی تھی، ایک دن اپنی بیویوں کے پاس آیا انھوں نے ایک سائبان تان رکھا تھا، ٹھنڈا پانی مہا کر رکھا تھا اور بہترین کھانا تیار کر رکھا تھا۔ وہ اچانک غور و فکر میں ڈوب گیا اور اپنے پیشوا رسول اللہ کی یاد سے ستانے لگی۔ اس نے کہا:-

رسول اللہ کہ جنھوں نے کبھی گناہ نہیں کیا اور خدا ان کے گزشتہ اور آئندہ کا ذمہ دار ہے: بیابان کی جلا ڈالنے والی ہواؤں میں کندھے پر ہتھیار اٹھائے اس دشوار گزار سفر کی مشکلات اٹھا رہے ہیں اور ابو حیثمہ کو دیکھو کہ ٹھنڈے سائے میں تیار کھانے اور خوبصورت بیویوں کے پاس بیٹھا ہے، کیا یہ انصاف ہے؟

اس کے بعد اس نے اپنی بیویوں کی طرف رخ کیا اور کہا:

خدا کی قسم تم میں سے کسی کے ساتھ میں بات نہ کروں گا اور سائبان کے نیچے نہیں بیٹھوں گا جب تک پیغمبر سے نہ جاملوں۔

یہ بات کہہ کر اس نے زاد راہ لیا، اپنے اونٹ پر سوار ہوا اور چل کھڑا ہوا۔ اس کی بیویوں نے بہت چاہا کہ اس سے بات کریں لیکن اس نے ایک لفظ نہ کہا اور اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ تبوک کے قریب جا پہنچا۔

مسلمان ایک دوسرے سے کہنے لگے: یہ کوئی سوار ہے جو سڑک سے گذر رہا ہے لیکن پیغمبر اکرم نے فرمایا: اے سوار تم ابو حیثمہ ہو تو بہتر ہے۔

جب وہ قریب پہنچا اور لوگوں نے اسے پہچان لیا تو کہنے لگے جی ہاں! ابو حیثمہ ہے۔

اس نے اپنا اونٹ زمین پر بٹھایا اور پیغمبر اکرم کی خدمت میں سلام عرض کیا اور اپنا مہجر بیان کیا۔

رسول اللہ نے اسے خوش آمدید کہا اور اس کے حق میں دعا فرمائی۔

اس طرح وہ ایک ایسا شخص تھا جس کا دل باطل کی طرف مائل ہو گیا تھا لیکن اس کی روحانی آمادگی کی بناء پر خدا نے اسے حق کی طرف متوجہ کیا اور اسے ثبات قدم بھی عطا کیا۔

دوسری آیت کے بارے میں ایک شان نزول منقول ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

مسلمانوں میں سے تین افراد کعب بن مالک، مراہ بن ربیع اور بلال بن امیہ نے جنگ تبوک میں شرکت نہ کی اور انھوں نے پیغمبر خدا کے ہمراہ سفر نہ کیا لیکن وہ منافقین میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے بلکہ ایسا انھوں نے سستی اور کاہلی کی بناء پر کیا تھا۔

تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ وہ اپنے لئے نادم اور پشیمان ہو گئے۔

جب رسول اللہ میدان تبوک سے مدینہ لوٹے تو وہ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معذرت لیکن رسول اللہ نے ان سے ایک لفظ تک نہ کہا اور مسلمانوں کو بھی حکم دیا کہ کوئی شخص اس سے بات چیت نہ کرے وہ ایک معاشرتی دباو کا شکار ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان کے چھوٹے بچے اور عورتیں رسول اللہ کے پاس آئیں اور اجازت چاہی کہ ان سے الگ ہو جائیں، آپ نے انھیں علیحدگی کی اجازت تو نہ دی لیکن حکم دیا کہ ان کے قریب نہ جائیں۔ مدینہ کی فضا وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی۔ وہ مجبور ہو گئے کہ اس اتنی بڑی ذلت اور رسوائی سے نجات حاصل کرنے کے لئے شہر چھوڑ دیں اور اطراف مدینہ کے پہاڑوں کی چوٹی پر جا کر پناہ لیں۔

جن باتوں نے جن باتوں نے ان کے جذبات پر شدید ضرب لگائی ان میں سے ایک یہ تھی کہ کعب بن مالک کہتا ہے: میں ایک دن بازار مدینہ میں پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا کہ ایک شامی عیسائی مجھے تلاش کرتا ہوا آیا۔ جب اس نے مجھے پہچان لیا تو بادشاہ غسان کی طرف سے ایک خط میرے ہاتھ میں دیا۔ اس میں لکھا تھا کہ اگر تیرے ساتھی نے تجھے دھتکار دیا ہے تو ہماری طرف چلے آؤ۔ میری حالت منقلب اور غیر ہو گئی اور میں نے کہا وائے ہو مجھ پر میرا معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ دشمن میرے بارے میں لالچ کرنے لگے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ان کے اعز و اقارب ان کے پاس کھانا لے آتے مگر ان سے ایک لفظ بھی نہ کہتے۔ کچھ مدت اسی صورت میں گزر گئی اور وہ مسلسل انتظار میں تھے کہ ان کی توبہ قبول ہو اور کوئی آیت نازل ہو جو ان کی توبہ کی دلیل بنے۔ مگر کوئی خبر نہ تھی۔

اس دوران ان میں سے ایک کے ذہن میں یہ بات آئی اور اس نے دوسروں سے کہا کہ اب جبکہ لوگوں نے ہم سے قطع تعلق کر لیا ہے کیا ہی بہتر ہو کہ ہم بھی ایک دوسرے سے قطع تعلق کر لیں (یہ ٹھیک ہے کہ ہم گنہ گار ہیں لیکن مناسب ہے کہ دوسرے گنہ گار سے خوش اور راضی نہ ہوں)

انھوں نے ایسا کیا یہاں تک کہ ایک لفظ بھی ایک دوسرے سے نہیں کہتے تھے اور ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہتا تھا۔ اس طرح پچاس دن انھوں نے توبہ و زاری کی اور آخر کار ان کی توبہ قبول ہو گئی۔ اس پر مندرجہ بالا آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

گنہ گاروں کے لئے معاشرتی دباو

یہ آیات بھی جنگ تبوک سے متعلق اور اس عظیم اسلامی واقعے کے بارے میں مختلف مطالب پر مشتمل ہیں۔ پہلی آیت میں پروردگار کی اس لامتناہی رحمت کی طرف اشارہ ہے جو ایسے حساس لمحات میں پیغمبر اور مہاجرین و انصار کے شامل حال ہوئی۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا کی رحمت پیغمبر اور ان کے مہاجرین و انصار کے شامل حال ہوئی جو شدت اور بھران کے موقع پر آنحضرت کی پیروی کرتے ہیں ﴿لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ﴾ -

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہ رحمت الہی اس وقت شامل حال ہوئی جب شدت حوادث اور پریشانیوں کے دباؤ کی وجہ سے قریب تھا کہ مسلمانوں کا ایک گروہ راہ حق سے پھر جائے (اور تبوک سے واپسی کا ارادہ کر لے) ﴿مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِنْهُمْ﴾ -

دوبارہ تاکید کی گئی ہے: اس صورت حال کے بعد اللہ نے اپنی رحمت ان کے شامل حال کر دی اور ان کی توبہ قبول کر لی کیونکہ وہ مومنین پر مہربان اور رحیم ہے ﴿ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ يَرْوِفٌ رَحِيمٌ﴾ - اس کے بعد نہ صرف اس عظیم گروہ پر اپنی رحمت نازل کی کہ جو جہاد میں شریک ہوا بلکہ ان تین افراد پر بھی اپنا لطف و کرم کیا جو جنگ میں شریک نہ ہوئے تھے اس لئے مجاہدین انھیں پیچھے چھوڑ گئے تھے ﴿وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خَلَفُوا﴾ - لیکن یہ لطف الہی انھیں آسانی سے سیر نہیں آیا بلکہ ایسا اس وقت ہوا جب یہ تین افراد (کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ جن کے بارے میں شان نزول میں بتایا جا چکا ہے) شدید معاشرتی دباؤ میں رہ چکے تھے اور تمام لوگوں نے ان کا بایکات کر دیا تھا ”یہاں تک کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی تھی“ ﴿حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ﴾ - اور ان کے سینے اس طرح سے غم اندوہ سے معمور تھے کہ گویا ”انھیں اپنے وجود میں بھی جگہ نہ ملتی تھی“ اور عالم یہ تھا کہ انھوں نے ایک دوسرے سے بھی رابطہ منقطع کر لیا تھا ﴿وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ﴾ اس طرح ان پر تمام راستے بند ہو گئے تھے ”اور انھوں نے یقین کر لیا تھا کہ اس کی طرف بازگشت کے علاوہ غضب خدا سے بچنے کے لئے کوئی اور پناہ گاہ نہیں ہے“ ﴿وَضُنُّوا أَنَّ لَا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ﴾ -

دوبارہ رحمت خدا انکے شامل حال ہوئی۔ اور اس رحمت نے ان کے لئے حقیقی اور مخلصانہ توبہ اور بازگشت ان کے لئے آسان کر دی ﴿ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا﴾ - کیونکہ خدا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾ -

چند اہم نکات

۱۔ ﴿تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ﴾ سے کیا مراد ہے؟

محل بحث پہلی آیت میں ہم نے پڑھا ہے کہ خدا نے پیغمبر، مہاجرین اور انصار پر توبہ کی اور ان کی توبہ قبول کی اس میں شک نہیں کہ معصوم پیغمبر کا تو گناہ ہی نہ تھا کہ خدا اس پر توبہ کرتا اور اس کی توبہ قبول کرتا، اگرچہ اہل سنت کے بعض مفسرین حدیث نے مندرجہ بالا تعبیر کو جنگ تبوک کے واقعہ میں پیغمبر سے کوئی لغزش ہونے کی دلیل قرار دیا ہے لیکن خود اس آیت میں اور قرآن کی دوسری آیات میں غور و خوض کیا جائے تو یہ تفسیر غلط معلوم ہوتی ہے کیونکہ: پہلی بات تو یہ ہے کہ پروردگار کی توبہ کا معنی ہے ”اس اپنی رحمت کے ساتھ لوٹ آنا“ اور بندوں کی طرف توبہ کرنا اور اس کے مفہوم میں گناہ یا لغزش نہیں ہے جیسا کہ سورہ نساء میں بعض احکام اسلام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

﴿يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾

خدا چاہتا ہے کہ تم سے اپنے احکام بیان کرے اور جو لوگ تم سے پہلے تھے ان کی اچھی سنت اور روش کی تمہیں ہدایت کرے اور تم پر ”توبہ“ کرے اور خدا عالم و حکیم ہے۔

اس آیت میں اور اس سے پہلے گناہ اور لغزش کی کوئی بات نہیں کی گئی۔ بلکہ اس آیت کی تصریح کے مطابق گفتگو احکام بیان کرنے کے حوالے سے اور گزشتہ لوگوں کی اچھی طرح سنتوں کی ہدایت کے بارے میں ہو رہی ہے یہ چیز خود نشان دہی کرتی ہے کہ یہاں توبہ کا معنی ہے بندوں کے لئے رحمت الہی شمول۔

دوسری بات یہ ہے کہ کتب لغت میں بھی توبہ کا ایک یہی معنی مذکور ہے۔ مشہور کتاب قاموس میں توبہ کا ایک معنی اس طرح ذکر ہوا ہے: رجوع علیہ بفضلہ و قبولہ

یعنی اس کی طرف لوٹا اپنے فضل و قبول کرنے سے۔

تیسری بات یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں مومنین کے صرف ایک گروہ کے انحراف حق کا ذکر ہے حالانکہ خدائی توبہ سب کے لئے قرار دی گئی ہے یہ امر نشان دہی کرتا ہے کہ یہاں خدائی توبہ گناہ پر بندوں کی معذرت قبول کرنے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہاں اس سے مراد خدا کی خاص رحمت ہے جو ان سخت لمحات میں پیغمبر اور تمام مومنین کی مدد کے

لئے آئی۔ اس میں مہاجرین و انصار میں سے کسی کے لئے استثناء نہیں ہے اور اس رحمت نے انہیں جہاد میں ثابت رکھا۔

۲۔ جنگ تبوک کو ”ساعة العسرة“ کیوں کہا گیا؟

لفظ ”ساعت“ لغت کے اعتبار سے وقت کے ایک حصہ کو کہتے ہیں، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ البتہ زیادہ لمبے زمانے کو ساعت نہیں کہا جاسکتا ہے اور ”عسرت“ مشقت اور سختی کے معنی میں ہے۔

تاریخ اسلام نشاندہی کرتی ہے کہ مسلمان کبھی بھی جنگ تبوک کے موقع کی طرح مشکل صورت حال، دباو اور زحمت میں مبتلا نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ ایک تو سفر تبوک سخت گرمی کے عالم میں تھا۔ دوسرا خشک سالی سے لوگوں کو تنگ اور ملول کر رکھا تھا اور تیسرا اس وقت درختوں سے پھل اتارنے نے دن تھے اور اسی پر لوگوں کی سال بھر کی آمدنی کا انحصار تھا۔

ان تمام چیزوں کے علاوہ مدینہ اور تبوک کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ تھا اور مشرقی روم کی سلطنت کا انہیں سامنا تھا جو اس وقت کی سپر پاور تھی۔

مزید برآں سواریاں اور رسد مسلمانوں کے پاس اتنا کم تھا کہ بعض اوقات دو افراد مجبور ہوتے تھے کہ ایک ہی سواری پر باری باری سفر کریں بعض پیدل چلنے والوں کے پاس جو تاک نہیں تھا اور وہ مجبور تھے کہ وہ بیابان کی جلائے والی ریت پر پا برپنہ چلیں۔ آب و غذا کی کمی کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات خرمہ کا ایک دانہ چند آدمی یکے بعد دیگرے منہ میں رکھ کر چوستے تھے یہاں تک کہ اس کی صرف گھٹلی رہ جاتی پانی کا ایک گھنٹہ چند آدمیوں کو مل کر پینا پڑتا۔

ان تمام باتوں کے باوجود اکثر مسلمان قوی اور مستحکم جذبہ رکھتے تھے اور تمام مشکلات کے باوجود رسول خدا کے ہمراہ دشمن کی طرف چل پڑے اور اس عجیب استقامت اور پامردی کا مظاہرہ کمرے ہر دور کے تمام مسلمانوں کے لئے انھوں نے ایک عظیم درس یادگار کے طور پر چھوڑا۔

ایسا درس جو تمام نسلوں کے لئے کافی ہے یہ درس عظیم اور خطرناک دشمنوں پر کامیابی کا وسیلہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں ایسے افراد تھے جن کے دل کمزور تھے اور یہی کمزور دل واپس لوٹ جانے کی فکریں تھے ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔ من بعد ما کاد یزیغ قلوب فریق منهم

”یزیغ“ ”یزیغ“ کے مادہ سے ہے اس کا مطلب ہے حق سے باطل کی طرف انحراف۔

لیکن جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ اکثریت کے عالم جذبات نے اور لطفِ پروردگار نے انہیں بھی اس فکر سے پلٹا دیا اور وہ بھی راہِ حق کے مجاہدین میں شامل ہو گئے۔

۳۔ تین افراد کے لئے ”خلفوا“ کی تعبیر:

مندرجہ بالا آیات میں سست اور سہل انگار تین افراد کے بارے میں ”خلفوا“ کی تعبیر آئی ہے یعنی ”انہیں پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا“۔

یہ تعبیر یا تو اس بناء پر ہے کہ جب ایسے افراد سستی کرتے تو مسلمان انہیں پیچھے چھوڑ جاتے اور ان کی پرواہ کے لئے بغیر میدانِ جہاد کی طرف پیش قدمی کر جاتے تھے اور یا اس بناء پر ہے کہ جس وقت وہ عذر خواہی کے لئے پیغمبر اکرم کے پاس آئے تو آپ نے ان کا عذر قبول نہ کیا اور ان کی توبہ قبول کرنے کو پس پشت ڈال دیا۔

۴۔ ایک دائمی اور عظیم سبق:

زیر بحث آیات سے جو اہم مسائل معلوم ہوتے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ مجرموں اور فاسدوں کو معاشرتی دباو اور بائیکاٹ کے ذریعے سزا دینے سے متعلق ہے۔

ہم اچھی طرح سے دیکھ رہے ہیں کہ جنگِ تبوک سے پیچھے رہ والے افراد سے بائیکاٹ سے وہ کیسی سختی، تنگی اور دباو میں مبتلا ہوئے یہ بائیکاٹ ان کے لئے ہر قسم قسم کے قید خانے سے سخت تر تھا یہاں کہ اس اجتماعی بائیکاٹ کی وجہ سے ان کی جان لبوں تک آپہنچی اور وہ ہر طرف سے ناامید ہو گئے اس طریقے سے اس وقت کے مسلمانوں کے معاشرے پر اس کا ایسا وسیع اثر ہوا کہ اس کے بعد بہت کم افراد ایسی جرات کرتے تھے کہ وہ ایسے گناہ کے مرتکب ہوں۔

ایسی سزا سے نہ توقید خانوں کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے نہ ایسی سزاؤں پر کوئی خرچ اٹھتا ہے نہ ایسی سزا سستی و کاہلی کا جنم دیتی ہے اور نہ ہی برے اخلاق کو پنپنے دیتی ہے لیکن کی تاثیر ہر قید خانہ سے زیادہ اور بہت ہی دردناک ہے۔

درحقیقت یہ ایک بائیکاٹ اور معاشرے کی طرف سے ایسے برے اور فاسد افراد کے خلاف منفی جنگ ہے جو حساس ذمہ داریوں کی ادائیگی سے منہ موڑ لیتے ہیں اگر مسلمان ہر دور اور ہر زمانے میں ایسے لوگوں کے خلاف اس طرح کا اقدام کریں تو انہیں کامیابی حاصل ہونا یقینی ہو جائے۔ اس طرح سے مسلمان اپنے معاشرے کو پاک کر سکتے ہیں لیکن بد قسمتی سے آج کے اسلامی معاشروں میں ایسے جرائم سے چشم پوش اور سازش کاری تقریباً ایک ہمہ گیر بیماری کی شکل

اختیار کی چکی ہے یہ صورت حال نہ صرف یہ کہ ایسے افراد کو روک نہیں سکتی بلکہ انھیں ان کے برے اعمال میں مزید دلیر اور لاپرواہ کر دیتی ہے۔

۵۔ جنگ تبوک سے مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی:

”تبوک“ کا مقام ان تمام مقامات سے دور تھا جہاں پیغمبر اکرم نے اپنی جنگوں میں پیش قدمی کی۔ ”تبوک“ میں ایک محکم اور بلند قلعہ کا نام تھا۔ جو حجاز اور شام کی سرحد پر واقع تھا۔ اسی وجہ سے اس علاقے کو سرزمین تبوک کہتے تھے۔ جزیرہ نما عرب میں اسلام کے تیز رفتار نفوذ کی وجہ سے رسول اللہ کی شہرت اطراف کے تمام ممالک میں گونجنے لگی۔ باوجودیکہ وہ اس وقت حجاز کی اہمیت کی قائل تھے لیکن طلوع اسلام اور لشکر اسلام کی طاقت کہ جس نے حجاز کو ایک پرچم تلے جمع کر لیا، نے انھیں اپنے مستقبل کے بارے میں تشویش میں ڈال دیا۔

مشرقی روم کی سرحد حجاز سے ملتی تھی۔ اس حکومت کو خیال ہوا کہ کہیں اسلام کی تیز رفتار ترقی کی وہ پہلی قربانی نہ بن جائے لہذا اس نے چالیس ہزار کی زبردست مسلح فوج جو اس وقت کی روم جیسی طاقتوں کے شایان شان تھی۔ اکھٹی کی اور اسے حجاز کی سرحد پر لاکھڑا کیا یہ خبر مسافروں کے ذریعے پیغمبر اکرم کے کانوں تک پہنچی۔ رسول اللہ نے روم اور دیگر ہمسایوں کو درس عبرت دینے کے لئے توقف کیے بغیر تیاری کا حکم صادر فرمایا۔

آپ کے منادیوں نے مدینہ اور دوسرے علاقوں تک آپ کا پیغام پہنچایا۔ تھوڑے ہی عرصے میں تیس ہزار افراد رومیوں سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ان میں دس ہزار سوار اور بیس ہزار پیادہ تھے۔

موسم بہت گرم تھا، غلے کے گودام خالی تھے، اس سال کی فصل ابھی اٹھائی نہیں گئی تھی۔ ان حالات میں سفر کرنا مسلمانوں کے لئے بہت ہی مشکل تھا۔ لیکن چونکہ خدا اور رسول کا فرمان تھا لہذا ہر حالت میں سفر کرنا تھا اور مدینہ اور تبوک کے درمیان پر خطر، طول صحرا کو عبور کرنا تھا۔ اس لشکر کو چونکہ اقتصادی طور پر بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اس کا راستہ بھی طولانی تھا راستے میں جلانے والی زہریلی ہوائیں چلتی تھیں سنگریزہ اڑتے تھے جھکڑ چلتے تھے سواریاں بھی کافی نہ تھیں، اس لئے یہ ”جیش العسرة“ (یعنی سختیوں والا لشکر) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے تمام سختیوں کو جھیلا اور ماہ شعبان کی ابتداء میں ہجرت کے نویں سال سرزمین تبوک میں پہنچا جبکہ رسول اللہ حضرت علی کو اپنی جگہ پر مدینہ میں چھوڑ آئے تھے۔ یہ واحد غزوہ ہے جس میں حضرت علی علیہ السلام شریک نہیں ہوئے۔

رسول اللہ کا اقدام بہت ہی مناسب اور ضروری تھا کیونکہ بہت احتمال تھا کہ بعض پیچھے رہنے والے مشرکین یا منافقین جو حیلوں بہانوں سے میدانِ تبوک میں شریک نہ ہوئے تھے رسول اللہ اور ان کی فوج کی طویل غیبت سے فائدہ اٹھائیں اور مدینہ پر حملہ کر دیں۔ عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیں اور مدینہ کو تاخت و تاراج کر دیں لیکن حضرت علیؓ کا مدینہ میں رہ جانا ان کی سازشوں کے مقابلے میں ایک طاقتور بند تھا۔

بہت حال جب رسول اللہ تبوک میں پہنچے تو وہاں آپ کو رومی فوج کا کوئی نام و نشان نظر نہ آیا۔ عظیم سپاہ اسلام چونکہ کئی جنگوں میں اپنی عجیب و غریب جرات و شجاعت کا مظاہرہ کر چکی تھی جب ان کے آنے کی خبر رومیوں کے کانوں تک پہنچی تو انھوں نے اسی کو بہتر سمجھا کہ اپنے ملک کے اندر چلے جائیں اور اس طرح سے ظاہر کریں کہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے لشکرِ روم کی سرحدوں پر جمع ہونے کی خبر ایک بے بنیاد افواہ سے زیادہ کچھ نہ تھی کیونکہ وہ ایک ایسی خطرناک جنگ شروع کرنے سے ڈرتے تھے کہ جس کا جواز بھی ان کے پاس کوئی تھا لیکن لشکرِ اسلام اس طرح سے تیز رفتاری سے میدانِ تبوک میں پہنچنے سے دشمنانِ اسلام کو کئی درس سکھائے، مثلاً:

۱۔ یہ بات ثابت ہو گئی کہ مجاہدینِ اسلام کا جذبہ جہاد اس قدر وقتی ہے کہ وہ اس زمانے کی نہایت طاقتور فوج سے نہیں ڈرتے۔

۲۔ بہت سے قبائل اور اطراف، تبوک کے امراء پیغمبرِ اسلام کی خدمت میں آئے اور آپ سے تعرض اور جنگ نہ کرنے کے عہد و پیمان پر دستخط کیے اس طرح مسلمان ان کی طرف سے آسودہ خاطر ہو گئے۔

۳۔ اسلام کی لہریں سلطنتِ روم کی سرحدوں کے اندر تک چلی گئیں اور اس وقت کے ایک اہم واقعے کے طور پر اس کی آواز ہر جگہ گونجی اور رومیوں کے اسلام کی طرف متوجہ ہونے کے لئے زمین ہموار ہو گئی۔

۴۔ یہ راستہ طے کرنے اور زحمتوں کو برداشت کرنے سے آئندہ شام کا علاقہ فتح کرنے کے لئے راہ ہموارہ و گئی اور معلوم ہو گیا کہ آخر کار یہ راستہ طے کرنا ہی ہے۔

یہ عظیم فوائد ایسے تھے کہ جن کے لئے لشکر کی زحمت برداشت کی جاسکتی تھی۔

بہر حال پیغمبرِ اکرم نے اپنی سنت کے مطابق اپنی فوج سے مشورہ کیا کہ پیش قدمی جاری رکھی جائے یا واپس پلٹ جایا جائے۔ اکثریت کی رائے یہ تھی کہ پلٹ جانا بہتر ہے اور یہ اسلامی اصولوں کی روح سے زیادہ مناسب رکھتا تھا

خصوصاً جبکہ اس وقت طاقت فرما سفر اور راستے کی مشقت و زحمت کے باعث اسلامی فوج کے سپاہی تھکے ہوئے تھے اور ان کی جسمانی قوت مزاحمت کمزور پڑ چکی تھی۔
رسول اللہ نے اس رائے کو صحیح قرار دیا اور لشکر اسلام مدینہ کی طرف لوٹ آیا۔

آیت ۱۱۹

۱۱۹۔ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾۔

ترجمہ

۱۱۹۔ اے ایمان والو! خدا (کے ہر حکم کی مخالفت) سے ڈرو اور سچوں کا ساتھ دو۔

سچوں کا ساتھ دو

گذشتہ آیات میں متخلفین اور جنگ سے منہ موڑنے والوں کے بارے میں گفتگو تھی۔ متخلفین وہ لوگ تھے جنہوں نے خدا اور رسول سے کئے ہوئے عہد کو توڑ ڈالا وہ لوگ جو عملی طور پر خدا اور قیامت پر اپنے اظہار ایمان کی تکذیب کر چکے تھے اور ہم نے دیکھا کہ مسلمانوں نے قطع روابط کر کے انہیں کس طرح سے تنبیہ کی۔

زیر بحث آیت میں ان کے مد مقابل دوسرے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں حکم دیا گیا ہے کہ اپنا رابطہ سچے لوگوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ جو اپنے عہد پر قائم ہیں، مستحکم رکھو۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اے ایمان والو! حکم خدا کی مخالفت سے بچو ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ﴾۔ اور اس بناء پر کہ اہل ایمان تقویٰ کی پریچ و خم راہ کو غلطی اور انحراف کے بغیر طے کر سکیں، مزید فرمایا گیا ہے سچوں کا ساتھ دو ﴿وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾۔

اس بارے میں ”صادقین“ کون ہیں، مفسرین نے مختلف احتمالات ذکر کئے ہیں لیکن اگر ہم راستے کو مختصر کرنا چاہیں تو ہمیں خود قرآن کو طرف رجوع کرنا چاہیئے جس نے متعدد آیات میں ”صادقین“ کی تفسیر کی ہے۔

سورہ بقرہ میں ہے:-

﴿لَيْسَ الْبِرُّ أَنْ تُولَّوْا وُجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى مَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ حِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾۔ (بقرہ- ۱۷۷)

اس آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ قبلہ کی تبدیلی کے مسئلے میں مسلمانوں کو زیادہ باتیں کرنے سے منع کیا گیا ہے اور پھر اس کے بعد نیکی کی حقیقت کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے۔

خدا روز قیامت، ملائکہ، آسمانی کتب اور انبیاء پر ایمان لانا۔
اس کے بعد فرمایا:

راہ خدا میں حاجت مندوں اور محروم لوگوں پر خرچ کرنا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، عہد و پیمان پورا کرنا اور جہاد کے وقت مشکلات کے سامنے صبر و استقامت دکھانا۔ ان سب چیزوں کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے:

جو لوگ ان صفات کے حامل ہوں وہ صادق اور پرہیزگار ہیں۔

اسی طرح صادق وہ ہے جو تمام مقدسات پر ایمان رکھتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ ہر میدان میں عمل بھی کرتا ہو۔

سورہ حجرات آیہ ۱۵ میں ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ

الصَادِقُونَ﴾۔

یعنی۔ (اس مال میں) ان مفلس مہاجروں کا (حصہ) ہے جو اپنے گھروں سے اور مالوں سے دور کر دیئے گئے (اور جو) خدا کے فضل اور خوشنودی کے طلب گار ہیں اور خدا کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ سچے ہیں۔

اس آیت میں وہ محروم مومنین کہ جنہوں نے تمام مشکلات کے باوجود پامردی اور استقامت دکھائی اور اپنے گھر بار اور مال و منال سے زبردستی الگ کر دیئے گئے اور جن کا ہدف رضائے الہی اور نصرت، پیغمبر کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ انہیں ”صادقین“ قرار دیا گیا ہے۔

ان تمام آیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ صادقین وہ ہیں جو پروردگار پر ایمان لانے کے نتیجے میں اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سے انجام دیتے ہیں نہ شک و تردد کا شکار ہوتے ہیں، نہ پاؤں پیچھے ہٹاتے ہیں، نہ ہی ہجوم مشکلات سے گھبراتے ہیں بلکہ مختلف طرح سے فداکاری کے اپنے ایمان کی سچائی کا ثبوت دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ان صفات کے کئی مداح اور مراتب ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ سب سے بالا درجے پر فائز ہوں جنہیں ہم ”معصوم“ کہتے ہیں اور بعض نچلے مراحل میں ہوں۔

کیا صادقین سے مراد صرف معصومین ہیں؟

جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے ”صادقین“ کا مفہوم اگرچہ وسیع ہے مگر بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے یہاں مراد صرف معصومین ہیں۔

سَلِيم بن قَيْس ہَلَالی بیان کرتے ہیں کہ ایک دن امیر المومنین علیہ السلام کچھ مسلمانوں سے محو گفتگو تھے۔ آپ نے ان سے دیگر باتوں کے علاوہ فرمایا:

میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں، کیا تمہیں معلوم ہے کہ خدا نے ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ کا حکم نازل ہو تو مسلمان نے عرض کیا: اے خدا کے رسول! کیا اس سے مراد عام ہے یا خاص؟ تو رسول اللہ نے فرمایا: اس حکم کے مامور اور ذمہ دار تمام مومنین ہیں لیکن ”صادقین“ کا مفہوم مخصوص ہے میرے بھائی علی کے لئے اور روز قیامت تک اس کے بعد اوصیاء کے لئے۔

جب علیؑ نے یہ سوال کیا تو حاضرین نے کہا: جی ہاں! یہ بات ہم نے رسول اللہ سے سنی تھی۔ (تفسیر برہان جلد ۲ ص ۱۷۰)۔

نافع نے عبد اللہ بن عمر سے اس آیت کی تفسیر میں یوں نقل کیا ہے:

خدا نے پہلے مسلمانوں کا حکم دیا ہے کہ وہ خدا سے ڈریں، اس کے بعد فرمایا ہے: ﴿كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ ”یعنی مع محمد و اہل بیہ (محمد اور ان کے اہل بیت کا ساتھ دو)“ (تفسیر برہان جلد ۲ ص ۱۷۰)۔

اہل سنت کے بعض مفسرین مثلاً صاحب المنار مندرجہ بالا روایت کے ذیل میں اس طرح نقل کیا ہے کہ ”مع محمد و اصحابہ“ (محمد اور ان کے اصحاب کے ساتھ) لیکن مفہوم آیت کی طرف توجہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عام ہے اور ہر زمانے کے لئے ہے اور ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہ کے صحابہ ایک محدود زمانے میں تھے لہذا عبد اللہ بن عمر سے جو روایت شیعہ کتب میں آئی ہے۔ صحیح تر دکھائی دیتی ہے۔

تفسیر برہان کے مصنف نے اسی طرح کا مضمون اہل تسنن کے طرق سے نقل کیا ہے اور کہا ہے: موفق ابن احمد نے اپنی اسناد ابن عباس سے مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں اس طرح سے نقل کیا ہے: وہو علی بن ابی طالب یعنی وہ علی بن ابی طالب ہیں۔

اس کے بعد کہتا ہے:

یہی مطلب عبد الرزاق نے کتاب رموز الكنوز میں درج کیا ہے۔ (تفسیر برہان جلد ۲ ص ۱۰۰)

زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں پہلا حکم یہ دیا گیا ہے کہ ”تقویٰ اختیار کرو“ اور اس کے بعد سچوں کا ساتھ دینے کا حکم دیا گیا ہے اگر ”صادقین“ کا مفہوم آیت میں عام ہوتا اور تمام سچے اور با استقامت مومنین اس میں شامل ہوتے تو کہا جاتا ”وكونوا مع الصادقين“ یعنی سچوں میں سے رہنا نہ کہ ”سچوں کے ساتھ دو“ (غور کیجئے گا)۔

یہ امر خود اس بات کا قرینہ ہے کہ ”صادقین“ آیت میں ایک خاص گروہ کے لئے آیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ساتھ دینے سے مراد ساتھ رہنا نہیں بلکہ بلاشبہ اس سے مراد ان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ کیا کسی غیر معصوم کی پیروی اور نقش قدم پر چلنے کا حکم بغیر کسی قید اور شرط کے دیا جاسکتا ہے کیا یہ خود اس امر پر دلیل نہیں کہ صادقین سے مراد صرف ”معصومین“ ہیں۔

لہذا جو کچھ روایات سے معلوم ہوتا ہے اگر غور و خوض کریں تو وہی مفہوم خود آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے یہ بات جانبِ توجہ ہے کہ معروف مفسری فخر رازی نے جو تعصب اور شک پیدا کرنے میں مشہور یہ حقیقت قبول کی ہے (اگرچہ زیادہ تر اہل سنت مفسرین اس مسئلہ سے خاموشی سے گذر گئے ہیں) وہ کہتا ہے:

خدا مومنین کو سچوں کا ساتھ دینے کا حکم دیا ہے لہذا آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو لوگ جائز الخطاء ہیں وہ کسی معصوم کی پیروی کریں تاکہ اس پیروی کے ذریعے خطاء سے محفوظ رہیں اور یہ مفہوم ہر دور کے لئے ہونا چاہئے اور زمانہ پیغمبر میں اسے مخصوص کرنے کے لئے کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔

لیکن بعد میں مزید کہتا ہے:

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آیت کا مفہوم یہی ہے اور ہر زمانے میں معصوم ہونا چاہئے، لیکن ہم اس معصوم کو مجموع امت سمجھتے ہیں نہ کہ کوئی ایک فرد۔ بالفاظِ دیگر یہ آیت اجماع مومنین کی حیثیت اور مجموع امت کے خطانہ کرنے کی دلیل

ہے۔ ۱

یوں فخر رازی آدھا راستہ تو ٹھیک طرح سے طے کر لیا لیکن باقی نصف راہ میں اشتباہ کا شکار ہو گیا اگر وہ ایک نکتہ کی طرف توجہ کرتا جو متن آیت میں موجود ہے تو باقی نصف راستہ بھی صحیح طرح سے طے کر لیتا اور وہ نکتہ یہ ہے کہ اگر صادقین سے مراد ساری امت ہے تو خود یہ پیرو بھی اس مجموع کا جز ہے اوریوں دراصل پیرو کا پیشوا کا حصہ ہو جائے گا اور تابع و تبوع کا اتحاد اور ایک ہونا لازم آئے گا حالانکہ ظاہر آیت یہ ہے کہ پیرو کار اور ہیں اور پیشوا اور ہیں یعنی تابعین اور تبوعین جدا جدا اور علیحدہ علیحدہ ہیں (غور کیجئے گا)۔

خلاصہ یہ کہ مندرجہ بالا آیت ان آیات میں سے ایک ہے جو ہر زمانے میں موجود معصوم پر دلالت کرتی ہیں۔
ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ ”صادقین“ جمع ہے لہذا ضروری ہے کہ ہر زمانے میں متعدد معصوم ہوں۔
اس سوال کا جواب بھی واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ مخاطب صرف ایک زمانے کے لوگوں نہیں ہیں بلکہ آیت تمام
زمانوں کے لئے ہے لہذا گفتگو متعدد معصومین کے بارے میں ہوگی نہ کہ ایک فرد کے بارے میں۔
اس امر کا بولتا ہوا گواہ یہ ہے کہ زمانہ رسول میں سوائے آنحضرت کے کوئی اور واجب الاطاعت نہ تھا۔ جبکہ آیت
مسئلہ طور پر اس زمانے مومنین کے لئے بھی تھی۔ لہذا ہم سمجھتے ہیں کہ جمع سے مراد ایک زمانے کے افراد نہیں بلکہ جمع
زمانوں کے مجموعہ کے لئے ہے۔

آیات ۱۲۱، ۱۲۰

۱۲۰۔ ﴿مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنْفُسِهِمْ عَنْ نَفْسِهِ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا يَخْمَصُهُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطْئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نِيلاً إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾۔

۱۲۱۔ ﴿وَلَا يُنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾۔

ترجمہ

مناسب نہیں کہ اہل مدینہ اور بادیہ نشین جو اس کے اطراف میں ہیں، رسول اللہ سے اختلاف کریں اور اپنی جان بچانے کے لئے ان کی جان سے لاپرواہی کریں یہ اس لئے ہے کہ انھیں کوئی پیاس نہیں لگے گی، نہ خستگی ہوگی، نہ راہ خدا میں بھوک لگے گی، نہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھاتے ہیں کہ جو کافروں کے غضب کا موجب ہو اور نہ دشمن سے کوئی ضرب کھاتے ہیں مگر یہ کہ اسکی وجہ سے ان کے لئے اچھا عمل لکھا جاتا ہے کیونکہ نیک لوگوں کی اجرت (اور جزا) ضائع نہیں کرتا

۱۲۱۔ اور وہ کسی چھوٹے یا بڑے مال کو (راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے اور کسی زمین کو) میدان جہاد کی طرف جاتے ہوئے یا اس سے پلٹتے ہوئے) خرچ نہیں کرتے اور کسی زمین کو (میدان جہاد کی طرف جاتے ہوئے اس سے پلٹتے ہوئے) عبور نہیں کرتے مگر یہ کہ ان کے لئے لکھا جاتا ہے تاکہ خدا ان کے بہترین اعمال کے لحاظ سے انہیں جزا دے۔

مجاہدین کو مشکلات پر جزا ضرور ملے گی

گذشتہ آیات میں جنگ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں سرزنش آئی تھی۔ زیر بحث دو آیات اس سلسلے میں ایک کلی قانون کے طور پر آخری اور بنیادی بحث کرتی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: مدینہ کے لوگ اور بادیہ نشین جو اس مرکز اسلام شہر کے اطراف میں زندگی بسر کرتے ہیں انھیں حق نہیں پہنچتا کہ رسول اللہ سے اختلاف کریں اور انھیں چھوڑ کر بیٹھ جائیں ﴿مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ﴾۔

اور نہ انھیں یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی جان کی حفاظت کو رسول کی جان کی حفاظت پر مقدم رکھیں ﴿وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنْفُسِهِمْ

عَنْ نَفْسِهِ﴾۔

کیونکہ امت کے رہبر، اللہ کے رسول اور ملت اسلام کی بقا اور حیات کی علامت ہیں انہیں اکیلا چھوڑ دینا نہ صرف پیغمبر کو خطرے میں ڈالے گا بلکہ دین خدا اور خود مومنین کا وجود اور حیات کا بھی حقیقتاً خطرے میں پڑ جائے گی۔

در حقیقت قرآن ایک جذباتی بیان کے ذریعے تمام اہل ایمان کو پیغمبر کی حفاظت کرنے پر ابھارتا ہے اور مشکلات و مصائب میں ان کی حمایت اور دفاع کی ترغیب دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہاری جان اس کی جان سے عزیز تر نہیں ہے اور نہ تمہاری زندگی اس کی حیات سے زیادہ قیمتی ہے۔ کیا تمہارا ایمان اس کی جازت دیتا ہے کہ وہ ہستی جو بہت ہی زیادہ پر ارزش ہے اور جس کا وجود تمہاری نجات اور رہبری کے لئے، وہ خطرے میں پڑ جائے اور تم سلامت طلب اپنی جان اس کی جان بچانے کے لئے اس کی راہ میں قربانی سے دریغ کرو۔

مسلم ہے کہ مدینہ اور اطراف مدینہ کے لئے تاکید اس بنا پر ہے کہ اس زمانے میں مرکز اسلام مدینہ میں تھا ورنہ یہ حکم نہ مدینہ اور اس کے اطراف کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ ہی پیغمبر خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔ تمام مسلمانوں کی ہر دور میں ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے رہبروں کو اپنی جان کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ گرامی اور عزیز سمجھیں اور ان کی حفاظت کی کوشش کریں اور مشکلات میں انہیں اکیلا نہ چھوڑیں کیونکہ ان کے لئے خطرہ پوری امت کے لئے خطرہ ہے۔

اس کے بعد اس اجر و جزا کی طرف اشارہ ہے جو ہر قسم کی مشکلات کا مجاہدانہ مقابلہ کرنے سے مجاہدین کو نصیب ہوتی ہے ان مشکلات میں سے سات اقسام کی نشاندہی کی گئی ہے:

۱۔ ”یہ اس بنا پر ہے کہ انہیں کوئی پیاس نہیں لگتی“ ﴿ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ﴾۔

۲۔ ”نہ انہیں کوئی خستگی اور تکان ہوتی ہے“ ﴿وَلَا نَصَبٌ﴾۔

۳۔ ”نہ راہ خدا میں انہیں کوئی بھوک دامن گیر ہوتی ہے“ ﴿وَلَا تَحْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾۔

۴۔ ”نہ کفار کے غیظ و غضب کی وجہ سے کسی خطرے سے دوچار ہوتے ہیں“ ﴿وَلَا يَطْعُونُ مَوَطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ﴾۔

۵۔ ”اور نہ انہیں دشمن کی طرف سے کوئی ضرب لگتی ہے“ ﴿وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نِيلاً﴾۔

مگر یہ کہ اس کے ساتھ ان کے لئے عمل صالح لکھا جاتا ہے ﴿لَا تُكْتَبُ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ﴾۔ مسلم ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے انہیں ایک ایک کر کے جزا اور اجر ملے گا، کیونکہ خدا نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾۔

۶۔ اسی طرح ”وہ تھوڑا یا زیادہ مال راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے“ ﴿وَلَا يَنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً﴾۔

۷۔ اور میدان جہاد میں جاتے ہوئے لوٹتے ہوئے وہ کسی سرزمین کو عبور نہیں کرتے مگر یہ کہ یہ تمام قدم اور یہ اخراجات ان کے لئے ثبت ہو ہو جاتے ہیں اور لکھ لئے جاتے ہیں “وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ” - تاکہ آخر خدا اعمال کے لحاظ سے انھیں بدلہ اور جزا دے ﴿لِيَجْزِيََهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ ﴿لَا يَنَا لُونُ مِنْ عَدُوِّ نِيْلَا﴾ کا مفہوم :

جیسا کہ سطور بالا میں ذکر ہوا ہے اس جملے اکثر مفسرین نے یہ مراد لیا ہے کہ مجاہدین راہِ خدا میں دشمن سے بی تکلیف اٹھائیں چاہے وہ زخم کی صورت میں ہو یا قید و بند کی صورت میں یا پھر قتل ہونے کی صورت میں ہو خدائی جزا کے لئے ان کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہے اور ہر ایک کی مناسبت سے انھیں اجر ملے گا۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آیت مجاہدین کی مشکلات شمار کر رہی ہے یہی معنی مناسب معلوم ہوتا ہے لیکن اگر خود اس جملے کی ب بندی کا سہارا لیں اور اس کے الفاظ کی مناسبت سے اس کی تفسیر کریں تو پھر اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ پیکر دشمن پر ج وبھی ضرب لگاتے ہیں ان کے نامہ عمل میں لکھی جائے گی کیونکہ ”نال من عدوہ“ لغت میں دشمن پر ضرب بلگانے کے معنی میں ہے لیکن پوری آیت کے لئے توجہ گذشتہ تفسیر کے لئے قرینہ ہے۔

۲۔ ﴿اِحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ سے کیا مراد ہے؟

اس جملے کی دو تفسیریں ذکر کی گئی ہیں ایک یہ کہ لفظ ”احسن“ ان کے افعال کی صفت ہے اور دوسرا یہ کہ ان کی جزا کی صفت ہے۔

پہلی صفت ہم نے اوپر انتخاب کی ہے یہی ظاہر آیت سے بھی زیادہ منافق ہے۔ اس تفسیر کے مطابق ایسے مجاہدین کے اعمال ان کی زندگی کے بہترین اعمال قرار دیئے گئے ہیں اور خدا ان کی جزا ان کے تناسب کے لحاظ سے دے گا۔ دوسری تفسیر لفظ ”احسن“ کے بعد لفظ ”من“ کی تقدیر کی محتاج ہے اس کے مطابق خدائی جزا ان کے اعمال سے بہتر اور بالاتر قرار دی گئی ہے۔ اس کے مطابق جملے کی تقدیر اس طرح ہوگی : لیجزیہم اللہ احسن مما کانوا یعملون۔ یعنی جو کچھ وہ انجام دے چکے ہیں خدا انھیں اس سے بہتر جزا دے گا۔

۳۔ یہ آیت ہر دور کے مسلمانوں کے لئے ہے :

مندرجہ بالا آیات صرف گزشتہ مسلمانوں کے لئے نہ تھیں بلکہ آج کے بھی اور ہر دور کے مسلمانوں کے لئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر جہاد میں چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، طرح طرح کی مشکلات اور پریشانیاں ہوتی ہیں لیکن جب مجاہدین قلب و روح کو خدا پر ایمان اور اس کے عظیم وعدوں سے روشن کریں اور جان لیں کہ ہر سانس، ہر بات اور ہر قدم جو اس کے راستے میں اٹھائیں گے وہ ضائع نہیں ہوگا بلکہ اس کا حساب بغیر کسی کم و کاست کے انتہائی باریک بینی سے محفوظ ہے اور خدا انہیں ان کے بدلے میں انہیں بہترین اعمال شمار کرتے ہوئے اپنے لطف کے بحر بیکراں سے مناسب ترین جزا دے گا تو ان حالات میں وہ مشکلات برداشت کرنے سے کبھی نہیں گھبرائیں گے اور مشکلات کی کثرت سے نہیں ڈریں گا اور جہاد کتنا ہی طولانی، کھٹن اور حادثات سے معمور ہو وہ کسی قسم ضعف ہو وہ کسی قسم کی سستی کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔

۱۲۲۔ ﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾۔

ترجمہ

۱۲۲۔ مناسب نہیں کہ سب مومنین (میدان جہاد کی طرف) کوچ کریں۔ ہر گروہ میں سے ایک طائفہ کیوں خرچ نہیں کرتا (اور ایک حصہ باقی نہیں رہتا) دین (اور اسلامیہ معارف و احکام) سے آگاہی حاصل کریں اور اپنی قوم کی طرف باز گشت کے وقت انھیں ڈرائیں تاکہ وہ (حکم خدا کی مخالفت سے) ڈریں اور رک جائیں۔

شان نزول

مرحوم طبری نے مجمع البیان میں ابن عباس سے روایت کی ہے کہ جس وقت پیغمبر اکرم میدان جہاد کی طرف روانہ ہوئے تو سب مسلمان آپ کے ساتھ نکل پڑتے۔ پیچھے معذور افراد اور منافقین رہ جاتے لیکن جب کچھ آیات منافقین کی نازل ہوئیں اور خصوصاً جنگ تبوک سے منہ موڑنے والوں کو جس طرح سے وعید و ملامت نے آکھیرا اس سے مومنین جہاد کے میدانوں میں شرکت کے لئے اور زیادہ پختہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ جنگیں جن میں پیغمبر ذاتی طور پر شرکت نہیں کرتے تھے ان میں شرکت کے لئے بھی سب نکل پڑتے تھے اور رسول اللہ کو تنہا چھوڑ دیتے تھے۔

اس صورت حال کے پیش نظر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انھیں بتایا گیا کہ ضرورت کے علاوہ مناسب نہیں کہ سب مسلمان میدان جنگ کی طرف جائیں بلکہ ایک گروہ مدینہ کی طرف جائے اور مدینہ میں جانے والے رسول اللہ سے اسلامی معارف و احکام کی تعلیم حاصل کریں اور اپنے مجاہد دوستوں کو واپس آنے کے بعد تعلیم دیں۔

اس عظیم مفسر نے اس اضمون کی ایک اور شان نزول نقل کی ہے: اصحاب پیغمبر میں سے کچھ افراد تبلیغ دین کے لئے بادیہ نشین قبائل کے پاس گئے،۔ بادیہ نشینوں نے ان کی آمد کو پسند کیا اور ان سے اچھا سلوک کیا لیکن بعض نے ان پر اعتراض کیا کہ تم لوگ کوئی رسول اللہ کو چھوڑ کر ہمارے پاس آگئے ہو۔ یہ بات سن کر وہ پریشان اور افسردہ ہوئے اور پیغمبر خدا کی خدمت میں پلٹ آئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ان کے تبلیغی کام کی تائید کی اور ان کی پریشانی کو دور کیا۔

تفسیر بیان میں اس آیت کی ایک اور شانِ نزول بھی نقل ہوئی ہے اور وہ یہ کہ جب بادیہ نشین لوگ مسلمان ہو گئے تو احکامِ اسلام معلوم کرنے کے لئے سب کے سب مدینہ کی طرف چل پڑے اس سے مدینہ میں اجناس کی قیمتیں چڑھ گئیں اور کئی اور مشکلات پیدا ہو گئیں۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انھیں حکم دیا گیا کہ ضروری نہیں کہ تم سب سے اپنے شہر اور گھروں کو خالی چھوڑ کر معارفِ اسلام سمجھنے کے لئے مدینہ آ جاؤ بلکہ اگر کچھ لوگ آجائیں تو کافی ہے۔

جہالت اور دشمن کے خلاف جہاد

زیر نظر آیت، جہاد کے سلسلے میں گزشتہ آیات سے تعلق رکھتی ہے یہ ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے جو مسلمان کے لئے حیاتِ آفرین حیثیت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ جہاد بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس سے پیچھے رہ جانا ننگ و عار اور گناہ ہے لیکن بعض مواقع پر جہاں ضرورت تقاضا نہیں کرتی کہ تمام مسلمان میدانِ جہاد میں شرکت کریں خصوصاً ان مواقع پر جب پیغمبر خود مدینہ میں رہ جائیں تو ”مناسب نہیں کہ سب جہاد کے لئے چل پڑیں بلکہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کی ہر جماعت کے دو حصے ہوں۔ ایک حصہ فریضہ جہاد کو انجام دے اور دوسرا حصہ مدینہ میں رہ کر اسلام کے معارف کی تعلیم حاصل کرے“ ﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ﴾۔ اور جب ان کے دوست مجاہدین میدان سے پلٹ کر آئیں تو خدا کے احکام و فرامین کی انھیں تعلیم دیں اور انھیں ان کی مخالفت سے ڈرائیں ﴿وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ﴾۔ ہو سکتا ہے اس طرح سے فرمانِ خدا کی مخالفت سے پرہیز کریں اور اپنے فرائض انجام دیں ﴿لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾۔

چند قابلِ توجہ امور

۱۔ آیت کی تفسیر میں مختلف احتمالات:

آیت کی تفسیر میں جو کچھ کہا ہے وہ مشہور شانِ نزول میں مطابقت رکھنے کے علاوہ آیت کے ظاہری مفہوم سے بھی دیگر ہر تفسیر کی نسبت زیادہ موافق ہے ایک چیز البتہ یہاں قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ ”کل فرقة طائفة“ کے بعد ”لتبقى طائفة“ (ایک گروہ باقی رہے) مقرر سمجھا جائے یعنی ہر جماعت میں سے ایک گروہ چلا جائے اور ایک گروہ رہ جائے آیت میں موجود قرآن کی طرف توجہ کی جائے تو اس سے کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی (غور کیجئے گا)

لیکن بعض مفسرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ آیت میں کسی قسم کی تقدیر نہیں ہے اور مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک گمروہ واجب کفائی ہے طور پر میدانِ جہاد میں جائے اور وہاں اسلامی تعلیمات سے آگاہی حاصل کرے دشمنوں پر مسلمانوں کی کامیابی کو اپنی آنکھوں سے دیکھے جو کہ اس دین کی عظمت و حقانیت کا نمونہ ہے اور واپسی پر یہ آگاہی اپنے دوستوں کو منتقل کرے۔^(۱)

تیسرا احتمال بعض بعض دوسرے مفسرین نے ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ مباحث جہاد سے الگ، آیت ایک مستقل حکم بیان کر رہی ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ واجب کفائی کے طور پر ان کی ہر جمیعت میں سے ایک گروہ اٹھ کھڑا ہو جو اسلامی تعلیمات و معارف حاصل کرنے کے لئے اسلام کے عظیم مراکز کی طرف جائے اور علوم حاصل کرنے کے بعد اپنے شہروں اور گھروں کو پلٹ آئے اور دوسروں کو ان کی تعلیم دے۔ (یہ تفسیر تیان میں شیخ کی بیان کی گئی شان نزول سے مطابقت رکھتی ہے)

البتہ جیسا کہ ہم نے کہا ہے پہلی تفسیر آیت کے مفہوم سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور اگرچہ تمام معانی مراد لینا بھی زیادہ بعید نہیں ہے۔^(۲)

۲۔ ایک اشکال اور اس کا جواب:

بعض نے خیال کیا ہے کہ اس آیت اور گزشتہ آیات کے درمیان ایک طرح کا اختلاف زیر بحث آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ سب کو میدانِ جہاد میں شرکت کا حکم دیا گیا ہے اور پیچھے رہ جانے والوں کی سخت سرفراز کی گئی ہے لیکن زیر بحث آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ سب لوگ میدانِ جہاد کی طرف نہ چل پڑیں۔

لیکن واضح ہے کہ یہ دونوں حکم مختلف حالات کے پیش نظر دیئے گئے ہیں مثلاً تبوک کے موقع پر جبکہ روم کی شاہی حکومت کی طاقتور فوج کا سامنا تھا، وہاں اس کے علاوہ چارہ ہی نہ تھا کہ تمام مسلمان چل پڑیں خصوصاً ایسے مواقع پر جبکہ رسول اللہ خود مدینہ میں رہ جائیں تو مدینہ خالی نہیں چھوڑنا چاہیے اور اس صورت میں اہتمالی خطرات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے نیز اسلامی احکام و معارف کے حصول سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ لہذا مندرجہ بالا آیات میں کوئی نسخ نہیں ہے اور بعض نے جو یہ خیال کیا ہے وہ اشتباہ ہے۔

۳۔ ”تفقہ فی الدین“ کا وسیع مفہوم:

اس میں شک نہیں کہ ”تفقه فی الدین“ سے مراد تمام اسلامی معارف و احکام کا حصول ہے چاہے ان کا تعلق اصول دین سے ہو یا فروع دین سے کیونکہ تفقہ کے مفہوم میں یہ تمام امور جمع ہیں لہذا مندرجہ بالا آیت اس بات پر واضح دلیل ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک گروہ ہمیشہ واجب کفائی انجام دینے کے لئے تمام اسلامی مسائل میں تحصیل علم کرے اور فارالتحصیل ہونے کے بعد اسلامی احکام کی تبلیغ کے لئے مختلف علاقوں کی طرف جائے، خصوصاً اپنی قوم اور جمیعت کی طرف آئے اور اسے اسلامی مسائل سے آشنا کرے۔

لہذا مندرجہ بالا آیت کے اسلامی مسائل کے تعلیم و تعلم کے وجوب پر ایک واضح دلیل ہے دوسرے لفظوں میں تعلیم حاصل کرنا بھی واجب ہے اور تعلیم دینا بھی۔ آج کی دنیا اگر جبری تعلیم پر فخر کرتی ہے تو قرآن نے چودہ سو سال پہلے اس سے بھی بڑھ کر معلمین پر بھی یہ کام فرض کیا ہے۔

۴۔ اجتہاد اور تقلید کے جواز پر استدلال:

بعض علماء اسلام نے زیر نظر آیت سے مسئلہ جواز تقلید پر استدلال کیا ہے۔ کیونکہ تعلیمات دین حاصل کرنا اور مسائل فروع کو دوسروں تک پہنچانا اور سننے والوں کے لئے ان کی لازمی طور پر پیروی کرنا یہی تقلید ہے۔ البتہ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ زیر بحث آیت صرف فروع دین سے بحث نہیں کرتی اور اس کے مفہوم میں مسائل اصول بھی شامل ہیں لیکن بہر حال فروع دین اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔

واحد اعتراض جو یہاں نظر آتا ہے یہ ہے کہ اس وقت اجتہاد اور تقلید کی بات نہیں تھی اس زمانے میں جو لوگ مسائل دین سیکھتے اور اسے دوسروں تک پہنچاتے ان کی کیفیت ہمارے زمانے کے مسائل بیان کرنے والے حضرات کی سی نہ تھی نہ وہ مجتہدین کی سی حیثیت رکھتے تھے یعنی پیغمبر اکرم سے مسائل معلوم کر کے بعینہ بغیر کسی قسم کے اظہار نظر کے دوسروں کے سامنے نقل کر دیتے تھے۔

اگر ہم اس طرف توجہ دیں کہ اجتہاد اور تقلید کا ایک وسیع مفہوم ہے تو مندرجہ بالا اعتراض کا جواب مل سکتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ علم فقہ کو جو موجودہ وسعت حاصل ہے یہ اس زمانے میں نہ تھی اور مسلمان آسانی سے پیغمبر اکرم سے مسائل معلوم کر لیتے تھے لیکن اس کے باوجود ایسا نہ تھا کہ تمام بزرگان اسلام ہمارے زمانے کے مسائل بیان کرنے والے حضرات کی طرح ہوں۔ ان میں سے بہت سے افراد قضاوت یا امارت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے دوسری جگہوں کی طرف جایا کرتے تھے۔ فطرتاً انھیں کچھ ایسے مسائل پیش آتے تھے جو بعینہ

انہوں نے پیغمبر اکرم سے نہ سنے تھے۔ لیکن وہ آیات قرآن کے عموماً اور اطلاق سے استفادہ کرتے تھے۔ مسلماً وہ کلیات کی تطبیق پر کرتے تھے۔ عملی اصطلاح میں ”ردّ فروع بر اصول“ اور ”ردّ اصول بر فروع“ سے ان مسائل کے احکام سمجھتے تھے اور یہ ایک قسم کا سادہ اور آسان اجتہاد تھا (غور کیجئے گا)۔

مسلم ہے کہ یہ کام اور ایسے معاملات رسول اللہ کے زمانے میں تھے۔ اس طرح سے اجتہاد کی بنیاد صحابہ میں موجود تھی اگرچہ تمام اصحاب اس میں آتے تھے۔

زیر نظر آیت چونکہ عمومی مفہوم رکھتی ہے لہذا مسائل بیان کرنے والے افراد کی بات قبول کرنے اور مجتہدین کا قول قبول کرنے کے دونوں مفہوم اپنے دامن میں لئے ہوئے۔ اس طرح آیت کی عمومیت سے جوازِ تقلید پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ تعلیم اور تعلّم کی اہمیت: ایک اور اہم مسئلہ جو آیت سے معلوم کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں تعلیم اور تعلّم کا ایک خاص احترام اور اہمیت ہے یہاں تک کہ اسلام مسلمانوں پر لازم قرار دیتا ہے کہ سب کے سب میدانِ جنگ میں شرکت نہ کریں بلکہ ایک گروہ ٹھہر جائے اور معارفِ اسلام حاصل کرے یعنی جہالت کے خلاف جہاد کرنا دشمن کے خلاف جہاد کرنے کی طرح فرض ہے اور ایک کی دوسرے سے کم اہمیت نہیں ہے بلکہ جب تک جہالت کے خلاف جہاد کرنے میں کامیاب نہ ہوں دشمن سے جہاد میں کامیاب نہیں ہو سکتے کوئیکہ جاہل قوم ہمیشہ شکست خوردہ ہوتی ہے۔ ایک معاصر مفسر نے اس آیت کے ذیل میں ایک جالبِ نظریات بیان کی ہے۔

وہ کہتا ہے: ”میں طرابلس میں تحصیلِ علم میں مشغول تھا ایک دن وہاں کا ڈپٹی کمشنر جو معارفِ اسلامی کے بارے میں خود بھی اچھی آگاہی رکھتا تھا، مجھ سے کہنے لگا:-

”حکومت کس بناء پر علماء اور علومِ دینی کے طلباء کو فوجی خدمات سے مستثنیٰ قرار دیتی ہے جب کہ یہ مقدس خدمت شرعی طور پر سب پر واجب ہے اور علومِ دین کے طلبہ اس دینی فریضہ کی انجام دہی کے لئے دیگر لوگوں کی نسبت زیادہ حق رکھتے ہیں، کیا یہ کام غلط نہیں ہے؟“

فوراً زیرِ نظر آیت مجھے یاد آئی اور میں نے بغیر کسی تمہید کے کہا:

”اس معاملے کی بنیاد قرآن میں موجود ہے اور اس سلسلے میں وہ کہتا ہے کہ اگر ایک گروہ جہاد کرے اور ایک گروہ علم حاصل کرے۔“

اسے اس جواب سے بہت لطف آیا، خصوصاً جب کہ اس نے مجھ جیسے ابتدائی طالب علم سے یہ جواب سنا جب کہ میں نے ابھی تازہ تازہ ہی تحصیل علم کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ (المنارج ۱۱ ص ۷۸)۔

۱۔ قرطبی کے مطابق یہ تفسیر طبری نے اپنی تفسیر میں انتخاب کی ہے۔ بعض مفسرین نے بھی احتمال کے طور پر آیت کے ذیل میں اسے ذکر کیا ہے۔

۲۔ توجہ رہے کہ ہمارے نزدیک کسی لفظ کا ایک سے زیادہ معانی میں استعمال صحیح ہے۔

۱۲۳۔ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾۔

ترجمہ

۱۲۳۔ اے ایمان والو! ان کفار کے ساتھ جنگ کرو جو تمہارے زیادہ قریب ہیں (اور دور کا دشمن تمہیں نزدیک کے دشمن سے غافل نہ کر دے) اور وہ تمام میں شدت اور سختی محسوس کریں اور جان لو خدا پر ہمیزگاروں کے ساتھ ہے۔

قریب کے دشمن کی خبر

جہاد کے بارے میں جاری مباحث کے ضمن میں زیر نظر آیت میں دو مزید احکام بیان کئے گئے ہیں۔ پہلے روئے سخن مومنین کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اے ایمان والو! ان کفار سے جنگ کرو جو تمہارے آس پاس ہیں ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ﴾۔

یہ درست ہے کہ تمام دشمنوں کے خلاف جنگ کرنا چاہتے اور اس سلسلے میں کوئی امتیاز نہیں لیکن جنگی ٹینک کے لحاظ سے بلاشبہ پہلے قریب ترین دشمن کے خلاف جنگ کرنا چاہیے۔ کوئیکہ قریب کے دشمن کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے یہ اسی طرح ہے جیسے اسلام کی طرف دعوت دینے اور دین حق کی طرف ہدایت کرنے کے وقت بھی زیادہ نزدیک ہے ان سے آغاز کیا جانا چاہیے۔

رسول اللہ نے حکم خدا سے اپنی دعوت کا آغاز اپنے رشتہ داروں سے کیا تھا اس کے بعد مکہ کے لوگوں کو تبلیغ کی۔ اس کے بعد سارے جزیرہ عرب کی طرف مبلغ بھیجے اور پھر ساری دنیا کے بادشاہوں کو خطوط لکھے اور بلاشبہ طریقہ کامیابی کے زیادہ قریب ہے۔

البتہ ہر قانون میں کچھ استثنائی پہلو ضرور ہوتے ہیں ممکن ہے کچھ ایسے امور خلاف معمول پیش آجائیں کہ دور کا دشمن بہت زیادہ خطرناک ہو لہذا پہلے اس کی سرکوبی کے لئے جانا پڑے لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ ایک استثناء ہے نہ کہ ایک کلی قانون۔

یہ جو ہم نے کہا ہے کہ قریب کے دشمن سے پٹنا زیادہ ضروری ہے اس کے دلائل واضح ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ قریب کے دشمن کا خطرہ دور کے دشمنوں سے زیادہ ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہماری آگاہی اور اطلاعات قریب کے دشمن کے بارے میں زیادہ ہوتی ہیں اور یہ خود کامیابی کے لئے ممد و معاون ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ دور والے دشمن کی طرف جانا اور نزدیک والے دشمن کو آزاد چھوڑ دینا اس خطرے کا باعث بھی ہو سکتا ہے کہ قریب والا دشمن پیچھے سے حملہ کر دے یا مرکز اسلام خالی ہونے کی صورت میں اسے درہم برہم کر دے۔
چوتھی بات یہ ہے کہ نزدیک کے دشمن کے مقابلے میں وسائل اور ساز و سامان نسبتاً کم درکار ہوتا ہے اور قریبی محاذ پر قبضہ کرنا مقابلتاً آسان ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر اور ایسی دیگر وجوہ کے پیش نظر ایسے دشمن کو دفع کرنا زیادہ ضروری ہے۔
اس نکتے کا ذکر بھی بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت زیر نظر آیت نازل ہوئی اس وقت اسلام تقریباً سارے جزیرہ عرب کو اپنے زیر نگیں کر چکا تھا
اس بناء پر اس وقت نزدیک ترین دشمن مشرقی روم کی حکومت ہی تھی کہ جس کے مقابلے کے لئے مسلمان تبوک کی طرف گئے تھے۔

اس بات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ زیر نظر آیت اگرچہ مسلح جنگ اور فاصلہ مکانی کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے لیکن بعید نہیں کہ آیت کی روح منطقی جنگوں اور معنوی فاصلوں کے بارے میں بھی حکم دیتی ہو یعنی مسلمان دشمنوں سے منطقی اور تبلیغاتی مقابلے کے لئے پہلے ایسے لوگوں کا مقابلہ کریں جن کا خطرہ اسلامی معاشرے کے لئے بہت نزدیک ہو۔ مثلاً ہمارے زمانے میں الحاد اور مادیت کا خطرہ تمام معاشروں کو دستک دے رہا ہے۔ لہذا باطل مذاہب سے مقابلے کی نسبت اس کے مقابلے کو مقدم رکھنا چاہیے یہ نہیں کہ انھیں بھلا دیا جائے۔ بلکہ تیز حملے کا رخ زیادہ خطرناک گروہ کی طرف ہونا چاہیے یا مثلاً فکری یا سیاسی اور اقتصادی استعمار سے مقابلے کے پہلے درجے میں رکھنا چاہیے۔

جہاد کے متعلق آیت بالا میں دوسرا حکم شدت عمل کا ہے، آیت کہتی ہے: دشمنوں کو تم میں ایک طرح کی سختی کا احساس ہونا چاہیے ﴿وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً﴾۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ قیام کے لئے اور دشمن کا سختی سے مقابلہ کرنے کے لئے صرف باطنی شجاعت و شہامت اور قلبی آمادگی کافی نہیں ہے بلکہ اپنی اس آمادگی اور شدت کا دشمن کے سامنے اظہار بھی ہونا چاہیے تاکہ اسے معلوم ہو کہ تم میں ایسا جذبہ موجود ہے اور اور یہی چیز اس کی عقب نشینی اور شکست کا

باعث بن جائے اور دوسرے لفظوں میں قوت اور طاقت کا ہونا کافی نہیں ہے بلکہ دشمن کے مقابلے میں طاقت کا اظہار بھی ہونا چاہیئے۔

اسی لئے تاریخ اسلام میں ہے کہ جس وقت مسلمان مکہ میں خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے آئے تو پیغمبر اکرم نے انھیں حکم دیا کہ طواف تیزی کے ساتھ کریں بلکہ ڈوڑیں اور ان دشمنوں کے سامنے جو انھیں دیکھ رہے ہیں شدت و سرعت اور اپنی قوت و طاقت کا مظاہرہ کریں۔

نیز فتح مکہ کے واقعہ میں ہے کہ رسول اللہ نے رات کے وقت حکم دیا کہ سب مسلمان بیابان میں آگ روشن کریں تاکہ مکہ کے لوگ لشکر اسلام کی عظمت اور کثرت سے آشنا ہوں اور ایسا ہی ہوا یہ چیز ان کے دلوں پر اثر انداز ہوئی آپ نے یہ بھی حکم دیا کہ کفار مکہ کے سربراہ ابو سفیان کو ایک جگہ کھڑا کر کے طاقتور لشکر اسلامی کو ایک ایک دستہ کر کے اس کے سامنے سے گزارا جائے۔

آخر میں قرآن مسلمانوں کو ان الفاظ میں فتح و کامرانی کا نوید دیتا ہے: جان لو خدا پرہیزگاروں کے ساتھ ہے ﴿وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾۔ ہو سکتا ہے یہ تعبیر مزید برآں اس طرف بھی اشارہ ہو کہ شدتِ عمل کو پرہیزگاری کے ساتھ ہونا چاہیئے اور حدودِ انسانی سے کسی صورت میں بھی تجاوز نہیں کیا جانا چاہیئے۔

آیات ۱۲۵، ۱۲۴

۱۲۴۔ ﴿وَإِذَا مَا أَنْزَلْتُ سُورَةً فَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ أَتَيْكُمْ زَادَتْهُ هَذِهِ إِيْمَانًا فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِِيْمَانًا وَهُمْ

يَسْتَبْشِرُونَ﴾۔

۱۲۵۔ ﴿وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ كَافِرُونَ﴾۔

ترجمہ

۱۲۴۔ اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض (دوسروں سے) کہتے ہیں کہ اس سورت نے تم سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا ہے۔ (ان سے کہہ دو) جو لوگ ایمان لائے ہیں، اس سے ان کا ایمان بڑھا ہے اور وہ (خدا کے فضل و کرم سے) خوش ہیں۔

۱۲۵۔ لیکن جن کے دلوں میں بیماری ہے ان کی ناپاکی ہی کا اضافہ ہوا ہے اور وہ دنیا سے اس حالت میں گئے ہیں کہ وہ کافرتھے۔

آیات قرآنی کی تاثیر۔ پاک اور ناپاک دلوں پر

منافقین اور مومنین کے بارے میں گزشتہ مباحث کی مناسبت سے ان دو آیات میں ان دونوں گروہوں کی ایک واضح نشانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو بعض منافقین ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ یہ سورت نازل ہونے سے تم میں سے کس کا ایمان بڑھا ہے ﴿وَإِذَا مَا أَنْزَلْتُ سُورَةً فَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ أَتَيْكُمْ زَادَتْهُ هَذِهِ إِيْمَانًا﴾۔^(۱)

ایسی باتیں کر کے وہ قرآن کی سورتوں کی عدم تاثیر اور ان کے بارے میں بے اعتنائی کا اظہار کرنا چاہتے تھے وہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ یہ آیات کسی اہم اور قابل توجہ مفہوم کی حامل نہیں ہیں۔ لیکن قرآن انھیں قطعی لب و لہجہ میں جواب دیتا ہے اور لوگوں کے دو گروہوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتا ہے: رہے وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، تو ان آیات کا نزول ان کے ایمان میں اضافہ کرتا ہے اور ان کے چہروں سے مسرت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِِيْمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ﴾۔ ”لیکن جن جن کے دلوں میں نفاق، جہالت اور عناد اور حسد کی بیماری ہے ان کی ناپاکی پر ایک ناپاکی کا اضافہ ہو جاتا ہے“ ﴿وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ﴾۔ آخر کار وہ کفر اور بے ایمانی کی حالت میں اس دنیا سے جائیں گے ﴿وَمَاتُوا وَهُمْ كَافِرُونَ﴾۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ قرانی آیات کے مختلف لوگوں پر مختلف اثرات:

قرآن کی مندرجہ بالا دو آیت اس حقیقت کی تاکید کرتی ہیں کہ صرف حیات بخش تعلیمات اور اچھا لائحہ عمل ہی کسی فریادگروہ کی سعادت کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کے مقدمات کی فراہمی اور بیادوں کا مہیا ہونا بھی ایک بنیادی شرط سمجھا جانا چاہیے۔

قرآنی آیات بارش کے حیات بخش قطروں کی طرح ہیں جو باغ میں سبزہ زار اگاتے ہیں تھوڑی زمین میں خص و خاشاک۔

جو لوگ تعلیم اور ایمان کے جذبے سے اور حقیقت سے عشق کے ساتھ ان کی طرف دیکھتے ہیں وہ ہر سورت بلکہ ہر آیت سے نیا درس لیتے ہیں۔ جو ان کے ایمان کی پرورش کرتا ہے اور ان میں انسانیت کی واضح صفات کو تقویت پہنچاتا ہے۔ لیکن جو لوگ ہٹ دھرمی، غرور اور نفاق کے تاریک شیشوں کے پیچھے ان آیات کی طرف دیکھتے ہیں وہ نہ صرف ان سے فائدہ اٹھاتے بلکہ ان کے کفر اور عناد کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں ہر نئے فرمان کے بارے میں وہ نئی نافرمانی اور نیا گناہ کرتے ہیں، ہر حکم کے بارے میں نئی سرکشی اور ہر حقیقت کے سامنے نئی ہٹ دھرمی کرتے ہیں اس طرح ان کے وجود میں عصیان، نافرمانیاں اور ہٹ دھرمیاں تہ در تہ جمع ہو جاتی ہیں اس طرح ان کی روح میں ان بری صفات کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں آخر کار وہ حالت کفر میں مر جاتے ہیں اور واپسی کا راستہ ان کے لئے بالکل بند ہو جاتا ہے۔

ایک اور تعبیر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی تربیتی پروگرام میں فاعل کی فاعلیت کافی نہیں ہے بلکہ روح قبولیت اور قابل کی قابلیت بھی بنیادی شرط ہے۔

۲۔ ”رجس“ کا مفہوم:

لغت میں ”رجس“ کا معنی ہے ”پلید“ اور ”ناپاک“ وجود اور راغب نے اپنی کتاب مفردات میں لکھا ہے کہ پلیدی چار قسم کی ہے۔

۱۔ طبیعت کے لحاظ سے، ۲۔ عقل و فکر کے زاویہ سے،

۳۔ شریعت کے حوالے سے اور ۴۔ کبھی تمام پہلوؤں سے۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ وہ پلیدی جو نفاق، ہٹ دھرمی اور حق کے مقابلے میں شدت سے پیدا ہوتی ہے، ایک قسم کی باطنی اور معنوی ناپاکی ہے جس کا اثر آخر کار انسان کے تمام وجود، گفتار اور کردار میں ظاہر ہوتا ہے۔

۳۔ ”وہم یستبشرون“ کا مطلب:

لفظ ”بشارت“ کی اصل کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ جملہ ایسے سور اور خوشی کے آثار ان کے چہرے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیات قرآنی کا تربیتی اثر مومنین میں اس قدر آشکار تھا کہ اس کی علامات فوراً انکے چہروں میں نمایاں ہو جاتی تھیں۔

۴۔ دل کی بیماری:

مندرجہ بالا آیات میں نفاق اور اس کی گندگی صفات کو دل کی بیماری کہا گیا ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ ”قلب“ ایسے موقع پر روح اور عقل کے معنی میں ہے اور دل کی بیماری ان موقع رذائل اور روحانی انحرافات کے معنی میں ہے اور یہ تعلیم نشاندہی کرتی ہے کہ انسان کی روح اور عقل اگر صحیح و سالم ہو تو ان پر بری صفات میں سے کوئی بھی اس کے وجود میں اپنی جڑیں پیدا نہیں کر سکتی اور ایسا اخلاق جسمانی بیماری کی طرح طبیعت کے برخلاف ہوگا۔ لہذا ایسی صفات سے آلودگی اصلی طبعی راستے سے انحراف اور روحانی بیماری کی دلیل نہیں ہیں۔ ۲

۵۔ ایک درس:

مندرجہ بالا آیت ہم سب مسلمانوں کو ایک عجیب درس دیتی ہے یہ آیات اس حقیقت کی ترجمانی کرتی ہیں کہ جب کوئی قرآنی سورت نازل ہوتی ہے تو پہلے مسلمانوں میں ایک تازہ روح پیدا ہو جاتی تھی اور انھیں نئی تربیت حاصل ہوتی تھی، اس طرح کہ اس کے آثار بہت جلد ان کے چہروں سے نمایاں ہو جاتے تھے حالانکہ آج کل ہم بظاہر مسلمان افراد کو دیکھتے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ ایک سورت پڑھ کر ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ قرآن ختم کر کے بھی ان پر تھوڑا سا اثر بھی دکھائی نہیں دیتا۔

تو کیا قرآن کی سورتیں اور آیتیں اپنا اثر کھو بیٹھی ہیں یا پھر افکار کی آلودگی، دلوں کی بیماری اور ہمارے برے اعمال کے حجابوں نے ہمارے دلوں کو اثر پذیر بنا دیا ہے ایسی حالت پر ہمیں خدا سے پناہ مانگنا چاہیے اور اس کے درگاہ پاک سے پہلے وقت کے مسلمانوں کے دل عطا ہونے کی دعا کرنا چاہیے۔

۱۔ اذا ما انزلت "میں لفظ "ما" در حقیقت "مازائدہ" ہے اور تاکید کے لئے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ "ماصلہ" ہے جو حرف شرط یعنی "اذا" کو اس کی جزا پر مسلط کرتا ہے اور جملے کی تاکید کرتا ہے۔

۲۔ دل کی بیماری اور قرآن میں اس کے مفہوم کے بارے میں ہم جلد اول ص ۹۹ (اردو ترجمہ) پر ایک اور بحث کر چکے ہیں۔

آیات ۱۲۶، ۱۲۷

۱۲۶۔ ﴿أُولَٰئِكَ يَرْوُونَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذْكُرُونَ﴾۔

۱۲۷۔ ﴿وَإِذَا مَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ هَلْ يَرَاكُمْ مِنْ أَحَدٍ ثُمَّ انصَرَفُوا صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ

لَا يَفْقَهُونَ﴾۔

ترجمہ

۱۲۶۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ سال میں ایک یا دو مرتبہ ان کی آزمائش ہوتی ہے پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے اور متوجہ نہیں ہوتے۔

۱۲۷۔ اور جس وقت کوئی سورت نازل ہوتی ہے ان (منافقین) میں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں کہ کیا تمہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا؟ (اور اگر ہم بارگاہ پیغمبر سے باہر چلے جائیں تو کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں ہوگا) اس کے بعد وہ لوٹ جاتے ہیں (اور باہر چلے جاتے ہیں) خدا نے ان کے دلوں کو حق سے پھیر دیا ہے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں ہیں (اور بے علم ہیں)۔

تفسیر

ان آیات میں بھی منافقین کے بارے میں گفتگو جاری ہے اور انھیں سرزنش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ انھیں آزمایا جاتا ہے ﴿أُولَٰئِكَ يَرْوُونَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ﴾۔ تعجب کی بات ہے کہ ان پے درپے آزمائشوں کے باوجود غلط راستوں پر چلنے سے بعض نہیں آتے اور توبہ نہیں کرتے اور متذکر نہیں ہوتے ﴿ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذْكُرُونَ﴾۔

اس سلسلے میں اس آزمائش سے کیا مراد ہے جس کا سالانہ ایک یا دو مرتبہ تکرار ہوتا ہے۔ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض انھیں بیماریاں قرار دیتے ہیں۔

بعض بھوک، ننگ اور دوسری سختیاں مراد لیتے ہیں۔

بعض جہاد کے میدانوں میں عظمتِ اسلام کے آثار اور حقانیتِ پیغمبر کا مشاہدہ سمجھتے ہیں کیونکہ منافقین ماحول کی مجبوری کے باعث ان میں شریک ہوتے ہیں۔

بعض منافقین کے بھید کھل جانا مراد لیتے ہیں۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آیت کے آخر میں ہے کہ ”وہ متذکر نہیں ہوتے“ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کوئی ایسی آزمائش ہونا چاہیے جو ان لوگوں کی بیداری کا باعث ہو۔

نیز تعبیر آیت سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزمائش ان عمومی آزمائشوں سے الگ ہے جن کا عام لوگوں میں اپنی زندگی میں سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس امر کی طرف توجہ کرتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ چوتھی تفسیر یعنی ان کے برے اعمال سے پردہ اٹھنا اور ان کے باطن کا ظاہر ہونا، آیت کے مفہوم سے زیادہ قریب ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ زیر بحث آیت میں آزمائش ایک جامع مفہوم رکھتی ہو جس میں یہ تمام امور شامل ہوں۔
ان کے بعد انکار آمیز حرکات کی طرف اشارہ کیا گئی ہے جو وہ آیاتِ خداوندی سن کر کیا کرتے تھے، ارشاد ہوتا ہے:
جب کوئی قرآن کی سورت نازل ہوتی ہے تو وہ اس کے بارے میں حقارت اور انکار کی نظر سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے وہ آنکھوں کی حرکات سے ظاہر کرتے ہیں کہ انھیں کس قدر پریشانی ہے ﴿وَإِذَا مَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ﴾۔

انھیں تکلیف اور پریشانی اس وجہ سے ہے کہ کہیں اس سورت کا نزول ان کے لئے کوئی نئی رسوائی اور ذلت فراہم نہ کر دے یا اس وجہ سے ہے کہ کور باطنی کے باعث وہ اس میں سے کچھ سمجھ نہیں پاتے اور انسان اس چیز کا دشمن ہے جسے وہ نہیں جانتا۔

بہر حال وہ پختہ ارادہ کر لیتے ہیں کہ مجلس سے باہر نکل جائیں تاکہ یہ آسمانی زمزمے نہ سنیں البتہ انھیں اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں نکلتے وقت کوئی انھیں دیکھ نہ لے لہذا آہستہ سے ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ کوئی ہماری طرف متوجہ تو نہیں ہے ”کیا کوئی تمہیں دیکھ رہا ہے“ ﴿هَلْ يَرَاكُمْ مِنْ أَحَدٍ﴾۔ جب انھیں اطمینان ہو جاتا ہے کہ لوگ پیغمبر اکرم کی گفتگو سننے میں مشغول ہیں اور ان کی طرف متوجہ نہیں ہیں تو وہ مجلس سے باہر نکل جاتے ہیں ﴿ثُمَّ انصَرَفُوا﴾۔

”﴿هَلْ يَرَاكُمْ مِنْ أَحَدٍ﴾“ (کیا کوئی تمہیں دیکھ رہا ہے)۔ یہ جملہ وہ زبان سے کہتے یا آنکھوں کے اشارے سے اشارے کی صورت میں ”نظر بعضهم الی بعض“ کا جملہ اس کے ساتھ مل کر ایک ہی مفہوم بیان کرتا ہے اور حقیقت میں ”هل یراکم من احد“ ان کے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی تفسیر ہے۔

آیت کے آخر میں اس بات کی علت کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ کلماتِ خدا سننے پر اس لئے بے کیف اور پریشان ہوتے ہیں کہ ”خدا نے ان کے دلوں کو ان کی ہ دھرمی، عناد اور گناہوں کی وجہ سے حق سے پھیر دیا ہے (اور وہ حق سے دشمنی اور عداوت رکھتے ہیں) کیونکہ وہ بے فکر اور نا سمجھ افراد ہیں ﴿صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ﴾۔

”﴿صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ﴾“ کے بارے میں مفسرین نے دو احتمالات ذکر کئے ہیں:

پہلا یہ جملہ خبریہ ہے جیسا کہ ہم نے اوپر تفسیر کی ہے اور،

دوسرا یہ کہ یہ جملہ انشائیہ ہے اور نفیرین اور بدعا کے معنی میں ہے یعنی خدا نے ان کے دل حق سے منحرف کر دئے

ہیں۔

لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح دکھائی دیتا ہے۔

آیات ۱۲۸، ۱۲۹

۱۲۸۔ ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾۔

۱۲۹۔ ﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴾۔

ترجمہ

۱۲۸۔ تم میں سے تمہاری طرف رسول آیتا کہ جسے تمہاری تکالیف اور رنج و الم ناگوار ہیں اور جو تمہاری ہدایت پر اصرار کرتا ہے اور مومنین پر روف و مہربان ہے۔

۱۲۹۔ اگر وہ (حق سے) منہ پھیر لیں (تو تم پریشان نہ ہو جانا) کہہ دو کہ خدا میری کفایت کرے گا۔ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے میں نے اس پر تو کہ کیا ہے اور وہ عرش عظیم کا پروردگار (اور مالک) ہے۔

نازل ہونے والی آخری آیات

بعض مفسرین کے بقول زیر نظر آیات رسول اللہ پر نازل ہونے والی آخری آیات ہیں۔ سورہ ہرات ان پر ختم ہو رہی ہے۔ یہ آیات فی الحقیقت ان تمام مسائل کی طرف اشارہ ہیں جو اس سورہ میں گزر چکے ہیں، کیونکہ، ایک طرف تو ان میں تمام لوگوں کو چاہے وہ مومن ہوں، یا منافق کہا گیا ہے کہ پیغمبر اور قرآن کی طرف سے سخت گیریاں اور ظاہری سختیاں جن کے نمونے اس سورہ میں آئے ہیں سب اس لئے ہیں کہ پیغمبر کو ان کی ہدایت، تربیت، تکامل اور ارتقاء سے عشق ہے۔

دوسری طرف پیغمبر اکرم کو بھی خبر دی گئی ہے کہ وہ لوگوں کی سرکشی اور نافرمانیوں پر جن کے بہت سے واقعے اس سورہ میں گزرے ہیں پریشان اور کبیدہ خاطر نہ ہوں اور یہ یقین رکھیں کہ خداوند عالم ہر حالت میں ان کا پشتیبان، دوست اور یار رہے۔

لہذا پہلی آیت میں روئے سخن لوگوں کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: پیغمبر جو خود تمہی سے ہے تمہاری طرف آیا ہے ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ﴾۔

آیت میں ”منکم“ کی بجائے ”من انفسکم“ یہ خصوصیت سے پیغمبر اکرم کے لوگوں سے شدت ارتباط کی طرف اشارہ ہے گویا وہ خود لوگوں کی جان کا ایک ٹکڑا ہے اور معاشرے کی روح کا ایک حصہ پیغمبر کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے تمام دکھ درد جانتا ہے، ان کی مشکلات سے آگاہ ہے اور پریشانی اور غم و اندوہ میں ان کا شریک ہے۔

ان حالات میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ان کے فائدے کے سوا کوئی بات کہے اور حقیقت میں یہ پیغمبر کی پہلی صفت ہے جو مندرجہ بالا آیات میں پیغمبر اکرم کے لئے ذکر ہوئی ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ بعض مفسرین جو نسلی اور عربی تعصبات کے زیر اثر تھے انھوں نے کہا ہے کہ اس آیت میں مخاطب عرب نسل کے لوگ ہیں یعنی پیغمبر اس نسل میں سے تمہاری طرف آیا ہے۔ ہمارے نظریے کے مطابق اس آیت کے لئے ذکر ہونے والی یہ بدترین تفسیر ہے۔

کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ چیز کا قرآن میں ذکر تک نہیں ہے وہ نسل پرستی ہے کوینکہ قرآن میں تمام جگہوں پر ”یا ایہا الناس“، ”یا ایہا الذین آمنوا“ اور اس قسم کے دیگر الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے اور کسی جگہ پر بھی ”یا ایہا العرب“ اور ”یا قریش“ وغیرہ کا وجود نہیں ہے۔

اس کے علاوہ آخری حصہ میں ارشاد ہوتا ہے: وہ مومنین پر روف اور مہربان ہے ”بالمومنین روف رحیم“ یہ جملہ بھی وضاحت سے اس کی تفسیر کی نفی کرتا ہے کیونکہ تمام مومنین کے بارے میں ہے چاہے وہ کسی قوم و ملت اور کسی نسل و خاندان سے ہوں۔

افسوس کا مقام ہے کہ بعض متعصب علماء قرآن کو اس کے عالمی اور انسانی مرتبے سے نیچے لے آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسے چھوٹے سے نسلی دائرے میں محصور اور محدود کر دیا جائے۔

بہر حال ”من انفسکم“ کی صفت بیان کرنے کے بعد رسول اللہ کی چار ممتاز صفات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ صفات لوگوں کے میلانات کی تحریک کے لئے ان کے احساس و جذبات کو جذب کرنے کے لئے گہرا اثر رکھتی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: تمہیں کوئی بھی تکلیف، ضرر اور نقصان پہنچے، پیغمبر کے لئے سخت اور ناراضی کا باعث ہے (ع) ﴿زَبْرٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾۔ یعنی وہ نہ صرف تمہاری تکلیف سے خوش نہیں ہوتا بلکہ وہ اس تکلیف سے الگ نہیں رہ سکتا، تمہارے رنج و غم سے رنجیدہ ہوتا ہے اور اگر تمہاری ہدایت اور طاقت فرسا، پر زحمت جنگوں پر اصرار کرتا ہے تو وہ بھی تمہاری نجات اور ظلم، گناہ اور بد بختی کے چنگل سے تمہاری رہائی کے لئے ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ”وہ تمہاری ہدایت سے سخت لگاؤ رکھتا ہے“ اور تمہاری ہدایت سے عشق رکھتا ہے ﴿حَرِیصٌ عَلَیْکُمْ﴾۔

لغت میں ”حرص“ کا معنی ہے ”کسی چیز سے شدید لگاؤ رکھنا“۔ یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ زیرِ بحث میں بطور اطلاق کہا گیا ہے کہ ”تم پر حرص ہے“ نہ ہدایت کے بارے میں بات کی گئی ہے اور نہ ہی کسی اور چیز کے بارے میں۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اسے تمہاری ہر طرح کی سعادت پیش رفت، ترقی اور خوش بختی سے عشق ہے (اصطلاح میں کہتے ہیں کہ ”متعلق کا خذف ہونا عموم کی دلیل ہے“)۔ اس کے بعد تیسری اور چوتھی صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وہ مومنین کے لئے روف و رحیم ہے ﴿بِالْمُؤْمِنِينَ رُؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾۔

لہذا اگر وہ مشکل اور طاقت فرسا حکم دیتا ہے تو یہ بھی اس کی طرف سے ایک طرح کی محبت اور لطف ہے یہاں تک کہ گرمیوں کے موسم میں طاقتور دشمن کے مقابلے میں جنگِ تبوک کے لئے بھوک اور پیاس کے ساتھ طویل اور جلانے والے بیابانوں سے گزرنا بھی اس کے مہر و محبت کی علامت ہے۔

”روف“ اور ”رحیم“ میں کیا فرق ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہترین تفسیر یہ ہے کہ روف فرمانبرداروں کے لئے مخصوص محبت و لطف کی طرف اشارہ ہے جب کہ رحیم گناہ گاروں کے لئے رحمت کی طرف اشارہ ہے۔

البتہ اس بات کا فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ دونوں الفاظ جب الگ الگ ہوں ہو تو ہو سکتا ہے کہ ایک ہی معنی میں استعمال ہوں لیکن جہاں ایک دوسرے کے ساتھ استعمال ہوں تو بعض اوقات دو مختلف معانی دیتے ہیں۔ بعدِ الی آیت میں جو کہ اس سورہ کی آخری آیت ہے، پیغمبر اکرم کی دلجوئی کرتے ہوئے کہ وہ لوگوں کی سرکشیوں اور نافرمانیوں سے ملول نہ ہوں فرمایا گیا ہے: اگر حق سے منہ نہ پھیر لیں تو پریشان نہ ہو اور کہہ دے کہ ”خدا میرے لئے کافی ہے“ کیونکہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ﴾۔

”وہی خدا کہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے“ لہذا وہی اکیلا پناہ گاہ ہے ﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾۔ جی ہاں میں نے صرف اسی معبود پر تکیہ کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی دل باندھا ہے اور اپنے کام اسی کے سپرد کئے ہیں ﴿عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ﴾۔

اور وہی عرشِ عظیم کا مالک اور پروردگار ہے ﴿وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴾۔ عرش، عالم بالا ماوائے طبیعت اپنی پوری عظمت کے ساتھ اس کے قبضہ قدرت میں ہے اور اس کی حمایت و کفالت میں ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ وہ مجھے اکیلا چھوڑ دے اور دشمن کے مقابلے میں میری مدد کرے؟ کیا کوئی قدرت اس کی

قدرت کے مقابلے میں ٹھہر سکتی ہے یا کوئی رحمت و مہربانی اس کی رحمت و مہربانی اس کی رحمت و مہربانی سے بالاتر تصور ہو سکتی ہے۔

خدا یا! اس وقت جبکہ ہم یہ سورہ ختم کر رہے ہیں اور یہ سطور لکھ رہے ہیں دشمنوں نے ہمیں ہر طرف سے گھیر رکھا ہے اور ہماری رشید اور بہادر قوم ظلم، برائی اور استبداد کے خاتمے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی ہے، تمام صفوں اور طبقوں میں ایسا بینظیر اتحاد و اتفاق پیدا ہو گیا ہے جس کا تصور نہیں ہوتا تھا یہاں تک کہ ننھے ننھے بچے بھی اس جہاد میں شریک ہیں اور کوئی بھی کسی قسم کی فداکاری اور قربانی سے دریغ نہیں کر رہا ہے۔

پروردگار! تو ان تمام چیزوں کو جانتا ہے اور دیکھتا ہے، ت و مہر و محبت کا مرکز ہے تو نے مجاہدین سے کامیابی اور کامرانی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ پس اپنی نصرت و مدد قریب کر دے اور ہمیں آخری اور مکمل فتح عطا فرما اور ان پیاسوں اور عاشقوں کو ایمان، عدل اور آزادی کے شفاف پانی سے سیراب فرما ﴿انک علی کل شیء قدیر﴾ (تو ہر چیز پر قادر ہے)

— (۱)

۱۔ یہ حصہ انقلاب اسلامی حکومت کے قیام سے پہلے شاہ کے خلاف قیام کے زمانے میں لکھا گیا ہے۔

سورہ یونس

اس سورہ کے مضامین اور فضیلت

یہ سورۃ مکی ہے، بعض مفسرین کے بقول سورہ بنی اسرائیل کے بعد اور سورہ ہود سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ دیگر مکی سورتوں کی طرح یہ بھی چند اصولی اور بنیادی مسائل پر مشتمل ہے ان میں سے سب سے اہم مبداء اور معاد کا مسئلہ ہے البتہ پہلے وحی اور مقام پیغمبر کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اس کے بعد عظمت آفرینش کی نشانیاں بیان کی گئی ہیں جو کہ عظمت خدا کی علامت ہیں۔ بعد ازاں لوگوں کو مادی زندگی کی ناپائیداری اور دار آخرت کی طرف متوجہ کیا ہے اور اس کے لئے ایمان اور عمل صالح کے ذریعے تیاری پر ابھارا گیا ہے۔ انہی مسائل کی مناسبت سے بزرگ انبیاء کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً حضرت نوح، حضرت موسیٰ اور حضرت یونس علیہم السلام کے تذکرے ہیں۔ اسی حوالے سے سورہ کا نام سورہ یونس رکھا گیا ہے۔

اس کے بعد مذکورہ مباحث کی تائید کے لئے بت پرستوں کی ہٹ دھرمی اور سخت مزاجی کا ذکر ہے۔ ہر جگہ خدا کا حضور و شہود ان کے لئے ثابت کیا گیا ہے خصوصیت سے اس مسئلہ کے اثبات کے لئے ان کی فطرت کی آگاہی سے مدد لی گئی ہے۔ وہی فطرت کہ جو مشکلات کے وقت ظاہر ہوتی ہے اور وہ خدائے یکتا کو یاد کرتے ہیں۔

اسی لئے امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت میں مروی ہے:

من قرء سورۃ یونس فی کل شہرین او ثلاثہ لم یخف علیہ ان یکون من الجاہلین وکان یوم القیامۃ من المقربین۔
جو شخص سورہ یونس ہر دو یا تین ماہ میں ایک دفعہ پڑھے تو اس کے لئے یہ خوف نہیں کہ وہ جاہلوں میں سے قرار پائے۔
نیز قیامت کے دن وہ مقربین میں سے ہوگا۔^(۱)

یہ اس بناء پر ہے کہ اس سورہ میں خبردار اور بیدار کرنے والی بہت سی آیات ہیں اور اگر انہیں غور و خوض سے پڑھا جائے تو جہالت کی تاریکی انسانی روح سے دور کر دیتی ہیں اور اس کے اثرات کم از کم چند ماہ تک انسان کے وجود میں رہتے ہیں اور اگر سورہ کے مضامین کو سمجھنے کے علاوہ ان پر عمل بھی کیا جائے تو یقینی طور پر قیامت کے دن پڑھنے والا مقربین کے زمرہ میں قرار پائے گا۔

شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ سورتوں کے فضائل جیسا کہ ہم کہ پہلے بھی کہہ چکے ہیں، صرف آیات کی تلاوت سے بغیر معانی سمجھے اور بغیر اس کے مضامین پر عمل کیے فراہم نہیں ہوتے۔
کیونکہ تلاوت سمجھنے کا مقدمہ اور سمجھنا عمل کرنے کی تمہید ہے۔

۱ تفسیر نور الثقلین ج ۲ ص ۲۹۰ اور دیگر تفاسیر

آیات ۱،۲

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿الر تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ﴾۔

۲۔ ﴿أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَى رَجُلٍ مِنْهُمْ أَنْ أَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ

قَالَ الْكَافِرُونَ إِنَّ هَذَا لَسَاحِرٌ مُبِينٌ﴾۔

ترجمہ

بخشنے والے مہربان خدا کے نام سے۔

۱۔ ل.ر. وہ کتاب حکیم کی آیات ہیں۔

۲۔ کیا یہ چیز لوگوں کے لیے باعث تعجب ہے کہ ان میں سے ایک کی طرف ہم نے وحی بھیجی کہ لوگوں کو ڈراؤ۔ اور جو ایمان لائے ہیں انھیں بشارت دو کہ ان کے لئے ان کے پروردگار پاس مسلم جزا ہے۔

تفسیر

اس سورہ میں پھر ہمیں حروف مقطعات کا سامنا ہے اور یہ ہیں الف، لام اور راء۔ سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ اعراف کی ابتداء میں ہم ایسے حروف کے بارے میں کافی بحث کر چکے ہیں۔ آئندہ بھی انشاء اللہ اس سلسلے میں مناسب موقع پر بحث کریں گے، اور اس میں نئے مطالب کا اضافہ کریں گے۔

حروف مقطعات کے بعد پہلے آیات قرآن کی عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:- وہ کتاب حکیم کی

آیات ہیں۔ ﴿الر تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ﴾

”یہ“ (اسم اشارہ قریب کی) بجائے ”وہ“ (اسم اشارہ بعید) سے ابتداء کی گئی ہے اس کی نظیر سورہ بقرہ کی ابتدا میں بھی موجود ہے یہ قرآن کریم کی لطیف تعبیرات میں سے شمار ہوتی ہے اور یہ قرآن کریم کے مفاہیم کی عظمت اور بلندی کے لئے کنایہ ہے۔ کیونکہ سامنے پڑے ہوئے اور عام مطالب کے لئے زیادہ تر اسم اشارہ قریب استعمال کیا جاتا ہے لیکن اہم مطالب جو بلند سطح کے ہوں جو گویا آسمانوں کی بلندی میں ایک افق اعلیٰ میں موجود ہیں انھیں اسم اشارہ بعید کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور اتفاق کی بات ہے کہ ہم روزمرہ کی تعبیرات میں بھی ایسی تعبیر استعمال کرتے ہیں مثلاً بعض

اشخاص کی عظمت کے اظہار کے لیے ”آجنباب“ یا ”آنحضرت“ استعمال کرتے ہیں اگرچہ وہ پاس ہی بیٹھے ہوں لیکن انکساری کے اظہار کے لئے ”ایجنباب“ کہا جاتا ہے۔

آسمانی کتاب یعنی قرآن کی تعریف کے لئے لفظ ”حکیم“ استعمال کیا گیا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آیت قرآنی استحکام نظم و ضبط اور حساب و کتاب کی حامل ہیں اور ہر قسم کے باطل سے، فضول باتوں سے اور ہزل گوئی سے دور ہیں اور قرآن حق کے سوا کچھ نہیں کہتا اور سوائے راہ حق کے کسی چیز کی دعوت نہیں دیتا۔

اس اشارے کی مناسبت سے جو پہلی آیت میں قرآن مجید میں وحی آسمانی کے لئے ہے دوسری آیت میں رسول اللہ کے بارے میں مشرکین کا ایک اعتراض بیان کیا گیا ہے یہ وہی اعتراض ہے جس کا قرآن مجید میں کئی مرتبہ ذکر کیا گیا ہے اس کا تکرار نشان دہی کرتا ہے کہ مشرکین یہ اعتراض بار بار کیا کرتے تھے اور وہ یہ کہ آسمانی وحی کیوں خدا کی طرف سے ایک انسان پر نازل ہوئی ہے اور عظیم رسالت کی یہ ذمہ داری کسی فرشتے کے ذمہ کیوں نہیں ہوئی۔

ایسے سوالات کے جواب میں قرآن کہتا ہے کیا لوگوں کے لئے یہ امر باعث تعجب ہے کہ ہم نے ان میں سے ایک شخص کی طرف وحی بھیجی ہے۔ ﴿أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ رَجُلٍ مِّنْهُمْ﴾

در حقیقت ان کے اعتراض کا جواب لفظ ”منہم“ (ان کی نوع سے) کے ذریعہ دیا گیا ہے یعنی اگر رہبر و راہنما اپنے پیرو کاروں کا ہم نوع ہو اور ان کے درد اور تکالیف کو جانے اور ان کی ضروریات سے آگاہ ہو تو کوئی تعجب کا مقام تو نہیں ہے بلکہ تعجب کا مقام تو یہ ہے کہ انکی نوع میں سے نہ ہو اور ان کی کیفیت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے ان کی رہبری نہ کر سکے۔

اس کے بعد اس آسمانی وحی سے مضمون کا دو چیزوں میں خلاصہ بیان کیا گیا ہے پہلی یہ کہ ہم نے تیری طرف وحی کی تاکہ لوگوں کو کفر و گناہ کے انجام سے ڈراو ﴿أَنْ أُنْذِرَ النَّاسَ﴾۔ اور دوسرا یہ کہ ”صاحب ایمان افراد کو بشارت دو کہ ان کے لئے بارگاہ خدا میں ”صدق ہے“ ﴿أَنْ أُنْذِرَ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾

”قدم صدق“ سے کیا مراد ہے، اس سلسلہ میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن ان کی پیش کردہ تمام تفاسیر میں سے تین ایسی ہیں جن میں سے ایک تفسیر قابل قبول ہے یا پھر تینوں اکٹھی قبول کی جا سکتی ہیں۔

پہلی یہ کہ اس طرف اشارہ ہے کہ ایمان ”فطری سابقہ“ رکھتا ہے اور حقیقت میں مومنین نے ایمان کو ظاہر کر کے اپنے تقاضائے فطرت کی تصدیق اور تاکید کی ہے (کیونکہ ”ودم“ کا ایک معنی ”سابقہ“ ہے) جیسا کہ کہتے ہیں:

لفلان قدم فى الاسلام او قدم فى الحرب -

یعنی ---- فلاں شخص اسلام یا جنگ میں سابقہ رکھتا ہے -

دوسری ---- یہ کہ یہ مسئلہ معاد و قیامت اور آخرت کی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ”قدم“ کا ایک معنی ”مقام“ اور ”منزلت“ بھی ہے (اس مانسبت سے کہ انسان اپنے پاؤں کے ساتھ اپنی منزل میں داخل ہوتا ہے) یعنی صاحب ایمان افراد کے لئے خدا کی بارگاہ میں مسلما اور یقینا مقام و منزلت ہے کہ جسے کوئی چیز متغیر نہیں کر سکتی -

تیسری ---- یہ کہ ”قدم“ پیشوا اور رہبر کے معنی میں ہے یعنی مومنین کے لئے سچا پیشوا اور رہبر بھیجا گیا ہے اس آیت کے ذیل میں سنی شیعہ تفاسیر میں متعدد روایات میں ”قدم صدق“ کی تفسیر پیغمبر اکرم کی ذات یا ولایت علی سے کی گئی ہے یہ روایات اس معنی کی موید ہیں -^(۱)

جیسا کہ ہم نے کہا ہے، ہو سکتا ہے اس تعبیر کا مقصد ان تمام امور کی بشارت دینا ہو -

آیت کے آخر میں پھر ایک ایسے اتہام کی طرف اشارہ ہے جو مشرکین بارہا رسول اللہ پر باندھتے تھے ارشاد ہوتا ہے:

کافر کہتے ہیں کہ یہ شخص واضح جادو گر ہے۔ ﴿قَالَ الْكَافِرُونَ إِنَّ هَذَا لَسَاحِرٌ مُّبِينٌ﴾

لفظ ”ان“ لام تاکید اور صفت ”مبین“ یہ سب اس تاکید کی علامت ہے جو وہ اس تہمت کے بارے میں کرتے تھے اور ”هذا“ (جو کہ اسم اشارہ قریب ہے) کی تعبیر اس لئے تھی کہ وہ مقام پیغمبر کی تحقیر کریں - رہا یہ سوال کہ وہ پیغمبر اکرم کی طرف جادو کی نسبت کیوں دیتے ہیں، تو اس کا جواب واضح ہے کیونکہ آپ کی پر اعجاز باتوں، درخشاں منصوبہ جات، روشن قوانین اور دیگر معجزات کا ان کے پاس کوئی اطمینان بخش جواب نہیں تھے - سوائے اس کے کہ ان کی خارق عادت اور غیر معمولی ہونے کو وہ جادو قرار دے دیں تاکہ اس طرح وہ سادہ لوح افراد پر جہالت کا پردہ ڈال سکیں - رسول اللہ کے دشمن کی طرف سے ایسی تعبیریں خود اس بات کی دلیل ہیں کہ آپ کے کام خارق عادت اور غیر معمولی تھے جو لوگوں کے قلب و نظر کو اپنی طرف جذب کر لیتے تھے - خصوصاً ان کا قرآن مجید کو جادو قرار دینا اس بات کا زندہ شاہد ہے کہ وہ اس آسمانی کتاب کی انتہائی قوت جاذبہ سے لوگوں کو دور رکھنے کے لئے اس تہمت کا سہارا لیتے تھے -

انشاء اللہ متعلقہ آیات کے ذیل میں اس سلسلے میں ہم پھر گفتگو کریں گے -

آیات ۳، ۴

۳۔ ﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ﴾۔

۴۔ ﴿إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ﴾۔

ترجمہ

۳۔ تمہارا پروردگار وہ خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا اس کے بعد عرش (قدرت) پر بقرار ہوا اور (عالم کے) کام کی تدبیر کی۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا نہیں۔ یہ ہے خدا تمہارا پروردگار، پس اس کی پرستش کرو، کیا تم غور نہیں کرتے۔

۴۔ تم سب کی بازگشت اس کی طرف ہے۔ خدا نے حق وعدہ فرمایا ہے اس نے مخلوق کا آغاز کیا اس کے بعد انہیں پلٹائے گا تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو یاد عادلانہ جزا دے اور جو کافر ہو گئے ہیں ان کے پینے کے لئے جلانے والی مائع اور دردناک عذاب ہے کیونکہ انھوں نے کفر اختیار کیا ہے۔

خدا شناسی اور قیامت

وحی اور نبوت کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد، اس سورہ کی ابتدائی آیات میں قرآن تمام انبیاء کی تعلیمات کے دو بنیادی اصولوں یعنی مبداء اور معاد کا رخ کرتا ہے زیر نظر دو آیت میں ان دو اہم اصولوں کو مختصر اور واضح عبارت میں بیان کیا گیا ہے پہلے فرمایا گیا ہے: تمہارا پروردگار وہی خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا ﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ﴾ جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں لفظ ”یوم“ عربی زبان میں اور ”روز“ فارسی زبان میں اور اسی طرح دوسری زبانوں میں ان کے متبادل الفاظ بہت سے موقع پر دور کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ ایک دن تھا جب استبداد کا دور تھا اور اس دور کے خاتمے پر لوگوں کی نجات اور آزادی کا دور آن پہنچا ہے۔^(۱)

اس بناء پر مندرجہ بالا جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ پروردگار نے آسمان اور زمین کو چھ ادوار میں پیدا کیا اور چونکہ ان چھ ادوار کے بارے میں ہم پہلے گفتگو کر چکے ہیں لہذا یہاں تکرار نہیں کرتے۔^(۲)

لفظ ”عرش“ بعض اوقات چھت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس چیز کے معنی میں بولا جاتا ہے جو چھت کے رکھتی ہو اور بعض اوقات یہ اونچے پاؤں والے تخت کے معنی میں آتا ہے اس کا اصلی معنی ہے ”قدرت“ مثلاً ہم کہتے ہیں فلاں شخص بیٹھا یا اس کے تخت کے پائے گر گئے یا اس کے تخت سے اتار دیا گیا۔ یہ سب اقتدار حاصل کرنے یا اقتدار کھودینے کے لئے کنایہ ہیں حالانکہ ہو سکتا ہے، تخت اصلاً ہو ہی نہیں۔ لہذا ”استوی علی العرش“ کے معنی ہیں خدا نے امور عالم کی باگ دوڑ اپنے دست قدرت میں لی۔^(۳)

”تدبر“ تدبیر کے مادہ سے مشتق ہے اور دراصل ”دبر“ (بروزن) ”امر“ کسی چیز کے پیچھے اور انجام کے معنی میں ہے اس بناء پر ”تدبیر“ کاموں کے انجام کی تحقیق کرنے اور مصالح کو منظم کر کے ان کے مطابق عمل کرنے کے معنی میں ہے۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ خالق اللہ ہے اور عالم ہستی کو وہی چلاتا ہے اور تمام امور کی تدبیر اس کے فرمان سے ہوتی ہے واضح ہے کہ بے جان، عاجز اور ناتواں بتوں انسانوں کی سر نوشت میں کوئی اثر نہیں ہے اس لئے بعد والے جملہ میں فرمایا گیا ہے: اس کے اذن کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہے ﴿مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ﴾۔^(۴)

جی ہاں۔ حقیقت یہی ہے کہ اللہ تمہارا پروردگار ہے لہذا اس کی پرستش کرو نہ کہ اس کے غیر کی ﴿ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ﴾۔

کیا اس واضح دلیل سے تم متذکر اور متوجہ نہیں ہوتے ﴿أَفَلَا تَذَكَّرُونَ﴾۔ جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں ”بعد والی آیت میں معاد اور قیامت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں یہ معاملہ، اس کی دلیل اور اس کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔

پہلے قرآن کہتا ہے: تم سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے ﴿إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا﴾۔

اس کے بعد تاکید فرمایا گیا ہے: خدا کا یہ قطعی وعدہ ہے ﴿وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا﴾۔

بعد از آں اس کی دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: خدا نے خلقت کی ابتداء کی اور پھر اس کی تجدید کرے گا ﴿إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ﴾۔

یعنی جو لوگ معاد اور قیامت کے بارے میں شک کرتے ہیں انھیں آغاز خلقت کے بارے میں غور و فکر کرنا چاہیے۔

خدا جس نے دنیا کو ابتداء میں ایجاد کیا وہ اسے دوبار پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے یہ استدلال ایک دوسری شکل میں سورہ اعراف آیت ۲۹ میں ایک مختصر سے جملہ میں بیان ہوا ہے اس کی تفصیل سورہ اعراف کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔

قیامت اور معاد سے مربوط آیات نشان دہی کرتی ہیں کہ مشرکین اور مخالفین کے شک کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ انہیں ایسی چیز کے امکان میں شک تھا اور تعجب سے سوال کرتے تھے کہ کیا یہ بوسیدہ اور خاک بنی ہوئیں ہڈیاں دوبارہ لباس حیات پہنیں گی اور اپنی پہلی شکل میں پلٹ آئیں گی۔

اس لئے قرآن نے بھی اس مسئلہ کے امکان پر انگلی رکھی ہے اور کہتا ہے: اس ذات کو فراموش نہ کرو جو اس جہاں کو از سر نو ساز و سامان بخشے گا اور مردوں کو زندہ کرے گا کیونکہ وہی آفریدگار ہے جس نے آغاز میں یہی کام کیا تھا۔

اس کے بعد معاد کے مقصد کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: یہ اس بناء پر ہے کہ خدا ایسے افراد کو جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک اعمال انجام دیئے ہیں انہیں عادلانی جزا اور بدلہ دے گا۔

بغیر اس کے کہ ان کا کوئی چھوٹا سا عمل بھی بغیر لطف و رحمت کی نظر سے مخفی رہے اور اجر و ثواب کے بغیر رہ جائے ﴿لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ﴾۔

”اور وہ لوگ کہ جنہوں کو کفر اور انکار کا راستہ طے کیا ہے اور پھر فطری طور پر ان کا کوئی نیک عمل بھی نہ تھا (کیونکہ اچھے عمل کی جڑ اچھا عقیدہ ہے) ان کے دردناک سزا ہے۔ ان کے پینے کے لئے گرم اور جلانے والا پانی ہے اور ان کے کفر کی وجہ سے عذاب الیم ان کے انتظار میں ہے ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ﴾۔“

۱- مزید توضیح اور اس سلسلے میں عربی فارسی مثالوں کے لئے تفسیر نمونہ جلد ششم سورہ اعراف کی آیت ۵۴ کے ذیل میں رجوع کریں۔

۲- اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: خدا نے عالم کو پیدا کرنے کے بعد اس کے امور کی باگ ڈور اپنے دست قدرت میں لی (ثم استوی علی العرش)۔ تمام کام اس کے فرمان سے ہوتے ہیں اور تمام چیزیں اس کے قبضہ تدبیر میں ہیں (ید بر الامر)

۳- زیادہ وضاحت اور ”عرش“ کے مختلف معانی سے باخبر ہونے کے لئے تفسیر نمونہ جلد ۶ ص ۱۸۰ (اردو ترجمہ) اور ج ۲ ص ۱۵۸ (اردو ترجمہ)

۴- شفاعت جیسے اہم مسئلہ پر ہم بحث پہلے ہی کر چکے ہیں اس کے لئے جلد اول ص ۱۸۷ (اردو ترجمہ) اور جلد دوم ص ۱۵۵ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

دو قابل توجہ نکات

۱۔ ”الیہ مرجعکم جمیعاً“ کا مفہوم:

اگرچہ خدا کے لئے مکان و محل نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس جہاں میں وہ ہر جگہ ہے اور ہم سے ہمارے نسبت زیادہ قریب ہے۔ اس کے امر کے سبب مفسرین نے زیر نظر آیت میں ”الیہ مرجعکم جمیعاً“ اور قرآن کی ایسی دیگر آیات کی مختلف تفسیریں کی ہیں،

کبھی کہا جاتا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ثواب اور جزا کی طرف پلٹ جائیں گے۔

نیز شاید بعض جاہل افراد اسے قیامت میں خدا کے مجسم ہونے کی دلیل سمجھیں کہ جس عقیدہ کا بطلان اس قدر واضح ہے کہ محتاج بیان نہیں۔

لیکن جو کچھ آیات قرآن میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ عالم حیات ایسے کاروں کی طرح جو جہان عدم سے چلا ہے اور اپنے لامتناہی سفر اور گردش میں لامتناہی کی طرف ہی آگے بڑھ رہا ہے جو کہ خدا کی ذات پاک ہے اگرچہ مخلوق محدود ہے اور محدود کبھی لامتناہی (Infinite) نہیں ہوتا پھر بھی اس کا سفر تکامل رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ قیامت کے بعد بھی یہ سیرت کامل جاری و ساری رہے گی (جیسا کہ ہم نے معاد کی بحث میں اس کی تشریح کی ہے) (۱)

قرآن کہتا ہے:- ﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ اذْكُرْ كَادِحَ الِی رِبْكَ كَدْحًا﴾۔

اے انسان! تو سعی و کوشش کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہے۔

نیز کہتا ہے:- ﴿يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ الِی رِبْكَ﴾۔

اے وہ روح کہ جو ایمان اور عمل صالح کے ذریعے سکون و اطمینان کی سرحد تک پہنچ گئی ہے، اپنے پروردگار کی طرف

پلٹ آ۔

اس تحریک کی ابتدا خدا کی طرف سے ہوئی ہے اور زندگی کا پہلا شعلہ اس کی طرف سے ظاہر ہوا ہے نیز یہ ارتقائی سفر اور حرکت اسی کی طرف ہے جسے --- ”رجوع“ اور بازگشت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

المختصر ایسی تعبیریں علاوہ اس کے کہ موجودات کی خدا کی طرف عمومی حرکت کی طرف اشارہ ہیں اس حرکت کے مقصد کو بھی مشخص کرتی ہیں اور وہ اس کی پاک ذات ہے۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ لفظ ”الیہ“ مقدم ہے اور اس کا مقدم ہونا انحصار کی دلیل ہے واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کی ارتقائی اور تکاملی حرکت کا مقصد اس کی پاک ذات کے علاوہ کوئی وجود نہیں ہو سکتا نہ بت اور نہ ہی کوئی اور مخلوق۔ کیونکہ یہ سب چیزیں محدود ہیں اور انسان کی راہ غیر محدود ہے۔

۲۔ ”قسط“ کا مفہوم:

”قسط“ لغت میں دوسرے کا حصہ ادا کرنے کے معنی میں ہے لہذا اس میں انصاف کا مفہوم چھپا ہوا ہے۔ یہ بات جاذب نظر ہے مندرجہ بالا آیت میں یہ لفظ صرف ان افراد کے لیے بولا گیا ہے جو عمل صالح بجالاتے ہیں اور اچھی جزا چاہتے ہیں لیکن بدکاروں کی سزا کے ذکر میں یہ لفظ نہیں آیا کیونکہ عذاب اور سزائیں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر ”قسط“ صرف نیک جزا کیلئے مناسب ہے، سزا کے لیے مناسب نہیں ہے۔

۱۔ زیادہ وضاحت کے لئے کتاب ”معاد و جہان پس از مرگ“ کی طرف رجوع کرے۔

آیات ۵، ۶

۵۔ ﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَ الْقَمَرَ نُورًا وَ قَدَرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَ الْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾۔

۶۔ ﴿إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَّقُونَ﴾۔ ترجمہ

۵۔ وہ وہ ہے کہ جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو نور قرار دیا ہے اور اس کے لئے منزلیں مقرر کی ہیں تاکہ تم برسوں کی تعداد اور (کاموں کا) حساب جان لو۔ خدا نے اسے سوائے حق کے پیدا نہیں کیا۔ وہ (اپنی) آیات صاحبان علم کے لئے تفصیل و تشریح کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

۶۔ مسلم ہے کہ رات اور دن کے آنے جانے میں اور ان چیزوں میں کہ جنہیں خدا نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے، ان لوگوں کے لئے آیات (اور نشانیاں) ہیں جو پرہیزگار ہیں (اور گناہ نے ان کے دل کی آنکھ کو اندھا نہیں کر دیا)۔

عظمت الہی کی نشانیاں

گزشتہ آیت میں مبداء اور معاد کے مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا تھا لیکن ان آیات کے بعد ان دو اصولی مسائل کو شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے کیونکہ یہ مسائل دعوت انبیاء کے اہم ترین ارکان ہیں۔ با الفاظ دیگر آنے والی آیات گزشتہ آیات کی نسبت تفصیلی ہیں۔

زیر نظر پہلی آیت میں جہان آفرینش میں عظمت خدا کی نشانیوں کے ایک حصہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ وہ ہے کہ جس نے سورج کو ضیاء اور چاند کو نور قرار دیا ﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَ الْقَمَرَ نُورًا﴾

سورج اپنے عالمگیر نور سے نہ صرف موجودات کے وجود کو گرم کرتا اور روشنی بخشتا ہے بلکہ سبزہ زاروں کی نشو و نما اور جانوروں کی پرورش میں عمدہ اور بنیادی کردار ادا کرتا ہے اصولی طور پر ہر حرکت و جنبش جو کرہ زمین موجود ہے۔ یہاں تک کہ ہواؤں کے چلنے میں دریاؤں کی موجوں میں نہروں کی لہروں میں اور آبشاروں کی روانی میں، اگر صحیح طور پر غور و فکر کیا جائے تو یہ نور آفتاب کی برکت ہے اور اگر کسی دن یہ حیات بخش شعاعیں ہمارے کرہ خاکی سے منقطع ہو جائیں تو قلیل عرصے میں تاریکی ہسکوت اور موت تمام جگہوں پر چھا جائے۔

چاند اپنے خوبصورت نور کے ساتھ ہماری تاریک راتوں کا چراغ ہے۔ ماہ تاباں نہ صرف بیابانوں میں رات کے مسافروں کی رہبری کرتا ہے بلکہ اس کی مناسب اور ملائم روشنی سارے کمرہ ارضی کے رہنے والوں کے لیے سکون و آرام اور نشاط و مسرت کا باعث ہے۔ اس کے بعد چاند کے وجود کے ایک اور مفید اثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا نے اُس کے لئے کئی منزلیں مقرر کی ہیں تاکہ وہ اپنے برسوں کی تعداد اور زندگی کے حسابات جان سکیں۔ ﴿وَقَدَرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ﴾۔ یعنی اگر تم دیکھتے ہو کہ پہلی رات میں چاند ایک باریک سا ہلال ہوتا ہے اور پھر ہر روز بڑھتا رہتا ہے، تقریباً آدھے مہینے تک یوں ہی بڑھتا چلا جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ کم ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ مہینے کے آخری دو دن میں محاق^(۱)

کی تاریکی میں ڈوب جاتا ہے اور پھر دوبارہ ہلال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور انھیں پہلی منزلوں کو طے کرتا ہے تو یہ تبدیلی عبث اور فضول نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت ہی دقیق اور زندہ طبعی تقویم ہے۔^(۲) جسے عالم و جاہل پڑھ سکتے ہیں اور اس سے اپنے امور حیات کا حساب رکھ سکتے ہیں اور روشنی کے علاوہ ہمارے لئے چاند کا یہ ایک اور فائدہ ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ مہر و مہ کی یہ آفرینش و گردش بغیر سوچے سمجھے اور کھیل کود کے لئے نہیں ہیں ”خدا نے انھیں صرف حق کے ساتھ پیدا کیا ہے“ ﴿مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ﴾۔ آیت کے آخر میں تاکید فرمایا گیا ہے: خدا سمجھنے والوں کے لئے اپنی نشانیاں شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتا ہے ﴿يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾۔

باقی رہے بے خبر و بے سہر تو وہ بارہا خدا کی ان نشانیوں کے پاس سے گزر جاتے ہیں لیکن ان سے کچھ نہیں سمجھتے۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ آسمان و زمین میں اپنے وجود کی کچھ مزید نشانیاں اور دلائل بیان کرتا ہے، فرماتا ہے: رات دن کے آنے جانے میں اور جو کچھ خدا نے آسمانوں اور زمینوں میں پیدا کیا اس میں پرہیزگاروں کے لئے نشانیاں ہیں ﴿إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَّقُونَ﴾۔

نہ صرف آسمان اور زمین خدا کی نشانیاں ہیں بلکہ موجودات کے تمام ذرات جو ان میں موجود ہیں ہر کوئی ایک نشانی ہے لیکن انھیں صرف وہی لوگ سمجھ جاتے ہیں جنہوں نے تقویٰ اور گناہ سے پرہیز کے سائے میں روح کی پاکیزگی اور روشن بینی حاصل کی ہے جو حقیقت اور جمال کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

۱۔ چاند کا گھٹنا، چاند کی وہ آخری تین تاریخیں جن میں وہ نظر نہیں آتا۔ ہندی میں اسے ”اوماس“ کہتے ہیں۔ (مترجم)

۲۔ اس بارے میں کہ چاند ایک فطری تقویم ہے، اس کے مختلف حالات سے مہینہ کے دنوں کو غور و خوض سے معین کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد دوم، ص ۲۲ (اردو ترجمہ) پر بحث کر چکے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ ضیا اور نور میں فرق:

اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے۔
بعض دونوں کو مترادف اور ہم معنی سمجھتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ ضیاء جو مندرجہ بالا آیت میں سورج کی روشنی کے لئے استعمال ہوا ہے وہ قوی اور طاقتور نور ہے لیکن لفظ ”نور“ جو چاند کے بارے میں آیا ہے، کمزور نور کے بارے میں ہے۔
تیسرا نظریہ یہ ہے کہ ”ضیاء“ ذاتی طور پر یہ نور کے معنی میں ہے لیکن نور ایک عام مفہوم رکھتا ہے جو ذاتی اور دوسرے سے حاصل کردہ دونوں کے لئے ہے۔ اس صورت میں مندرجہ بالا آیت میں تعبیر کا فرق اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے سورج کو نور پھوٹنے کا منبع قرار دیا ہے جبکہ چاند کا نور دوسرے سے حاصل کردہ ہے اور اس کا سرچشمہ سورج ہے۔

قرآن کی کچھ آیات کی طرف توجہ کرنے سے یہ فرق زیادہ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔

سورہ نوح کی آیہ ۱۶ میں ہے: ﴿وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا﴾

ان میں سے چاند کو نور اور سورج کو چراغ قرار دیا ہے۔

سورہ فرقان آیہ ۶۱ میں ہے: ﴿وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا﴾۔

ان میں سے چراغ اور روشنی دینے والا چاند قرار دیا ہے۔

اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ”سراج“ (یعنی چراغ) اپنی طرف سے نور برساتا ہے اور وہ نور کا منبع اور سرچشمہ ہے اور سورج کو مندرجہ بالا دو آیات میں چراغ سے تشبیہ دی گئی ہے واضح ہو جاتا ہے کہ زیر بحث آیات میں بھی یہ فرق بہت ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ ”ضیاء“ جمع ہے یا مفرد:

اس سلسلے میں اہل ادب اور اہل لغت میں اختلاف ہے۔ مولف قاموس کی طرح بعض نے اسے مفرد سمجھا ہے لیکن زجاج کی طرح بعض دوسرے افراد نے ”ضیاء“ کو ”ضو“ کی جمع قرار دیا ہے۔ تفسیر المنار اور تفسیر قرطبی کے مولفین نے بھی دوسرا معنی قبول کیا ہے۔

خصوصاً المنار کے مولف نے اسی بنیاد پر آیت سے بہت استفادہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

سورج کے نور کے بارے میں قرآن میں ”ضیاء“ کا جمع کی صورت میں ذکر اس چیز کی طرف اشارہ ہے جسے اس زمانے کی سائنس نے کئی صدیوں کے بعد ثابت کیا ہے اور وہ یہ کہ سورج کا نور سات انوار سے مرکب ہے یا دوسرے لفظوں میں سات رنگوں میں ہے وہی رنگ جو قوس قزح میں اور بلوریں سوراخوں سے گذرتے ہوئے روشنی میں نظر آتے ہیں۔

لیکن یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ چاند کا نور اگرچہ ضعیف ہے پھر بھی کیا وہ مختلف رنگوں سے مرکب نہیں ہے؟

۳۔ ”قدرہ منازل“ کی ضمیر:

”قدرہ منازل“ (اسکے لئے کئی منزلیں مقرر کیں) کی ضمیر کا مرجع صرف چاند ہے یا یہ چاند اور سورج دونوں کی طرف اشارہ ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے بعض کا نظریہ ہے کہ یہ ضمیر اگرچہ مفرد ہے پھر بھی دونوں کی طرف لوٹتی ہے۔ ایسی نظیریں عربی ادب میں بہت ہیں۔ اس نظریہ کا انتخاب اس بنیاد پر کیا گیا ہے کہ صرف چاند ہی کی نہیں بلکہ سورج کی بھی منزلیں ہیں اور وہ ہر وقت کسی مخصوص برج میں ہوتا ہے۔ برجوں کا یہی اختلاف تاریخ اور شمسی مہینوں کے بننے کی بنیاد ہے۔

لیکن انصاف یہ ہے کہ آیت کا ظہور نشانہ ہی کرتا ہے کہ یہ ضمیر مفرد صرف ”قمر“ کی طرف لوٹتی ہے جو اس کے قریب ہے اور اس میں بھی ایک نکتہ ہے۔۔۔۔۔ کیونکہ:

وہ مہینے کہ جنہیں اسلام میں قانونی طور پر قبول کیا گیا ہے، قمری مہینے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ چاند ایک متحرک کمرہ ہے اور اس کی کئی منزلیں ہیں لیکن سورج نظام شمسی کے وسط میں ہے اور اس نظام میں اس کی کوئی حرکت نہیں۔

باقی رہا برجوں کا اختلاف اور بارہ فلکی برجوں میں سورج کی سیر کہ جو حمل سے شروع ہو کر حوت پر جا کر ختم ہوتی ہے تو وہ سورج کی حرکت کی وجہ نہیں ہے بلکہ زمین کی چاند کے گرد حرکت کی وجہ سے ہے اور زمین کی یہ گردش سبب بنتی ہے کہ

ہم سورج کو ہر مہینے میں بارہ آسمانی برجوں میں سے ایک میں دیکھتے ہیں۔ لہذا سورج کی مختلف منزلیں نہیں ہیں بلکہ صرف چاند ہی کی منزلیں ہیں۔ (غور کیجئے گا)

مندرجہ بالا آیات در حقیقت ایک علمی مسئلے کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جو آسمانی کمرات سے مربوط ہے اس زمانے میں یہ بات نوع بشر کے علم کی نگاہ سے پوشیدہ تھی اور وہ یہ کہ چاند حرکت کرتا ہے لیکن سورج حرکت نہیں رکھتا۔

۴۔ رات دن کا آنا جانا:

زیر نظر آیت میں رات دن کے آنے جانے کو خدا کی ایک نشانی شمار کیا گیا ہے اور یہ اس بنا پر ہے کہ اگر سورج کی روشنی ایک ہی طرح مسلسل زمین پر پڑتی رہتی تو یقیناً زمین کا درجہ حرارت اتنا بڑھ جاتا کہ وہ زندگی گزارنے کے قابل نہ رہتی (جیسے چاند پر جلانے والی حرارت ہے جو کہ اس کے دنوں میں زمین کے ۱۵ شب و روز کے برابر ہے) اور اگر اسی طرح رات مسلسل جاری رہتی تو تمام چیزیں سردی کی شدت سے خشک ہو جاتیں (جیسا کہ چاند کی طویل راتیں ہیں) لیکن خدا نے ان دونوں کو یکے بعد دیگرے قرار دیا ہے تاکہ زندگی کو کمرہ ارض پر باقی رکھے۔^(۱)

عدد، حساب، تاریخ، سال اور مہینہ کا انسانی نظام حیات، اس کے معاشرتی رابطوں اور کام کاج پر اثر سب پر واضح ہے۔

۵۔ تقویم اور تاریخ کا مسئلہ:

مندرجہ بالا آیت میں تقویم اور تاریخ کے حساب کے جس مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل میں سے ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ کسی نعمت کی اہمیت اس وقت واضح ہوتی ہے جب زندگی کو اس کے بغیر دیکھیں اگر ہم اس حوالے سے غور کریں کہ اگر تاریخ (DATE)

(جو کہ دنوں، مہینوں اور سالوں کا امتیاز کرتی ہے) انسانی زندگی سے ہٹا دی جائے مثلاً ہفتے کے دن واضح نہ ہوں، نہ مہینے کا حساب ہو اور نہ سال کا حساب ہو تو تمام تجارتی و اقتصادی معاملات، تمام معاہدہ اور مدت کے تعین کا نظام درہم برہم ہو جائے اور کسی کام میں نظم و ضبط نہ رہے یہاں تک کہ کھیتی باڑی، سرمایہ کاری اور کارخانوں کی حالت بھی صرج

مرج کا شکار ہو جائے لیکن خدا نے چونکہ انسان کو ایک سعادت بخش زندگی کے لئے پیدا کیا ہے جس کا ایک نظم و ضبط ہے اسلئے اس نظام کے وسائل بھی اسے مہیا کئے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان کسی ایک نظام تاریخ کے مطابق کسی حد تک اپنے کاموں کو منظم کر سکتا ہے لیکن اگر یہ حساب کسی فطری میزان کے مطابق نہ ہو تو نہ اس میں عمومیت ہو سکتی ہے اور نہ ہی یہ قابل اعتماد ہو سکتا ہے۔

گردش مہر و ماہ (یا زیادہ صحیح لفظوں میں زمین کی سورج کے گرد گردش) اور اس کی منزلیں ایک فطری تقویم کی بنیاد قائم کرتی ہیں، جو ہر جگہ اور تمام لوگوں کے لئے واضح اور قابل اعتماد ہے۔

جیسا کہ رات دن کی مقدار جو کہ ایک چھوٹا سا ارصہ ہے ایک طبعی عامل کے ماتحت یعنی زمین کے اپنے محور کے گرد حرکت کرنے سے وجود میں آتی ہے اسی طرح مہینہ اور سال کا حساب بھی کسی طبعی گردش کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ اس کے لئے کرہ ارض کے گرد چاند کی حرکت ایک بڑی اکائی ہے (اسی کی بنیاد پر بتا ہے جو تقریباً تیس دن کے مساوی ہے) اور زمین کی سورج کے گرد حرکت عظیم تر اکائی ہے جس سے سال معرض وجود میں آتا ہے۔

ہم نے کہا ہے کہ اسلامی تقویم چاند کی گردش کی بنیاد پر ہے۔ یہ درست ہے کہ بارہ برجوں میں سورج کی گردش بھی تقویم کے حساب کے لئے ایک اچھا ذریعہ ہے اور اس سے شمسی مہینوں کا تعین ہوتا ہے۔ تاہم یہ سب کے لئے فائدہ مند نہیں ہے اور اس کی تشخیص صرف علم فلکیات کے ماہرین رصد گاہوں کے ذریعے کر سکتے ہیں لہذا دوسرے لوگ مجبور ہیں کہ ان تقویموں کی طرف رجوع کریں جو علم فلکیات کے ماہرین نے مرتب کی ہیں۔ لیکن زمین کے گرد چاند کی منظم گردش ایسی واضح تقویم پیش کرتی ہے کہ ان پڑھ اور بیابانوں میں رہنے والے بھی اس کے نقوش اور خطوط پڑھ سکتے ہیں اسکی وضاحت یہ ہے کہ آسمان پر ہر رات چاند کی ایک خاص کیفیت ہوتی ہے جو پہلے اور بعد کی رات سے مختلف ہوتی ہے اس طرح سے کہ پورے مہینوں کی دو راتوں میں آسمان پر چاند کی کیفیت اور شکل و صورت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ ہر رات کے چاند کی کیفیت پر اگر ہم تھوڑا سا غور کریں تو آہستہ آہستہ ہمیں عادت ہو جائے گی اور ہم پورے طور پر معین کر سکیں گے کہ یہ مہینے کی کون سی رات ہے۔

ہو سکتا ہے بعض لوگ یہ تصویر کمرے کے مہینے کے دوسرے نصف میں بعینہ پہلے نصف کے منظر کا طریقہ ہوتا ہے مثلاً ایک سوئیں شب چاند کا چہرہ ٹھیک ساتویں رات کے چہرے کی طرح ہوتا ہے لیکن یہ ایک بڑا اشتباہ ہے کیونکہ چاند کا ناقص حصہ پہلے نصف مہینے میں اوپر کی طرف ہوتا ہے جبکہ دوسرے نصف حصہ میں ناقص حصہ نیچے کی طرف ہوتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں آغاز ماہ میں ہلال کے کونے مشرق کی سمت ہوتے ہیں جبکہ مہینے کے دوسرے حصے میں چاند کی نوکیں مغرب کی طرف ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں مہینے کے اوائل میں چاند مغرب کی طرف نظر آتا ہے لیکن نصف ماہ کے بعد زیادہ تر مشرق کی طرف ہوتا ہے اور بہت دیر کے بعد طلوع کرتا ہے۔

اس طرح چاند کی بدلتی صورت سے ایک دن کا حساب کیا جاسکتا ہے اور شکل ہی پر غور و خوض کرنے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مہینے کی کون سی تاریخ ہے بحر حال یہ نظام تقویم ایک بڑی نعمت ہے جس پر ہم آفرینش خداوندی کے ممنون احسان ہیں اور اگرچاند، سورج اور زمین کی حرکات نہ ہوتیں تو ہماری زندگی میں ایسا صرج مرج ہوتا اور ہم ایسی پریشانی سے دوچار ہوتے کہ جس کا اس وقت ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

وہ قیدی جو کسی تاریک کوٹھڑی میں قید تنہائی میں ہوتے ہیں اور انھیں وقت کا پتہ نہیں چلتا وہ اس مصیبت کا پورے طور پر احساس کرتے ہیں۔

ہمارے زمانے میں ایک قیدی تقریباً ایک ماہ کے لئے استبداد کے ایجنٹوں کے ہاتھوں گرفتار رہا، اسے ایک تاریک کوٹھڑی میں قید تنہائی میں رکھا گیا تھا وہ بیان کرتا ہے: ”میرے پاس وقت نماز کی تشخیص کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ جب وہ دوپہر کا کھانا لاتے تو میں ظہر اور عصر کی نمازیں پڑھ لیتا اور جس وقت وہ رات کا کھانا لاتے تو میں مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کر لیتا اور نماز صبح بھی عموماً جب وہ ناشتہ لاتے پڑھ لیتا۔ اگر دنوں کو شمار کرنا چہتا تو کھانوں کی تعداد اور حساب کو نظر میں رکھتا۔ کھانے کے تین اوقات کو ایک دن شمار کرتا تھا۔ لیکن نہ معلوم کیا ہوا کہ جب میں زندان سے باہر نکلا تو میرا حساب باہر کے لوگوں کے حساب سے مختلف ہو چکا تھا۔“

آیات ۷، ۸، ۹، ۱۰

۷۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَ نَا وَ رَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ اطْمَأَنُّوا بِهَا وَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ﴾۔

۸۔ ﴿أُولَئِكَ مَاوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾۔

۹۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ تَجْرَى مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ﴾۔

۱۰۔ ﴿دَعَوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ وَ آخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾۔

ترجمہ

۷۔ وہ جو ہماری ملاقات (اور قیامت) کی امید نہیں رکھتے اور دنیاوی زندگی پر خوش ہیں اور اس پر تکیہ کئے ہوئے ہیں اور وہ جو ہماری آیات سے غافل ہیں۔

۸۔ ان (سب) کے رہنے کی جگہ آگ ہے، ان کاموں کی وجہ سے جو وہ انجام دیتے تھے۔

۹۔ (لیکن) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے خدا انھیں ان کے ایمان کے سبب ہدایت کرتا ہے، ان کے (قصر اور محلات کے) نیچے سے جنت کے باغوں میں نہریں جاری ہیں۔

۱۰۔ جنت میں ان کی گفتگو (اور دعا) یہ ہے کہ خدایا: تو منزہ ہے اور ان کا تحیہ سلام ہے اور ان کی آخری بات یہ ہے کہ حمد اور تعریف مخصوص ہے عالمین کے پروردگار اللہ کے لئے۔

جنتی اور دوزخی

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے اس سورہ کی ابتدا میں قرآن نے پہلے مبدا اور معاد کے مسئلہ کے بارے میں ایک اجمالی بحث کی ہے اور بعد میں اس کی تفصیل شروع کی ہے۔

گزشتہ آیات میں مسئلہ مبدا کے بارے میں تشریح تھی اور زیر نظر آیات میں معاد اور دوسرے جہان میں لوگوں کی سر نوشت کے بارے میں تشریح نظر آتی ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور قیامت پر عقیدہ نہیں رکھتے اور اس بناء پر صرف دنیاوی زندگی پر خوش ہیں اور اسی پر تکیہ کئے ہوئے ہیں ﴿إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَ نَا وَ رَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ اطْمَأَنُّوا بِهَا﴾۔

اور اسی طرح طرح وہ لوگ جو ہماری آیات سے غافل ہیں اور ان میں غور و فکر نہیں کرتے کہ ان کے دل بیدار ہوں اور ان میں احساس مسئولیت پیدا ہو ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ﴾۔

”ان دونوں گروہوں کے رہنے کی جگہ آگ ہے، ان اعمال کے سبب جو وہ انجام دیتے تھے ﴿أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾۔“

فی الحقیقت معاد اور قیامت پر ایمان نہ لانے کا سیدھا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اس محدود زندگی اور عارضی مادی مقام و منصب سے دل بستگی پیدا کرتا ہے اور انھی پر بھروسہ کر لیتا ہے۔ زندگی کے کاموں میں اس کا نتیجہ آلودگی کی صورت میں نکلتا ہے اور اس کا انجام آخر آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

اسی طرح آیات الہی سے غفلت خدا سے بیگانگی کا سرچشمہ ہے اور خدا سے بیگانگی عدم احساس مسئولیت کا سرچشمہ ہے اور اس کے نتیجے میں انسان ظلم، فساد اور گناہ سے آلودہ ہوتا ہے اور اس کا انجام آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

لہذا مذکورہ دونوں گروہ۔۔۔۔۔ یعنی وہ جو مبداء یا معاد پر یقین نہیں رکھتے یقیناً عمل کے لحاظ سے آلودہ ہوں گے اور دونوں گروہوں کا مستقبل تاریک ہے۔

یہ دو آیات دوبارہ اس حقیقت کی تاکید کرتی ہیں کہ ایک معاشرے کی اصلاح اور اور ظلم و گناہ کی آگ سے نجات کے لئے خدا اور معاد ایمان کی بنیادوں کو قوی کرنا ناگزیر ہے کیونکہ خدا پر ایمان لائے بغیر وجود انسانی میں احساس مسئولیت پیدا نہیں ہو سکتا اور معاد قیامت کی طرف توجہ کئے بغیر سزا اور خوف پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ دونوں اعتقادی ستون تمام اجتماعی اصلاحات کی بنیاد ہیں۔

اس کے بعد دونوں گروہوں کے مقابل ایک اور گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کئے، ان کے ایمان کی تقویت کے لئے خدا انھیں ہدایت کرتا ہے ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ﴾۔

ہدایت الہی کا یہ نور جس کا سرچشمہ ان کا نور ایمان ہے، ان کی زندگی کے تمام افق راशन کر دیتا ہے اس نور کے ذریعے ان میں ایسی روشن بینی پیدا ہو جاتی ہے کہ مادی مکاتب و نظریات، شیطانی وسوسے، گناہوں کی چمک دہک، زور دولت اور اقتدار ان کی فکر و نظر میں نہیں چھتے اور وہ صحیح راستے کو چھوڑ کر بے راہ روی میں قدم نہیں رکھتے۔

یہ تو ان کی دنیا کی حالت ہے ”اور دوسرے جہان میں خدا بہشت کے پر نعمت باغوں میں انھیں محلات عطا کرے گا کہ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی ﴿يَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ﴾۔“

وہ ایک ایسے ماحول میں زندگی بسر کریں گے جو صلح و آشتی، پاکیزگی اور عشق پروردگار سے معمور ہوگا اور جہاں طرح طرح کی نعمتیں ہوں گی جس وقت خدا کی ذات و صفات سے عشق ان کے وجود کو روشن کر دیگا تو وہ ”کہیں گے پروردگار! تو ہر قسم کے عیب اور نقص سے منزہ اور پاک ہے“ ﴿دَعَوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ﴾۔ جب وہ ایک دوسرے سے ملیں گے تو صلح و صفائی کی باتیں کریں گے اور ان کا تجہ سلام ہوگا ﴿وَنَحْيَتْهُمْ فِيهَا سَلَامٌ﴾۔

اور آخر کار وہ وہاں خدا کی گونا گوں نعمتوں سے بہرہ ور ہوں گے تو اس کا شکرانہ ادا کریں گے اور کہیں گے کہ ”حمد و ثنا اس خدا کے لئے مخصوص ہے جو عالمین کا پروردگار ہے“ ﴿وَ آخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ پروردگار سے ملاقات:

سوال پیدا ہوتا ہے کہ لقاء الہی سے کیا مراد ہے جس کا ذکر زیر نظر پہلی آیت میں ہے مسلم ہے کہ ملاقات حسی تو نہیں ہے بلکہ مراد پروردگار کی جزا و سزا سے ملاقات ہے اور اس کے علاوہ ایک قسم شہود باطنی بھی ہے حق قیامت میں انسان کے اندر ذات مقدس الہی کے بارے میں پیدا ہوگا کیونکہ اس موقع پر وہ اس کی آیات اور نشانیوں کو ہر مقام سے بڑھ کر واضح اور آشکار دیکھ پائے گا اور وہاں انسان معرفت کی نئی نظر اور قدرت حاصل کر لے گا۔^(۱)

۲۔ ﴿يَهْدِيهِمْ رَبُّهُم بِإِيمَانِهِمْ﴾ کے بارے میں کچھ گفتگو:

اس جملے میں ایمان کے سائے میں ہدایت انسانی کے مطلق گفتگو ہے۔ یہ ہدایت دوسرے جہان کی زندگی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس جہان میں بھی ایک مومن ایمان کی وجہ سے بہت سے اشتباہات، فریب کاریوں اور لغزشوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے کیونکہ یہ بیماریاں، حرص، خود خواہی اور ہوا و ہوس سے پیدا ہوتی ہیں اور اسی ایمان کے ذریعہ مومن دوسرے جہان میں اپنے لئے جنت کی طرف راستہ بنا لیتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: یوم ترمی المؤمنین و المؤمنات یسعی نور ہم بین ید یھم و بایما نھم

اس دن تو صاحب ایمان مردوں اور عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کے نور کی شعاع ان کے سامنے اور دائیں طرف چل رہی ہوگی۔ (حدید۔۔۔ ۱۲)

نیز ایک حدیث میں رسول اللہ سے مروی ہے:

إِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا خَرَجَ مِنْ قَبْرِهِ صَوْرَ لَهُ عَمَلُهُ فِي صُورَةٍ حَسَنَةٍ فَيَقُولُ لَهُ أَنَا عَمَلُكَ فَيَكُونُ لَهُ نُورًا وَ قَائِدًا إِلَى الْجَنَّةِ^(۲)

جب مومن اپنی قبر سے نکلے گا تو اس کے اعمال ایک پیاری صورت میں نمایاں ہوں گے اور اس سے کہیں گے کہ میں تیرا عمل ہوں اور ایک نور سا آئے گا جو اسے جنت کی طرف ہدایت کرے گا۔

۳۔ ﴿تَجْرَىٰ مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ﴾ کا مفہوم:

زیر نظر آیات میں ”تَجْرَىٰ مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ“ آیا ہے جبکہ قرآن کی دیر آیات میں ”تَجْرَىٰ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ“ نظر آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دیگر موقع پر ہے کہ ”جنت کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی“ جبکہ زیر نظر آیت میں ہے کہ ”جنت والوں کے پیر کے نیچے نہریں جاری ہوں گی“ ممکن ہے یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ اہل بہشت کے محلات بھی نہروں کے اوپر ہوں گے اور یوں یہ منظر نہایت حسین دکھائی دے گا۔

یا پھر یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جنت کی نہریں ان کے تابع فرمان ہوں گی اور ان کے قبضہ قدرت میں ہوں گی۔ جیسا کہ فرعون کے واقعہ میں ہے، وہ کہتا ہے ﴿أَلَيْسَ لِي مَلِكٌ مِّمَّنْ هَٰؤُلَاءِ﴾ (فرعون ۵۲)۔

کیا مصر کی حکومت میرے قبضہ میں نہیں اور یہ نہریں میرے حکم سے نہیں چلتیں۔ (زخرف ۵۲)۔ یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ لفظ ”تحت“ ”بین ایدی“ کے معنی میں ہو یعنی ان کے سامنے نہریں جاری ہوں گی۔

۴۔ اہل جنت کے لئے تین عظیم نعمتیں: یہ امر جاذب توجہ ہے کہ زیر بحث آخری آیت میں اہل بہشت کی تین حالتوں یا ان کے لئے تین نعمتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلی۔ ذات پروردگار کی طرف توجہ.. اس توجہ سے جو لذت انھیں حاصل ہوگی اس کا موازنہ کسی اور لذت سے نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری۔ وہ لذت جو مومنین کے ایک دوسرے سے صلح و تفاہم سے معمور اس ماحول میں ملاقات اور میل جول سے حاصل ہوگی اور یہ لذت خدا کی طرف متوجہ ہونے کی لذت کے بعد ہر چیز سے بہتر اور برتر ہوگی۔

تیسری وہ لذت کہ جو انھیں طرح طرح کی نعمات بہشت سے بہرہ ور ہونے سے حاصل ہوگی اور پھر وہ انھیں خدا کی طرف متوجہ کرے گی اور وہ اس کی حمد، سپاس اور شکر بجا لائیں گے۔ (غور کیجئے)

آیات ۱۱، ۱۲

۱۱۔ ﴿وَلَوْ يُعَجِّلُ اللَّهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَفُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجْلُهُمْ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَ نَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾ -

۱۲۔ ﴿وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِداً أَوْ قَائِماً فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَن لَّمْ يَدْعُنَا إِلَى ضُرِّ مَسَّهُ كَذَلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ -

ترجمہ

۱۱۔ جس طرح لوگ اچھائیوں کو اپنے قبضے میں لینے کے لئے جلدی کرتے ہیں اگر خدا (ان کے اعمال کے بدلے) انہیں سزا دے تو ان کی زندگی اختتام کو پہنچ جائے (اور سب کے سب ختم ہو جائیں) لیکن وہ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے انہیں ہم ان کی حالت پر چھوڑ دیں گے تاکہ وہ طغیان میں سرگردان پھریں۔

۱۲۔ اور جس وقت کسی انسان کو کوئی نقصان (اور پریشانی) چھوئے تو جب وہ پہلو کے بل سویا ہوا بیٹھا ہو یا کھڑا ہو (ہر حالت میں ہمیں) پکارتا ہے لیکن جب ہم اس کی پریشانی دور کر دیتے ہیں تو ایسے گزرتا ہے گویا اس نے کسی مشکل کے حل کے لئے کبھی ہمیں پکارا ہی نہ ہو۔ اس طرح سے اسراف کرنے والوں کے لئے ان کے اعمال زینت دے جاتے ہیں۔

خود غرض انسان

ان آیات میں بھی بدکاروں کی پاداش کے بارے میں گفتگو جاری ہے۔

پہلی آیت میں قرآن کہتا ہے: اگر خدا بدکار لوگوں کو جلدی اور اسی جہان میں سزا دے دے اور جیسے وہ نعمت اور خیر کے بارے میں حصول میں جلدی کرتے ہیں خدا بھی ان کی سزا میں تعجیل کرے تو سب کی عمر ختم ہو جائے اور ان کا نام و نشان تک بھی باقی نہ رہے ﴿وَلَوْ يُعَجِّلُ اللَّهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَفُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجْلُهُمْ﴾

لیکن خدا لطف چونکہ تمام بندوں کے شامل حال ہے یہاں تک کہ بدکاروں، کافروں اور مشرکوں کے لئے بھی ہے اس لیے وہ ان کی سزا میں جلدی نہیں کرتا کہ شاید وہ بیدار ہوں جائیں، توبہ کر لیں اور بے راہ روی سے پلٹ آئیں۔ علاوہ

ازیں اگر سزا اتنی جلد مل جاتی تو اختیاری حالت جو کہ مسوولیت کی بنیاد ہے، تقریباً ختم ہو جاتی اور اطاعت گزاروں کی اطاعت بھی، پھر اضطراری کیفیت میں ہوتی کیونکہ خلاف ورزی کی صورت میں فوراً وہ دردناک سزا کا سامنا کرتے۔ اس جملے میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ کچھ ہٹ دھرم کفار ایسے تھے جو انبیاء سے کہتے تھے کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو جتنا جلدی ہو سکے خدا سے کہو، ہمیں نابود کر دے یا سزا دے اس بات کو قرآن نے ذکر کیا ہے اب اگر خدا ان کے اس تقاضے کو قبول کر لیتا تو ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہتا۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

آیت کے آخر میں قرآن فرماتا ہے: ان کے لئے یہی سزا کافی ہے کہ جو لوگ قیامت اور ہماری ملاقات پر ایمان نہیں لائے انھیں ہم ان کی حالت پر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے طغیان میں حیران و سرگردان رہیں، نہ حق کو باطل سے جدا کر سکیں اور نہ راہ کو چاہ سے۔ ﴿فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَزُجُونَ لِقَاءَ نَا فِي طُعْيَانِهِمْ يَعْصُونَ﴾۔

اس موقع پر آدمی کی فطرت اور روح کی گہرائی میں نور توحید کے وجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: جب انسان کو کوئی نقصان اور ضرر پہنچتا ہے اور ہر جگہ اس کا ہاتھ کوتاہ ہو جاتا ہے تو ہماری طرف ہاتھ بلند کرتا ہے اور جب وہ پہلو کے بل سوتا ہے یا بیٹھتا ہے یا کھڑا ہوتا ہے، ہر حالت میں ہمیں پکارتا ہے۔

﴿وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِحَبِّهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا﴾

جی ہاں! مشکلات اور دردناک حواث کی خاصیت یہ ہے کہ وہ انسان کی پاک فطرت سے پردوں اور حجابوں کو ہر طرف کر دیتے ہیں۔ حواث کی بھٹی میں تمام سیاہ پردے جنہوں نے اس فطرت کو چھپا رکھا ہوتا ہے، جل جاتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں اور ایک عرصہ کے لئے چاہے وہ کتنا ہی کم ہو اس نور توحیدی کی چمک آشکار ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ باقی رہے یہ لوگ، تو یہ اس قدر کم ظرف اور بے عقل ہیں کہ -- ”اتنی دیر میں کہ ہم بلا و پریشانی ان سے ہر طرف کر دیں، اس طرح غفلت میں ڈوب جاتے ہیں گویا انھوں نے ہم سے کوئی بالکل تقاضا ہی نہ کیا تھا، اور ہم نے بھی جیسے ان کی کوئی مدد نہیں کی“ ﴿فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَن لَّمْ يَدْعُنَا إِلَى ضُرِّ مَسَّهُ﴾

جی ہاں! اس طرح سے مسرفین کے اعمال کو ان نظر میں مزین کیا گیا ہے۔ ﴿كَذَلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا

يَعْمَلُونَ﴾۔

ایسے افراد کے اعمال کو ان کی نظر میں کون مزین کر کے پیش کرتا ہے؟ اس بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد پنجم سورہ انعام کی آیہ ۱۲۲ کے ذیل میں صفحہ ۳۴۳ (اردو ترجمہ) پر بحث کر چکے ہیں اس بحث کا اجمالی خاکہ یہ ہے کہ زینت دینے

والا خدا ہے لیکن اس طرح سے کہ اس نے برے اور قبیح اعمال میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ جس قدر انسان ان سے آلودہ ہو جاتا ہے اس قدر ان کا زیادہ عادی ہو جاتا ہے اور نہ صرف ان کی برائی اور قباحت اس کی نظر میں ختم ہو جاتی ہے بلکہ وہ اسے آہستہ آہستہ اچھے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

یہ کہ ایسے افراد کو زیر نظر آیت میں ”مصرفین“ (اسراف کرنے والے) کیوں کہا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے زیادہ اسراف کیا ہو گا کہ اپنے وجود کا اہم ترین سرمایہ یعنی عمر، سلامتی، جوانی اور اپنی مختلف صلاحیتوں کو فضول کاموں میں اور گناہ، عصیان اور نافرمانی میں برباد کر دے یا اس دنیا کے لئے بے وقعت اور ناپائیدار مال و متاع کے حصول میں ضائع کر دے اور اس سرمایہ کے بدلے میں اسے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو... کیا یہ کام اسراف نہیں ہے اور کیا ایسے لوگ مصرف شمار نہیں ہوتے؟

انسان قرآن کریم کی نظر میں

انسان کے بارے میں قرآن مجید میں مختلف تعبیرات آئی ہیں:

- بہت سی آیات میں انسان کے لئے لفظ ”بشر“ استعمال ہوا ہے۔ بہت سی دیگر آیات میں لفظ ”انسان“ آیا ہے۔
- کچھ آیات میں ”بنی آدم“ کی تعبیر آئی ہے ہاں البتہ بہت سے مواقع پر اس کے لئے مذموم صفات ذکر ہوئی ہیں۔
- مثلاً زیر بحث آیات میں انسان کا تعارف ایک زود فراموش اور حق شناس موجود کے طور پر کروایا گیا ہے۔
- ایک اور مقام پر اسے ایک ضعیف اور کمزور موجود موجود کہا گیا ہے: ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ ضَعِيفًا﴾۔ (نساء ۲۸)
- ایک اور جگہ اسے ستم گر اور کفر کرنے والا قرار دیا گیا ہے: ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لظَلُومٌ كَفَّارٌ﴾۔ (ابراہیم ۳۴)
- ایک اور مقام پر انسان کو بخیل کہا گیا ہے: ﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُورًا﴾۔ (بنی اسرائیل ۱۰۰)
- ایک اور جگہ جلد باز کہا گیا ہے: ﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا﴾۔ (بنی اسرائیل ۱۱)
- دوسری جگہ کفران کرنے والے قرار دیا گیا ہے: ﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا﴾۔ (بنی اسرائیل ۶۷)
- ایک اور مقام پر اسے جھگڑالو کہا گیا: ﴿كَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾۔ (کھف ۵۴)
- ایک اور جگہ انسان کو ظلوم اور جہول کہا گیا ہے: ﴿إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾۔ (احزاب ۷۲)
- ایک اور جگہ اسے واضح کفر کرنے والا کہا گیا ہے: ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ﴾۔ (زخرف ۱۵)

ایک اور جگہ اسے کم ظرف اور متلون مزاج کہا گیا ہے کہ جو دم بہ دم بدلتا رہتا ہے، نعمت ملے تو بخیل ہو جاتا ہے اور مصیبت کے وقت رونا پیٹنا شروع کر دیتا ہے: ﴿ان الانسان خلق هلوياً اذا مسه الشر جزوعاً و اذا مسه الخير منوعاً﴾۔ (معارج ۱۹، ۲۰، ۲۱)،

ایک اور جگہ اسے مغرور یہاں تک کہ خدا کے سامنے بھی مغرور بتایا گیا ہے:

﴿يا ايها الانسان ما غرك بربك الكريم﴾۔ (انفطار - ۶)

ایک اور مقام پر اسے ایک ایسا موجود بتایا گیا ہے کہ جو نعمت کے وقت طغیان و سرکشی کرتا ہے:

﴿ان الانسان ليطغى ان راه استغنى﴾۔ (علق ۷، ۶)

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں انسان کو ایک ایسا موجود کہا گیا ہے جو بہت زیادہ منفی پہلو رکھتا ہے اور جس میں کمزوری کے بہت سے نقطے موجود ہیں۔

کیا یہ وہی انسان ہے جسے انسان ہے جسے خدا نے ”احسن تقویم“ اور بہترین ساخت میں پیدا کیا ہے:

﴿لقد خلقنا الانسان في احسن تقويم﴾۔ (التین - ۴)

کیا یہ وہی انسان ہے جس کا معلم اور استاد خدا تھا اور جس چیز کو وہ نہیں جانتا تھا اللہ نے اسے اس کی تعلیم دی:

﴿علم الانسان ما لم يعلم﴾۔ (علق - ۵)

کیا یہی وہ انسان ہے جسے خدا نے بیان سکھایا ہے:- ﴿خلق الانسان علمه البيان﴾۔ (رحمن - ۳، ۴)

کیا یہ وہی انسان ہے جسے خدا نے اپنی راہ میں کاوش کے لئے ابھارا ہے:

﴿يا ايها الانسان انك كادح الى ربك كدحاً﴾۔ (انشقاق - ۶)

یہ بات قابل غور ہے کہ خدا کی طرف سے ایسے شرف اور ایسی محبت کے حامل انسانوں میں کمزوری کے یہ پہلو کیسے آگئے۔

ظاہراً یہ ہے کہ تمام مباحث ایسے انسانوں کے بارے میں ہیں جو خدائی رہبروں کے زیر تربیت نہیں رہے بلکہ انھوں نے خود روپودوں کی طرح پرورش پائی ہے ان کا نہ کوئی معلم تھا نہ رہبر و راہنما اور نہ انھیں کوئی بیدار کرنے والا تھا۔ ان کی خواہشات آزاد تھیں اور وہ ہوا و ہوس میں غوطہ زن تھے۔

واضح ہے کہ ایسے انسان نہ صرف یہ کہ فراواں وسائل اور اپنے وجود کے سرمایہ عظیم سے فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ انھیں انحرافی راستوں اور غلط کاموں میں استعمال کرتے ہیں۔ یوں وہ ایک خطرناک موجود کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور آخر کار ناتواں و بے نوا وجود بن جاتے ہیں۔

ورنہ وہ انسان جو ہادیاں برحق کے وجود سے استفادہ کرتے ہیں، اپنی فکر و نظر سے استفادہ کرتے ہیں اور تکامل و ارتقاء اور حق و عدالت کا راستہ اختیار کرتے ہیں، وہ مرحلہ آدمیت میں قدم رکھ کر بنی آدم ہونے کی اہلیت کا اظہار کرتے ہیں اور اس طرح وہ اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ خدا کے علاوہ انھیں کچھ نہیں سوچتا۔

جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾۔

ہم نے بنی آدم کو تکریم و عزت بخشی اور خشکی اور دریا کو ان کی جولان گاہ قرار دیا اور انھیں پاکیزہ رزق دیا اور انھیں اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی
(بنی اسرائیل - ۷۰)

آیات ۱۲، ۱۳

۱۳۔ ﴿وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونََ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَ جَاءَهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَ مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا كَذَلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ﴾۔

۱۴۔ ﴿ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ﴾۔

ترجمہ

۱۳۔ تم سے پہلے کی امتوں نے جب ظلم کیا تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا حالانکہ ان کے پیغمبر واضح دلائل لیکر ان کے پاس آئے تھے مجرم گروہ کو ہم اس طرح سے جزا دیتے ہیں۔

۱۴۔ ان کے بعد پھر ہم نے تمہیں روئے زمین پر ان کا جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو۔

پہلے ظالم اور تم

ان آیات میں بھی ظالموں اور مجرموں کی اس جہان میں سزاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مسلمانوں کو گزشتہ زمانے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ان کے گوش گزار کیا گیا ہے کہ اگر ان کی راہ پر چلیں تو ان جیسی سرنوشت میں گرفتار ہو گے۔ پہلی آیت میں کہا گیا ہے: ہم نے تم سے پہلے کی امتوں کو ہلاک اور نابود کر دیا جبکہ انہوں نے ظلم کیا اور وہ ان انبیاء پر ہرگز ایمان نہ لائے جو ان کے پاس واضح دلائل اور معجزات کے ساتھ ان کی ہدایت کے لئے آئے تھے ﴿وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونََ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَ جَاءَهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَ مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا﴾۔

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: ایسا انجام کسی خاص جماعت سے مخصوص نہیں ہے۔ ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں ﴿كَذَلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ﴾۔

بعد والی آیت میں اس بات کو زیادہ صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس کے بعد ہم نے تمہیں زمین پر ان کا جانشین قرار دیا تاکہ دیکھیں کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو ﴿ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ﴾۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ ”قرون“ کا مطلب:

”قرون“ ”قرن“ کی جمع ہے۔ ”قرن“ عام طور پر ایک طویل زمانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ علماء لغت نے کہا ہے ایسی قوم اور جمیعت کے معنی میں بھی لفظ استعمال ہوتا ہے جو ایک ہی زمانے میں زندگی بسر کرتے ہوں کیونکہ اس کا اصلی مادہ ”اقتران“ سے ہے جس کا مطلب ہے ”نزدیک ہونا۔“ زیر بحث آیت میں بھی ”قروان“ اس معنی میں یعنی ہم عصر گروہوں اور قوموں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

۲۔ قوموں کی بربادی کی وجہ؟

مندرجہ بالا آیات میں قوموں کی بربادی اور نابودی کی علت ظلم قرار دی گئی ہے یہ اس بنا پر ہے کہ لفظ -- ”ظلم“ ایسا وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں ہر قسم کی برائی اور گناہ شامل ہے۔

۳۔ ”﴿وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا﴾“ کا مفہوم:

اس کا معنی ہے ”ایسا نہ تھا کہ وہ ایمان لاتے“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا صرف اس گروہ کو ہلاک کرنے کی سزا دیتا ہے جس کے تائیدہ ایمان لانے کی امید نہ ہو۔ اس طرح سے وہ قومیں کہ جن کے لئے ممکن ہو کہ آئندہ ایمان لے آئیں گی انھیں ایسی سزائیں نہیں دی جاتیں کیونکہ ان دونوں میں بہت فرق ہے کہ ”وہ ایمان نہیں لائے“ اور ”ایسا نہ تھا کہ وہ ایمان لائیں“ (غور کیجئے گا)

۴۔ ”﴿لننظر كيف تعملون﴾“ کا مطلب:

اس کا لفظی معنی یہ ہے: تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو۔“۔ مسلم ہے کہ نہ اس کا مقصود آنکھ سے دیکھنا ہے نہ دل کی نگاہ سے دیکھنا ہے کیونکہ خدا میں دونوں چیزیں نہیں ہیں بلکہ اس مفہوم ہے ایک حالت جو انتظار سے مشابہت رکھتی ہے یعنی تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیا ہے اور ہمیں انتظار ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔

آیات ۱۵، ۱۶، ۱۷

- ۱۵۔ ﴿وَ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَ نَا اِنَّتِ بِفُرْآنٍ غَيْرِ هٰذَا اَوْ بَدَّلْنٰهُ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابٌ يَّوْمٍ عَظِيْمٌ﴾۔
- ۱۶۔ ﴿قُلْ لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْنٰهُ عَلَيْكُمْ وَ لَا اَدْرَاكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾۔
- ۱۷۔ ﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ﴾۔

ترجمہ

- ۱۵۔ اور جس وقت ہماری واضح آیات انھیں سنائی جاتی ہیں تو جو لوگ ہماری ملاقات (اور قیامت) کی امید نہیں رکھتے کہتے ہیں: کوئی قرآن لے آو اس کے علاوہ یا اسے تبدیل کر دو (اور اس میں سے بتوں کی مذمت والی آیتیں نکال دو) کہہ دو: مجھے حق نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے تبدیل کر دوں میں تو صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی ہوتی ہے اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو (قیامت کے) عظیم دن کی سزا سے ڈرتا ہوں۔
- ۱۶۔ کہہ دو: اگر خدا چاہتا تو میں تم پر آیات تلاوت نہ کرتا اور تمہیں ان سے آگاہ نہ کرتا کیونکہ میں نے مدتوں اس سے پہلے تم میں زندگی گزاری ہے، کیا سمجھتے نہیں ہو۔
- ۱۷۔ اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو خدا پر جھوٹ باندھتا ہے اور اس کی آیات کو جھٹلاتا ہے۔ مسلم ہے کہ مجرم فلاح نہیں پائیں گے۔

شان نزول

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیات چند بت پرستوں کے بارے میں نازل ہوئیں ہیں۔ وہ خدمت پیغمبر میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے جو کچھ قرآن میں ہمارے بڑے بتوں لات، عزی، منات اور ہبل کی عبادت کرنے اور ان کی مذمت میں نازل ہوا ہے، ہمارے لئے قابل برداشت نہیں ہے اگر تم چاہتے ہو کہ ہم تمہاری پیروی کریں تو دوسرا قرآن لے آو جس میں ایسی کوئی بات نہ ہو یا پھر کم از کم موجودہ قرآن میں سے ایسی باتیں نکال دو۔ اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں ہیں اور انھیں جواب دیا گیا ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات کی طرح ان آیات میں بھی مبداء اور معاد سے مربوط مسائل سے متعلق بحث جاری ہے۔

پہلے بت پرستوں کے ایک بہت بڑے اشتباہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں جو لوگ قیامت اور ہماری ملاقات پر ایمان نہیں رکھتے، کہتے ہیں: اس کی بجائے کوئی دوسرا قرآن لے آیا پھر کم از کم اس قرآن میں تبدیل کر دو ﴿وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَ نَا آتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدِّلْهُ﴾

یہ بے خبر بے نوا پیغمبر کی رہبری کو قبول نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے خرافات اور باطل افکار کی پیروی کی دعت دیتے تھے۔ آنحضرت سے ایسے قرآن کی خواہش کرتے تھے جو ان کے انحراف کے تابع ہو نہ کہ ان کے معاشرے کا اصلاح کنندہ ہو۔ وہ نہ صرف یہ کہ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور اپنے کاموں میں احساس مسولیت نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کی یہ گفتگو نشاندہی کرتی تھی کہ انھوں نے نبوت کے مفہوم کو بالکل سمجھا ہی نہ تھا یا وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

قرآن صراحت کے ساتھ انھیں اس عظیم اشتباہ سے باہر نکالتا ہے اور پیغمبر اکرم کو حکم دیتا ہے کہ ان سے کہہ دو: میرے لئے ممکن نہیں ہے کہ میں خود اس میں تبدیلی کر دوں ﴿قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي﴾^(۱)

اس کے بعد تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: میں فقط اس کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی ہوتی ہے ﴿إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ﴾ نہ صرف یہ کہ میں اس آسمانی وحی میں تبدیلی نہیں کر سکتا بلکہ میں اگر اپنے پروردگار کے حکم سے تھوڑا سا بھی تخلف کروں تو (قیامت کے) اس عظیم دن کی سزا سے ڈرتا ہوں ﴿إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾

اگلی آیت میں اس بات کی دلیل پیش کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے، ان سے کہہ دو: ”اس کتاب میں میرے ارادے کا ذرہ بھر بھی دخل نہیں ہے اور اگر خدا چاہتا تو ان کی آیات کی میں تمہارے سامنے تلاوت نہ کرتا اور تمہیں اس سے آگاہ نہ کرتا“۔ ﴿قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ﴾ اس لئے کہ میں نے قبل ازیں بہت عرصہ تم میں زندگی گزاری ہے اور تم نے کبھی بھی مجھ سے ایسی باتیں نہیں سنیں اگر یہ آیات میری طرف سے ہوتیں تو لازماً اس چالیس سال کی مدت میں میری فکر سے میری زبان پر جاری ہوتیں۔ کم از کم ان کا کچھ حصہ تو بعض لوگ ہم سے سنتے (بہرِ فائدہ لُبثت فیکم عُمْراً مِنْ قَبْلِهِ) کیا یہ واضح بات نہیں سمجھ سکتے ﴿أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾

پھر مزید تاکید کے لئے فرمایا گیا ہے: میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ ظلم کی بدترین قسم یہ ہے کہ کوئی شخص خدا پر اقراء باندھے۔

”اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے کہ جو خدا کی طرف جھوٹی نسبت دے“ ﴿فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا﴾۔

لہذا کیونکر ممکن ہے کہ میں ایسے بڑے گناہ کا مرتکب ہوں اسی طرح جو شخص آیات الہی کی تکذیب کرے.. تو یہ بھی بہت بڑا ظلم ہے ﴿أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ﴾۔
اگر تم آیات حق کی تکذیب اور انکار کے گناہ کی عظمت سے بے خبر ہو تو میں بے خبر نہیں ہو سکتا۔ بحر حال تمہارا یہ کام بہت بڑا ظلم ہے ”اور مجرم کبھی فلاح اور کامیابی حاصل نہیں کر سکتے“ ﴿إِنَّهُ لَا يَفْلَحُ الْمُجْرِمُونَ﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ مشرکین کی دو تبادول خواہشوں میں فرق:

مشرکین پیغمبر خدا سے یہ خواہش کرتے تھے کہ یا تو قرآن کو کسی اور کتاب سے بدل دیں یا قرآن میں تبدیلی کر دیں ان دونوں کے درمیان فرق واضح ہے۔ ان کے پہلے تقاضے میں ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ کتاب بالکل ختم ہو جائے اور اس کی جگہ پیغمبر کی طرف سے دوسری کتاب آجائے لیکن دوسرے تقاضے میں وہ چاہتے تھے کہ کم از کم وہ آیات جو بتوں کے خلاف ہیں وہ تبدیل ہو جائیں تاکہ انہیں اس طرف سے کسی قسم کی پریشانی لاحق نہ ہو۔
ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کیسے قطعی لہجہ میں انہیں جواب دیتا ہے کہ نہ کتاب کا تبادلہ پیغمبر کے اختیار میں ہے نہ رد و بدل اور نہ وحی تاخیر یا جلدی۔

واقعاً ان کے افکار و نظریات کیسے پست اور ناقص تھے وہ ایسے پیغمبر کی اطاعت کرنا چاہتے تھے کہ جو ان کے خرافات اور ہوا و ہوس کا پیرو ہونا کہ جو خود پیشوا، رہبر، مربی اور رہنماء ہو۔

۲۔ پیغمبر اکرم کے جواب پر ایک نظر:

یہ بات قابل توجہ ہے کہ پیغمبر خدا ان کے دو تقاضوں کے جواب میں صرف ان کی دوسری خواہش کے انجام دینے کی توانائی نہ رکھنے کا ذکر کرتے ہیں کہ میں اپنی طرف سے اس میں کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا۔ اس بیان سے دراصل ان کی پہلی خواہش کی بطریق اولیٰ نفی ہو جاتی ہے کیونکہ جب بعض آیات میں تغیر و تبدل پیغمبر کے اختیار میں نہیں تو کیا اس

ساری آسمانی کتاب کو بدل دینا اس کے لئے ممکن ہے اس تعبیر میں ایک خاص وضاحت پائی جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ایک بھی اضافی جملہ یا لفظ کہے بغیر انتہائی جچے تلے اور مختصر الفاظ میں تمام مسائل بیان کرتا ہے۔

۳۔ ایک اشکال اور اس کی وضاحت:

ہو سکتا ہے کہا جائے۔ جو دلیل قرآن کے پیغمبر کی طرف سے ہونے کی نفی کے لئے اور اس کے حتماً خدا کی طرف سے ہونے کے بارے میں زیر نظر آیات میں پیش کی گئی ہے وہ مطمئن کرنے والی نہیں ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اگر یہ کتاب پیغمبر کی طرف سے ہو تو حتماً اس جیسا کلام انہوں نے اس سے قبل آپ سے سنا ہو۔ لیکن تھوڑا سا غور کرنے سے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کیونکہ جو کچھ ماہرین نفسیات کہتے ہیں اس کے مطابق نبوغ، ایجاد اور تخلیق کی صلاحیتوں کا اظہار عموماً انسان میں بیس سال کی عمر میں شروع ہو جاتا ہے اور زیادہ سے زیادہ پینتیس سے چالیس سال تک رہتا ہے یعنی اگر انسان اس عمر تک اپنی ان صلاحیتوں سے کام نہ لے تو اس کے بعد عام طور پر ممکن نہیں رہتا۔

یہ امر جو آج کل علم نفسیات کے حوالے سے معلوم ہوا ہے مثلاً اس سے پہلے اس حد تک واضح نہیں تھا مگر اکثر لوگ فطرت کی ہدایت سے اس امر کی طرح توجہ رکھتے ہیں کہ معمول کے مطابق ممکن نہیں ہے کہ ایک انسان ایک روش، مکتب اور نظریہ رکھتا ہو اور چالیس سال ایک قوم میں زندگی گزار لے اور بالکل اسے ظاہر نہ کرے قرآن بھی اسی بنیاد کا سہارا لیتا ہے کہ اس سن و سال میں کس طرح ممکن تھا کہ پیغمبر ایسے افکار و نظریات رکھتا ہو اور انہیں بالکل چھپائے رکھے۔

۴۔ سب سے زیادہ ظالم کون ہے؟:

جیسا کہ ہم سورہ انعام کی آیہ ۲۱۔ کے ذیل میں اشارہ کر چکے ہیں کہ قرآن میں بہت سے موقع پر کسی ایک گروہ کو سب سے بڑھ کر ظالم (اظم) قرار دیا گیا ہے۔ ابتداء میں شاید یہ نظر آئے کہ ان میں ایک دوسرے سے تضاد پایا جاتا ہے کیونکہ جب ایک گروہ کو سب سے زیادہ ظالم قرار دیا جائے تو بھر دوسرے کو کیسے یہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔

اس سوال کے جواب میں ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ تمام عناوین دراصل ایک ہی عنوان کی طرف لوٹتے ہیں اور وہ ہے شرک، کفر، عناد آیات خداوندی کی تکذیب اور خدا پر افتراء۔ زیر بحث آیت میں بھی یہی صورت ہے۔

مزید وضاحت کے لئے جلد پنجم ص ۱۶۰ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

۱۔ لفظ ”تلقاء“ مصدر ہے یا اسم مصدر ہے یہ مقابلے اور آمنے سامنے کے معنی میں آیا ہے اس آیت میں اور ایسے مقامات پر یہ نزدیک اور ماحیہ کے معنی میں ہے یعنی میں اپنی طرف سے اور خود سے تبدیلی نہیں کر سکتا۔

آیت ۱۸

۱۸ - ﴿وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُولُونَ هَؤُلَاءِ شَفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَ لَا فِي الْأَرْضِ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾ -

ترجمہ

۱۸- اور خدا کی بجائے کچھ چیزوں کی پرستش کرتے ہیں کہ جو نہ انہیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ فائدہ دیتی ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کے پاس یہ ہمارے شفیع ہیں، کہہ دو: کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ آسمانوں اور زمین میں نہیں جانتا۔ وہ ان شریکوں سے منزہ اور بلند و برتر ہے جو تم قرار دیتے ہو۔

بے اثر معبود

اس آیت میں بھی بحث توحید جاری ہے یہاں بتوں کی الوہیت کی نفی کی گئی ہے اور ایک واضح دلیل کے ذریعہ بتوں کا بے وقعت اور بے قیمت ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے: وہ خدا کی بجائے کچھ معبودوں کی پرستش کرتے ہیں کہ جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں کہ ان کی طرف سے نقصان کے خوف سے ان کی پرستش کریں اور نہ ہی انہیں کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں کہ ان کی جانب سے فائدے کی وجہ سے ان کی عبادت کریں (وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ)۔ واضح ہے کہ اگر فرض کریں بت سود و زیاں پہنچا سکتے ہیں پھر بھی عبادت کے لائق نہ تھے لیکن قرآن اس تعبیر کے ذریعہ یہ نکتہ سمجھاتا ہے کہ بت پرستوں کے پاس اس بات کا چھوٹے سے چھوٹا بہانا بھی نہیں ہے اور وہ ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں کہ جن میں بالکل کوئی خاصیت نہیں ہے اور یہ بدترین اور قبیح ترین پرستش ہے۔

اس کے بعد قرآن بت پرستوں کا ایک بے ہودہ دعویٰ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ کہتے ہیں کہ بت بارگاہ الہی میں ہمارے شفیع اور سفارشی ہیں۔ یعنی خود ان سے کچھ نہیں ہو سکتا تو شفاعت کے ذریعہ سود و زیاں کر سکتے ہیں ﴿وَقُلُوبُهُمْ هَؤُلَاءِ شَفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ﴾

بت پرستی کا یا کہ سبب بتوں کی شفاعت کا اعتقاد تھا اور جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے جس وقت عربوں کا ایک بزرگ عمر بن لُحی شام کے معدنی پانیوں سے استفادہ کرنے اور اپنا علاج کرنے اس علاقہ میں گیا تو اسے بت پرستوں کا طریقہ بہت اچھا لگا جب اس نے ان سے اس پرستش کی دلیل پوچھی تو انہوں نے اس سے کہا کہ یہ بت بارش برسنے، مشکلات حل ہونے اور بارگاہ خدا میں شفاعت کا ذریعہ ہیں وہ چونکہ ایک فضول سا آدمی تھا اس سے متاثر ہو گیا اور خواہش کی کہ کچھ بت

ایسے دئے جائےں تاکہ وہ انہیں حجاز میں لے جائےں۔ اس طریقہ سے بت پرستی اہل حجاز میں رائج ہو گئی۔ تو اس خیال کے جواب میں قرآن کہتا ہے: کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جسے آسمانوں اور زمین مکیں وہ نہیں جانتا ﴿قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ﴾

یہ امر اس کے لئے کنایہ ہے کہ اگر خدا کے پاس ایسے شفیع ہوتے تو وہ زمین و آسمان کے جس نقطے میں ہوتے ان کے وجود سے آگاہ ہوتا کیونکہ علم خدا کی وصیت اس طرح سے ہے کہ آسمان اور زمین میں چھوٹے سے چھوٹا ذرا بھی ایسا نہیں جس سے آگاہ نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ بالکل اس طرح ہے کہ کسی سے کہا جائے کہ کیا تمہارا کوئی اس طرح کا نمائندہ ہے؟ اور وہ جواب دے کہ میں ایسے نمائندے کے وجود کی خبر نہیں رکھتا، تو یہ اس کے وجود کی نفی کے لئے بہترین ہے کیونکہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص اپنے نمائندے کے وجود سے بے خبر ہو۔

آیت کے آخر میں تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: خدا ان کے شریکوں سے منزہ اور برتر ہے جو وہ بتاتے ہیں ﴿سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾

شفاعت کے بارے میں جلد اول ص ۱۸۷ (اردو ترجمہ) اور جلد دوم (اردو ترجمہ) پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔

آیت ۱۹

۱۹۔ ﴿وَ مَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَفُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ﴾۔

ترجمہ

۱۹۔ اور (ابتدائیں) سب لوگ ایک ہی امت تھے پھر وہ اختلاف کرنے لگے اور اگر تیرے پروردگار کی طرف سے (انہیں فوری سزا نہ دے نے کے بارے میں) حکم نہ ہوتا تو جس چیز کے بارے میں وہ اختلاف کرتے ہیں اس کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

تفسیر

یہ آیت اس بحث کی مناسبت سے جو گزشتہ آیت میں شرک اور بت پرستی کی نفی کے سلسلے میں گزر چکی ہے تمام انسانوں کی توحیدی فطرت کی طرف اشارہ کرتی ہے اور کہتی ہے: ابتداء میں تمام انسان امت واحد تھے اور توحید کے علاوہ کسی کا کوئی دین نہ تھا ﴿وَ مَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً﴾

ابتداء میں تو اس طرح توحیدی فطرت کو کسی کا ہاتھ نہیں لگا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پست افکار اور شیطانی رجحانات کے زیر اثر یہ دگرگوں ہونگی کچھ لوگ جادہ توحید سے منحرف ہوں گے اور انہوں نے شرک کا رخ کر لیا یوں فطرتاً انسانی معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ایک گروہ موحد اور دوسرا مشرک ﴿فَاخْتَلَفُوا﴾

اس بناء پر شرک در حقیقت ایک قسم کی بدعت اور فطرت سے انحراف ہے جس کا سرچشمہ کچھ اوہام اور بے بنیاد خیالات ہیں۔

ممکن تھا اس موقع پر یہ سوال کیا جاتا کہ خدا تعالیٰ مشرکین کو فوری طور پر سزا دے کر یہ اختلاف کیوں نہیں ختم کر دیتا تا کہ تمام انسانی معاشرہ سے پھر موحد بن جائے اس سوال کے جواب کے لئے قرآن بلا فاصلہ کہتا ہے: اگر پہلے سے ہدایت کے بارے میں انسانی آزادی کے متعلق خدا کا فرمان نہ ہوتا جو کہ انسانی تکامل اور ترقی کی بنیاد ہے تو خدا بہت جلدی ان کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کر دیتا جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے اور مشرکین و منحرفین کو کیفر کردار تک پہنچا دیتا۔

﴿وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَفُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ﴾

اس بناء پر مندرجہ بالا آیت میں لفظ ”کلمہ“ انسانوں کی آزادی کے بارے میں سنت اور حکم فطرت کی طرف اشارہ ہے جو ابتداء سے اسی طرح ہے اگر منحرفین اور مشرکین کو فوراً سزا دے دی جائے تو موحدین کا ایمان تقریباً اضطرابی

اور جبری ہو جائے گا اور حتماً خوف اور وحشت کی بناء پر ہوگا ایسا ایمان نہ سرمایہ ایمان ہے نہ تکامل اور ارتقاء کی دلیل ہے یہ فیصلہ اور یہ سزا خدا نے زیادہ تر دوسرے جہان کے لئے چھوڑ دی ہے تاکہ نیک اور پاک لوگ آزادی سے اپنی راہ منتخب کریں۔

آیت ۲۰

۲۰۔ ﴿وَيَقُولُونَ لَوْ لَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ﴾۔

ترجمہ

۲۰۔ اور کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے کیوں کوئی معجزا نازل نہیں ہوا کہہ دو: غیب (اور معجزات) خدا کے لئے (اور اس کے حکم سے) ہیں۔ تم انتظار کرو اور میں بھی تمہارے انتظار میں ہوں (تم مند پسند اور بہانہ جو یا نہ معجزات کے انتظار میں رہو اور میں بھی تمہاری سزا کے انتظار میں ہوں)۔

من پسند معجزات

ایمان اور اسلام سے روگردانی کرتے ہوئے مشرکین جو بہانے بناتے تھے قرآن دوبارہ ان کا ذکر کر رہا ہے کہتا ہے: مشرکین کہتے ہیں کہ خدا کی طرف سے پیغمبر پر کوئی معجزا کیوں نازل نہیں ہوتا ﴿وَيَقُولُونَ لَوْ لَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ﴾ البتہ قرآن سے جن کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مراد ہر قسم کا معجزا نہیں تھا۔ کیونکہ مسلم ہے کہ پیغمبر اسلام کے قرآن کے علاوہ اور بھی معجزات تھے۔ تو تاریخ اسلام اور بعض آیات قرآن اس حقیقت پر گواہ ہے بلکہ ان کی مراد یہ تھی کہ جب بھی وہ کسی من پسند معجزے کی خواہش کریں فوراً اسے پورا کیا جائے۔ وہ خیال کرتے تھے کہ اعجاز ایک ایسی چیز ہے جو پیغمبر کے اختیار میں ہے اور آپ خود جس وقت جس قسم کے معجزے کا ارادہ کریں انجام دے سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں شاید وہ سمجھتے تھے کہ اپنی اس قوت سے ہر ہٹ دھرمی اور بہانہ جو مدعی کے سامنے کام لیں اور اس کی خواہش کے مطابق عمل کرے۔

لہذا بال فاصلہ پیغمبر اکرم کو حکم دیا گیا ہے: ان سے کہہ دو کہ معجزہ خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور عالم غیب اور ما وراء الطبیعت سے مربوط ہے ﴿فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ﴾ اس بناء پر معجزا کوئی ایسی چیز نہیں جو میرے اختیار میں ہو اور میں تمہاری خواہش کے مطابق ہر روز ایک نیا معجزا دکھاؤں اور پھر بھی تم حیلے بہانے کر کے ایمان نہ لاؤ۔

آیت کے آخر میں انہیں دھمکی کے انداز میں کہا گیا ہے: اب جبکہ تم ہٹ دھرمی سے دست بردار نہیں ہوتے تو انتظار میں رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار میں ہوں ﴿فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ﴾۔ تم خدائی سزا کے انتظار میں رہو اور میں بھی کامیابی کا منتظر ہوں یا یہ کہ تم اس قسم کے معجزہ کے انتظار میں رہو اور میں بھی تم ہٹ دھرم لوگوں کی سزا کے انتظار میں ہوں۔

دو اہم نکات

۱۔ آیت میں معجزے سے مراد کیا ہے:

جیسا کہ ہم سطور بالا میں اشارہ کر چکے ہیں لفظ ”آیہ“ (معجزہ) اگرچہ مطلق ہے اور اس کے مفہوم میں ہر قسم کا معجزہ شامل ہے لیکن ہمارے پاس ایسے قرائن موجود ہیں جو نشانہ ہی کرتے ہیں کہ وہ معرفت پیغمبر کے لئے معجزہ طلب نہیں کرتے تھے بلکہ دل پسند معجزات کے خواہاں تھے یعنی وہ ہر روز ایک نئے معجزے کے طلب گار ہوتے تھے اور اس کے لئے روزانہ رسول اللہ سے ایک نیا مطالبہ کرتے تھے اور توقع رکھتے تھے کہ آپ ان کا مطالبہ قبول کر لیں گویا ان کی نظر میں پیغمبر ایک بیکار انسان تھے کہ جنہوں نے تمام معجزات کی کلید اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی اور منتظر رہتے تھے کہ کوئی کسی طرف سے آجائے اور ان سے معجزے کی فرمائش کرے وہ اس بات سے غافل تھے کہ اول تو معجزہ فعل خدا ہے اور اسی کے فرمان سے انجام پاتا ہے اور دوم یہ کہ معجزہ پیغمبر کی شناخت کے لئے لوگوں کی ہدایت کے لئے ہے اور اس کا ایک ہی موقع اس مقصد کے لئے کافی ہے۔ علاوہ ازیں پیغمبر اسلام نے کافی معجزات ان کے سامنے پیش بھی کئے تھے۔ مزید برآں ان لوگوں کا مقصد اپنی ذاتی کاہش کی تسکین کے اور کچھ نہ تھا۔

مندرجہ بالا جملے میں ”آیہ“ سے مراد من پسند کے معجزات ہیں۔ اس بات کے لئے مندرجہ ذیل امور کو بطور شاہد پیش کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ آیت کے ذیل میں انہیں دھمکی دی گئی ہے اور اگر واقعاً وہ حقیقت شناسی کے لئے معجزا طلب کرتے تو انہیں ہر گز تحدید نہ کی جاتی۔

۲۔ پہلے کی چند آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ وہ اس قدر ہٹ دھرم تھے کہ رسول اللہ سے کہتے تھے کہ اپنی آسمانی کتاب کو تبدیل کر کے کوئی دوسری کتاب لے آئیں یا کم از کم وہ آیات جو بت پرستی کی نفی کرتی ہیں۔ ان میں رد و بدل کر دیں۔

۳۔ قرآن حکیم میں آیات کی تفسیر کے لئے ایک تسلیم شدہ طریقہ بتایا گیا ہے کہ القرآن یفسرہ بعضہ بعضاً۔

یعنی..... قرآنی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں۔

اس حوالے سے اگر قرآن کی آیات مثلاً سورہ بنی اسرائیل ۹۰ اور ۹۴ کو دکھایا جائے تو اچھی طرح سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ہٹ دھرم بت پرست ہدایت کے لئے معجزہ طلب نہیں کرتے تھے اسی لئے کبھی کہتے تھے کہ ہم اس وقت تک

آپ ایمان نہیں لائیں گے جب تک اس خشک زمین سے چشمے نہ نکال کر دکھاؤ۔ کوئی کہتا یہ بھی کافی نہیں ہے بلکہ تمہارے پاس سونے کا محل ہونا چاہیے۔ کوئی اور کہتا کہ اس سے بھی ہماری تسلی نہیں ہوگی بلکہ ہماری آنکھوں کے سامنے آسمان کی طرف پرواز کرو کوئی کہتا کہ آسمان کی طرف پرواز کرنا بھی کافی نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے ہمارے نام خط لے کر آؤ۔ اسی طرح کی یادہ گوئیاں اور فضول باتیں کرتے تھے۔

جو کچھ ہم نے اس ضمن میں کہا ہے اس سے واضح ہو گیا ہے کہ جو لوگ چاہتے ہیں کہ زیر بحث آیت کو ہر قسم کے معجزے یا قرآن کے علاوہ معجزات کی نفی کی دلیل قرار دیں وہ اشتباہ میں ہیں۔ اس مسئلے کے بارے میں مزید وضاحت انشاء اللہ سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۵۹ کے ذیل میں آئے گی۔

۲۔ ﴿انما الغیب للہ﴾ ”میں غیب“ کا مفہوم:

ہو سکتا ہے یہ اس طرف اشارہ ہو کہ معجزہ ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق عالم غیب سے ہے اور وہ میرے اختیار میں نہیں ہے اور خدا کے ساتھ مخصوص ہے یا اس طرف اشارہ ہو کہ مصلح امور اور یہ کہ کسی موقع پر حکمت مصلحت کا تقاضا ہے کہ معجزہ پیش کیا جائے۔ دوسرا یہ غیب میں سے ہے اور خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔ وہ جس موقع پر مصلحت دیکھتا ہے اور معجزہ طلب کرنے والے کو حقیقت کا متلاشی سمجھتا ہے۔ معجزہ نازل کرتا ہے۔ کیونکہ غیب اور اسرار نہاں اس کی ذات پاک سے مخصوص ہیں۔

ان میں سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

آیات ۲۱، ۲۲، ۲۳

۲۱۔ ﴿وَإِذَا أَدْقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْ بَعْدِ ضَرَاءٍ مَّسَّتْهُمْ إِذَا لَّهُمْ مَكْرٌ فِي آيَاتِنَا قُلِ اللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُوبُونَ مَا تَمْكُرُونَ﴾۔

۲۲۔ ﴿هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَ تَهَاوِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَ هُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَجَبْنَاهُمْ مِنْ هَذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ﴾۔

۲۳۔ ﴿فَلَمَّا أَتَاهُمْ إِذَا هُمُ يَبْعُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾۔

ترجمہ

۲۱۔ جب لوگوں کو پہنچنے والے نقصان کے بعد ہم انہیں رحمت کا مزہ چکھائےں تو وہ ہماری آیات کے بارے میں مکر کرتے ہیں کرتے ہیں (اور اس نعمت و رحمت کے لئے غلط سلط تو جہات کرتے ہیں) کہہ دو کہ خدا تم سے زیادہ جلدی چارہ جوئی کرتا ہے اور جو کچھ مکر (اور سازش) تم کرتے ہو ہمارے رسول اسے لکھتے ہیں۔

۲۲۔ وہ وہ ہے جو تمہیں خشکی اور دریا میں سیر کراتا ہے یہاں تک کہ تم کشتی میں ہوتے ہو اور موافق ہوائیں انہیں (منزل مراد کی طرف) لے جاتی ہیں۔ اچانک سخت آندھیاں چلنے لگتی ہیں اور ہر طرف سے موجیں انہیں گھیر لیتی ہیں اور وہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ وہ ہلاک ہو جائیں گے تو اس وقت خدا کو خلوص سے پکارتے ہیں کہ اگر تو ہمیں نجات دے دے تو ہم یقیناً شکر ادا کریں گے۔

۲۳۔ لیکن جب اس نے انہیں نجات بخشی تو وہ (دوبارہ) زمین میں ناحق ظلم کرتے ہیں۔ اے لوگو! تمہارے ظلم و ستم تمہارے لئے ہی نقصان دہ ہیں۔ دنیاوی زندگی سے فائدہ (اٹھاتے ہو) پھر جلد ہی تمہاری بازگشت ہماری طرف ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو (خدا) تمہیں اس کی خبر دے گا۔

تفسیر

ان آیات میں دوبارہ گفتگو عقائد کے بارے میں اور مشرکین کے کرتوتوں کے بارے میں ہے۔ نیز انہیں توحید کی طرف اور شرک کی نفی کی جانب دعوت دی گئی ہے۔

زیر نظر پہلی آیت میں مشرکین کی ایک جاہلانہ سازش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے :

جب لوگوں کو بیداری اور آگاہی کے لئے ہم مشکلات اور نقصانات میں گرفتار کرتے ہیں پھر انھیں دور کر کے ہم انھیں سکون اور اپنی رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ ہماری طرف متوجہ ہوں، ان آیات اور نشانیوں کا مذاق اڑاتے ہیں یا غلط توجیہات کر کے ان کا انکار کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً مصائب و مشکلات کو بتوں کے غیض ع غضب کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور راحت و نعمت کو ان کی شفقت و محبت کی دلیل کہتے ہیں یا پھر سب کو اتفاقات شمار کرتے ہیں۔ ﴿وَإِذَا أَدْفَنَّا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْ بَعْدِ ضَرَاءٍ مَّسَّتْهُمْ إِذَا لَّهُمْ مَكْرٌ فِي آيَاتِنَا﴾

لفظ ”مکر“ جو مندرجہ بالا آیت میں آیا ہے، ہر قسم کی چارہ جوئی کے معنی میں ہے یہ ان غلط توجیہات اور فرار کی راہوں کی طرف اشارہ ہے جو مشرکین آیات الہی کے نزول، بالاوی آمد اور نعمتوں کے ظہور کے وقت سوچتے تھے۔ لیکن اللہ انھیں اپنے پیغمبر کے ذریعہ خبردار کرتا ہے کہ ”ان سے کہہ دو: کہ خدا ہر کسی سے بڑھ کر سرکوبی کرنے والی چارہ جوئی اور منصوبہ بندی پر قادر ہیں اور زیادہ تیز ہے ﴿قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا﴾“

جیسا کہ ہم نے بارہا اشارہ کیا ہے ”مکر“ ہم قسم کی ایسی چارہ جوئی کو کہتے ہیں جسے خفیہ طور پر بجا لایا جائے اور اس کا وہ معنی نہیں جو آج کل فارسی میں مروج ہے۔ فارسی میں آج کل ”مکر“ میں شیطانی کاموں کا مفہوم بھی شامل ہے لہذا اس لفظ کے حقیقی معنی کو سامنے رکھا جائے تو یہ خدا کے بارے میں بھی صادق آتا ہے اور بندوں کے بارے میں بھی۔

(۱)

باقی رہا یہ کہ زیر بحث آیت میں اس ”مکر“ کا مصداق کیا ہے تو ظاہراً پروردگار کی انھیں سزاؤں کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں سے بعض انتہائی مخفی طور پر اور بغیر کسی تمہید کے بڑی تیز رفتاری سے آپہنچتی ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات تو مجرمین کو خود انھیں کے ہاتھ سے سزا دی جاتی ہے۔

واضح ہے کہ وہ ذات جو سب سے زیادہ قادر ہے، موانع دور کرنے اور اسباب نہاں کرنے کی سب سے زیادہ طاقت رکھتی ہے۔ اس کے منصوبے اور تدبیریں بھی سب سے زیادہ تیز ہو گئیں دوسرے لفظوں میں وہ جس وقت کسی کو سزا دینے اور تنبیہ کرنے کا ارادہ کرے تو وہ فوراً عملی صورت اختیار کر لیتی ہے جبکہ دوسرے اس طرح سے نہیں ہیں۔

اس کے بعد انھیں تحدید کی گئی ہے کہ یہ گمان نہ کرو کہ یہ سازشیں اور منصوبے فراموش ہو جائیں گے بلکہ ہمارے بھیجے ہوئے یعنی اعمال ثبت کرنے والے فرشتے ان تمام منصوبوں اور سازشوں کو لکھ لیتے ہیں جنہیں تم نور حق کو خاموش

کرنے کے لئے تیار کرتے ہو ﴿إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ﴾ لہذا تم اپنے آپ کو جو ابدی اور دوسرے جہان میں سزا پانے کے لئے تیار کر لو۔

ثبت اعمال اور اس کام پر معمور فرشتوں کے بارے میں ہم متعلقہ آیات کے ذیل میں بحث کریں گے۔

اگلی آیت میں انسانی فطرت کی گہرائیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے سامنے توحید فطری کا ایک نمونہ پیش کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ عظیم مشکلات اور خطرے کے وقت کسی طرح انسان خدا کے علاوہ تمام چیزوں کو بھول جاتا ہے لیکن جو نہی مصیبت ثلثی ہے اور مشکلات کی آگ ٹھنڈی پڑتی ہے تو وہ دوبارہ ظلم و ستم کی راہ اختیار کر لیتا ہے اور خدا سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ خدا وہ ہے جو تمہیں سہرا اور دریا میں سیر کراتا ہے ﴿هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾۔ ”یہاں تک کہ جب تم کشتی میں سوار ہوتے ہو اور کشتی میں سوار لوگوں کو موافق ہو انیں آہستہ آہستہ مقصد کی طرف لے جا رہی ہوتی ہیں اور سب کے سب شادمان اور خوش ہوتے ہیں“ ﴿حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِكِ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَ فَرَحُوا بِهَا﴾۔ ”اچانک شدید طوفان اور تباہ کن آندھیاں چلنے لگتی ہیں اور ہر طرف سے موجیں اٹھتی ہیں اس طرح سے کہ انھیں اپنی موت نظر آنے لگتی ہے اور وہ زندگی سے گویا ہاتھ دوھو بیٹھتے ہیں ﴿جَاءَهُمْ رِيحٌ عَاصِفٌ وَ جَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَ ظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ﴾۔ ٹھیک اس وقت وہ خدا کو یاد کرنے لگتے ہیں اور اسے خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں اور اپنے دین کو ہر قسم کے شرک اور بت پرستی سے اپک کر لیتے ہیں ﴿دَعَوْا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾۔

اس وقت وہ دست دعا بلند کرتے ہیں:۔ خدایا اگر تو نے اس ہلاکت انگیزی سے نجات بخش دی تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے، ظلم کریں گے نہ تیرے غیر کی طرف رخ موڑیں گے ﴿لَئِنْ أَنْجَيْتَنَا مِنْ هَذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ﴾۔

لیکن جب خدا انھیں نجات دے دیتا ہے اور وہ ساحل مراد تک جا پہنچتے ہیں تو زمین میں ظلم و ستم شروع کر دیتے ہیں ﴿فَلَمَّا أَنْجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾

مگر اے لوگوں جان لو کہ جیسے ظلم کے مرتکب ہو گے اور حق سے جس قدر انحراف کرو گے اس کا نقصان خود تمہیں ہی ہوگا ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ﴾۔ آخری کام جو تم انجام دے سکتے ہو یہ ہے کہ ”چند روز حیات دنیا کی

متاع سے فائدہ اٹھا لو“ ﴿مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (۲)

اس کے بعد تمہاری بازگشت ہماری طرف ہے ﴿ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ﴾ ”اس وقت ہم تمہیں اس سے آگاہ کریں گے جو تم انجام دیتے تھے ﴿فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ لوگ عموماً ایسا کرتے ہیں:

مندرجہ بالا آیت میں جو کچھ ہم نے پڑھا ہے وہ بت پرستوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ عموماً ایسا ہوتا ہے تمام آلودہ، دنیا پرست، کم ظرف اور فراموش کار افراد ایسا کرتے ہیں جب انہیں بلا و صیت کی موجیں گھیر لیتی ہیں وہ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں لیکن کچھ نہیں بنتا گویا تلوار ان کی شہ رگ تک پہنچتی ہے اور انہیں کوئی یار و مددگار نظر نہیں آتا تو بارگاہِ خدا میں ہاتھ اٹھاتے ہیں اس سے ہزاروں عہد و پیمان باندھتے ہیں اور نذر و نیاز مانتے ہیں کہ اگر بلاؤں اور مصائب سے نجات ملی تو بہ کریں گے اور وہ یہ کریں گے لیکن یہ بیداری اور آگاہی جو توحید فطری کا انعکاس ہے ایسے افراد میں زیادہ دیر نہیں رہتی... جو نہی طوفان بلا ختم ہو جاتا ہے اور مشکل حل ہو جاتی ہے۔ غفلت کے پردے ان کے دل پر پڑ جاتے ہیں... ایسے بھاری پردے کہ جنہیں طوفان بلا کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہٹا سکتی۔

یہ وقتی بیداری اگرچہ زیادہ آلودہ افراد پر کوئی اثر نہیں کرتی تاہم ان پر حجت تمام کر دیتی ہے اور یہی ان کے مذموم و محکوم ہونے کی دلیل بن جائے گی۔

دوسری طرف کم آلودہ افراد ایسے حوادث میں عموماً بیدار ہو جاتے ہیں اور اپنے طریقہ کار کی اصلاح کر لیتے ہیں۔ باقی رہے بندگانِ خدا تو ان کا حساب و کتاب واضح ہے۔ وہ عالم سکون میں بھی خدا کی طرف اتنا ہی متوجہ رہتے ہیں، جتنا سختی اور تنگی کے عالم میں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہر خیر و برکت جو ظاہراً طبعی اور فطری عوامل کے ذریعہ انہیں پہنچتی ہے درحقیقت خدا کی طرف سے ہے۔

بحر حال یہ یاد آوری اور تذکر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ہے۔

۲۔ ”ضراء“ کے مقابلے میں ”رحمت“:

مندرجہ بالا آیات میں ”ضراء“ (یعنی پریشانی اور نقصان) کے مقابلے میں ”رحمت“ کا ذکر ہے نہ کہ ”سراء“ (خوشی اور مسرت) کا۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جیسی بھی اچھائی اور بھلائی انسان کو پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے اور

اس کی رحمت بے پایاں ہے جبکہ مشکلات اگر درس عبرت کے طور پر نہ ہوں تو خود انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

۳۔ ضمیروں کا فرق کیوں ہے؟

زیر بحث دوسری آیت کی ابتداء میں مخاطب ضمیریں ہیں لیکن بعد میں غایب کی ضمیریں ہیں۔
یقیناً اس میں کوئی نکتہ ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیت کے لب و لہجہ میں یہ تبدیلی اس بناء پر ہے کہ مشرکین کی حالت جبکہ وہ گرفتار بلا ہوں تو دوسروں کے لئے درس عبرت کے طور پر ان کا ذکر کیا جائے اس لئے انہیں غایب ذکر کیا گیا ہے اور باقی کو حاضر

بعض دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ اس میں یہ نکتہ ہے ان سے بے اعتنائی اور ان کی تحقیر کا اظہار ہو گیا پہلے خدا تعالیٰ انہیں حاضر کے طور پر قبول کر کے مخاطب قرار دیتا ہے اس کے بعد انہیں اپنے سے دور کر کے چھوڑ دیتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ آیت لوگوں کی ایک فطری تصویر کر رہی ہے جب تک وہ کشتی میں بیٹھے ہیں اور ساحل سے دور نہیں ہوئے تو دیگر لوگوں کے درمیان ہیں لہذا مخاطب قرار پاسکتے ہیں لیکن جب کشتی انہیں ساحل سے دور کر دیتی ہے

اور وہ آہستہ آہستہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں تو غائب شمار ہوتے ہیں اور یہ دو مختلف حالتوں میں ان کی فطری تصویر کشی ہے۔

۴۔ ”احیط بھم“ کا مفہوم: اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہر طرف سے امواج بلا میں گھرے ہوئے ہیں لیکن یہ یہاں ہلاکت اور نابودی کے لئے کنایہ ہے جو اس حالت کا لازمی نتیجہ ہے۔

۱۔ مزید وضاحت کے لئے جلد ۲ ص ۳۳۹، جلد ۶ ص ۲۳۶ اور جلد ۷ ص ۱۲۶ (اودو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

۲۔ لفظ ”متاع“ ایک فعل مقدر سے منصوب ہے اصل میں یوں تھا ”تتمتعون متاع الحیاة الدنیا“۔

آیات ۲۵، ۲۴

۲۴۔ ﴿إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَبْ بِالْأَمْسِ كَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾۔

۲۵۔ ﴿وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾۔

ترجمہ

۲۴۔ دنیاوی زندگی اس پانی کی طرح ہے جسے ہم نے آسمان کی طرف سے نازل کیا ہے کہ جس کے اثر سے طرح طرح کے نباتات اُگتے ہیں جنھیں انسان اور چوپائے کھاتے ہیں، یہاں تک کہ زمین (ان سے) اپنی زیبائی حاصل کرتی ہیں اور مزین ہو جاتی ہے اور اور اس کے رہنے والے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے کہ (چانک انکی نابودی کے لئے) ہمارا حکم آپہنچتا ہے (اور ہم سردی یا بجلی کو ان پر مسلط کر دیتے ہیں) اور اس طرح سے کاٹ ڈالتے ہیں کہ گویا بالکل کچھ تھا ہی نہیں۔ یوں ہم اپنی آیات اس گروہ کے لئے تفصیل سے بیان کرتے ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔

۲۵۔ اور خدا صلح و سلامتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے اور جسے چاہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

دنیاوی زندگی کی دور نمائی

گزشتہ آیات میں دنیاوی زندگی کی ناپائیداری کی طرف اشارہ ہوا ہے زیر نظر آیت میں اس حقیقت کو ایک عمدہ مثال کے ذریعے بیان کیا گیا ہے تاکہ غرور اور غفلت کے پردے غافل اور طغیان گمروں کی نظروں کے سامنے سے ہٹا دیئے جائیں۔

ارشاد ہوتا ہے: دنیاوی زندگی کی مثال اس پانی کی طرح ہے

جسے ہم نے آسمانوں سے نازل کیا ہے ﴿إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ﴾۔ بارش کے یہ حیات بخش قطرہ آمادہ زمینوں پر گرتے ہیں اور ان کے ذریعے طرح طرح کے نباتات اُگتے ہیں ان میں سے بعض انسانوں کے لئے مفید ہیں اور بعض جانوروں کے لئے ﴿فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ﴾۔

یہ نباتات زندہ موجودات کے لئے غذا بھی فراہم کرتے ہیں اور علاوہ ازیں سطح زمین کو بھی ڈھانپ دیتے ہیں اور اسے زینت بخشتے ہیں یہاں تک کہ زمین بہترین زیبائی حاصل کرتی ہے اور مزین ہو جاتی ہے ﴿حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَيَّنَّتْ﴾ -

اس طرح شکوفہ شاخساروں کو زینت بخشتے ہیں، پھول کھلتے ہیں، سبزہ زار نور آفتاب سے چمکنے لگتے ہیں، تنے اور شاخیں ہواؤں کے چلنے سے رقص کرنے لگتے ہیں۔ اناج کے دانے اور پھل آہستہ آہستہ نکلنے لگتے ہیں اور صحنِ دنیا میں بھرپور زندگی مجسم ہو کر سامنے آ جاتی ہے، دل امید سے اور آنکھیں سرور سے معمور ہو جاتی ہے، پھولوں سے بھی استفادہ کریں گے اور حیات بخش دانوں سے بھی ﴿وَوَظَنَ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا﴾ -

لیکن اچانک ہمارا حکم آپہنچتا ہے (سخت سردی، شدید ژالہ باری یا تباہ کن طوفان ان پر مسلط ہو جاتا ہے) اور ہمیں انہیں اس طرح سے کاٹ دیتے ہیں گویا وہ اصلاً تھے ہی نہیں ﴿أَنَّا هَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَبْ بِالْأَمْسِ﴾ -

”تغن“ مادہ ”غنا“ سے، کسی جگہ قیام کرنے کے معنی میں ہے، اسی بناء پر ”لم تغن بالامس“ کا معنی ہے ”کل وہ اس مکان میں نہ تھا“ اور یہ کنایہ کے طور پر اس چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اس طرح سے بالکل ختم ہو جائے کہ گویا اس کا ہرگز وجود ہی نہ تھا۔

آیت کے آخر میں زیادہ تاکید کے لئے فرمایا گیا ہے: یوہم تفکر کرنے والوں کے لئے تفصیل سے آیات بیان کرتے ہیں (كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ) -

جو کچھ کہا جا چکا ہے وہ نائیدار، پرفریب اور زرق و برق مادی دنیا کی واضح اور بدلتی تصویر ہے۔ اس زندگی کا مقام پائدار ہے، نہ ثروت اور نہ ہی یہ امن و سلامتی کی جگہ ہے لہذا بعد والی آیت میں ایک مختصر سے جملے کے ذریعے اس کے مقابل دوسری زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا دار السلام، صلح و سلامتی اور امن و آشتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے (وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ) - وہ جگہ کہ جہاں مادی زندگی کے ان غارت گروں کی کشمکش کی کوئی خبر ہے اور نہ ہی خدا سے بے خبر ذخیرہ اندوزوں کی احمقانہ مزاحمت کا کوئی پتہ اور نہ ہی وہاں جنگ، خونریزی، استعمار اور استعمار ہے اور یہ تمام مفاہیم لفظ ”دار السلام“ (یعنی امن و سلامتی کا گھر) جمع ہیں۔

اگر دنیا کی زندگی بھی توحیدی اور آخرت والی شکل اختیار کر لے تو یہ بھی دارالسلام میں تبدیل ہو جائے اور اس کی صورت ”مزرعہ بلا دیدہ و طوفان زدہ“ والی نہیں رہے گی۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: خدا جسے چاہے (اور اہل پائے) راہِ مستقیم کی طرف دعوت دیتا ہے کہ جو راہ دارالسلام ہے اور جو امن و آشتی کے مرکز تک جا پہنچتی ہے ﴿وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾۔

دو قابل توجہ نکات

۱۔ دنیا کی ناپائیداری کے لئے مثال:

قرآن ایک انسان ساز اور تربیت کرنے والی کتاب ہے لہذا بہت سے مواقع پر حقائقِ عقلی کو واضح کرنے کے لئے اس میں پیش کیا گئی ہے۔ بعض اوقات ایسے امور جو کوئی سال طویل ہوتے ہیں انہیں بھی ایک زود گزر اور قابلِ غور منظر کے طور پر مجسم کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

ایک انسان یا ایک نسل کی بھرپور زندگی کی تاریخ کہ جو کبھی ایک سو سال پر مشتمل ہوتی ہے کا مطالعہ عام افراد کے لئے کوئی آسان کام نہیں لیکن جب بہت سے نباتات کی زندگی کہ جو چند ماہ میں ختم ہو جاتی ہے (پیدائش، نشوونما، خوبصورتی اور پھر نابودی) کا منظر اس کے سامنے پیش کر دیا جائے تو وہ بہت بڑی سہولت سے اپنی زندگی کی کیفیت اس صاف و شفاف آئینہ میں دیکھ سکتا ہے۔

اس منظر کو ٹھیک طرح سے اپنی آنکھوں کے سامنے لائے کہ ایک باغ ہے جو درختوں، سبزہ زاروں سے بھر پڑا ہے۔ سب کے سب درخت پھل دار ہیں۔

باغ میں ہر طرف زندگی مچل رہی ہے مگر کسی تاریک رات میں یا روز روشن میں اچانک سیاہ بادل آسمان پر امنڈ آتے ہیں۔ بادل گرجتے ہیں اور بجلی چمکتی ہے طوفان موسلا دھار بارش اور زبردست ژالہ باری شروع ہو جاتی ہے۔ باغ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

دوسرے روز جب باغ میں آتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ درخت ٹوٹے پڑے ہیں۔ سبزہ زار ویران اور پڑمردہ ہو چکے ہیں اور ہر چیز برباد ہو کر زمین پر پڑی ہے، ہمیں یقین نہیں آتا کہ یہ وہی سرسبز اور آباد باغ ہے جو کل ہر ابھرا اور کھلا ہوا تھا۔

جی ہاں انسان کی زندگی کا بھی یہی ماجرا ہے خصوصاً ہمارے زمانے میں کہ کبھی ایک زلزلہ یا چند گھنٹوں کی ایک جنگ یا ایک آباد اور خوش و خرم شہر کو اس طرح سے برباد اور ویران کر دیتی ہے کہ اس میں ایک ویرانے کے اور کچھ ٹکڑے جسموں کے کچھ باقی نہیں رہتا۔

وہ لوگ کس قدر غافل ہیں جنہوں نے ایسی ناپائیدار زندگی سے دل لگایا ہے۔

۲۔ ”اختلط بہ نبات الارض“ کا مفہوم:

اس جملے میں توجہ کرنی چاہیے کہ اختلاط اصل میں، جیسا کہ راغب نے کہا ہے دو یا دو سے زیادہ چیزوں کو جمع کرنا، چاہے وہ مانع ہوں یا ٹھوس۔ ”امتزاج“ کی نسبت ”اختلاط“ عام ہے (کیونکہ امتزاج عموماً مایعات میں ہوتا ہے) لہذا جملہ کا معنی یہ ہوگا کہ بارش کے ذریعے ہر طرح کے نباتات ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں وہ نباتات جو انسان کے کام آتے ہیں۔^(۱)

یہ جملہ ضمنی طور پر اس حقیقت پر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ خدا بارش کے پانی سے جو ایک ہی طرح کا ہوتا ہے، انواع و اقسام کے نباتات اگاتا ہے کہ جو انسانوں اور جانوروں کی مختلف ضروریات کے لئے مختلف قسم کے غذائی مواد مہیا کرتے ہیں۔

۱۔ کچھ سطور بالا میں کہا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ”بہ“ میں ”باء“ سببیت کے معنی میں ہے لیکن بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ ”مع“ کے معنی میں ہے یعنی پانی آسمان سے نازل ہوتا ہے اور نباتات سے مل جاتا ہے اور انہیں رشد و نمودیتا ہے لیکن یہ احتمال آیت کے اس حصے سے مناسبت نہیں رکھتا جس میں کہا گیا ہے ”مما یکل الناس و الانعام“ کیونکہ اس جملے کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اختلاط مختلف قسم کے نباتات کے درمیان مراد ہے نہ کہ پانی اور نباتات کا اختلاط۔ (غور کیجئے گا)

آیات ۲۶، ۲۷

۲۶۔ ﴿لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾۔

۲۷۔ ﴿وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ يَّمَثُلُهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ مَّا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ

قِطْعًا مِّنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾۔

ترجمہ

۲۶۔ جو لوگ نیکی کرتے ہیں وہ اس کمے لئے اچھی اور زیادہ جزا رکھتے ہیں اور تاریکی و ذلت ان کمے چہروں کو نہیں ڈھانپتی۔ وہ بہشت کے ساتھی ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

۲۷۔ باقی رہے وہ لوگ جو گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں وہ اس کمے برابر جزا رکھتے ہیں اور ذلت و خواری ان کمے چہروں کو ڈھانپ لیتی ہے اور کوئی چیز انھیں خدا (کی سزا) سے نہیں بچا سکتی (ان کمے چہرے اس قدر سیاہ ہیں کہ) گویا تاریک رات کے ٹکڑوں نے ان کمے چہروں کا ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ آگ کے ساتھی ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

سفید اور سیاہ چہروں والے

گزشتہ آیات میں دارِ آخرت اور روز قیامت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اسی مناسبت سے زیر بحث آیات دارِ آخرت میں نیکوکاروں اور گناہ گاروں کا انجام بیان کر رہی ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ اچھے کام کرتے ہیں ان کمے لئے اچھی اور زیادہ جزا ہے ﴿لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ

وَزِيَادَةٌ﴾^(۱)

یہ کہ اس جملے میں ”زیادہ“ سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں مفسرین کمے درمیان اختلاف ہے لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آیات قرآنی ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کئی گنا جزا اور ثواب کی طرف اشارہ ہے یہ جزا کبھی دس گناہ ہوتی ہے اور کبھی ہزار گنا (خلوص، پاکیزگی، تقویٰ اور عمل کی قدر و منزلت کے اعتبار سے)۔

سورہ انعام آیہ ۱۶۰ میں ہے: ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امْتَالِهَاتٍ﴾۔

جو شخص کوئی اچھا کام انجام دے گا اسے اس کے دس گناہ جزا ملے گی۔

ایک اور مقام پر ہے: ﴿فَمَا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ اجْرَهُمْ وَيَزِيدُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ﴾،

رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے تو خدا انہیں پوری جزا دے گا اور اپنے فضل و کرم سے بھی اس پر زیادہ کرے گا۔ (نساء ۱۷۳)

سودہ بقرہ میں اتفاق سے مربوط آیات میں بھی نیکوکار لوگوں کی جزا سات صدیا کئی گنا بیان کی گئی ہے۔ (بقرہ ۲۶۱) ایک اور نکتہ کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیے یہ کہ یہ بات عین ممکن ہے یہ زیادہ دوسرے جہان میں متواتر اور ہمیشہ بڑھتی رہے یعنی ہر روز خدا کی طرف سے انہیں نئی نعمت اور لطف و کرم عطا ہوتا رہے۔ درحقیقت یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ دوسرے جہان کی زندگی ایک ہی طرز کی نہیں ہے اور غیر محدود طور پر تکامل و ارتقا کی طرف بڑھتی رہے گی۔

اس آیت کی تفسیر میں پیغمبر اکرم سے جو روایات نقل ہوئی ہیں ان کے مطابق ”زیادہ“ سے مراد پروردگار کی ذات پاک کے جلوہ کی طرف توجہ اور اس عظیم معنوی نعمت سے استفادہ کرنا ہے، ممکن ہے یہ اسی مذکورہ نکتے کی طرف اشارہ ہو۔ چند ایک روایات جو ائمہ اہلبیت علیہ السلام سے منقول ہیں میں لفظ ”زیادہ“ تمام نعمات کی طرف اشارہ ہو۔ اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ روز نیک لوگوں کے چہرے درخشاں اور چمکتے ہوئے ہوں گے اور تاریکی و ذلت ان کے چہروں کو نہیں چھپائے گی ﴿وَلَا يَرَهُنَّ وُجُوهُهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ﴾۔

”یرہق“ مادہ ”رہق“ سے جبری طور پر چھپانے کے معنی میں ہے اور ”قتر“ کا معنی ہے غبار یا دھواں۔ آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ لوگ اہل بہشت ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ ﴿أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾۔

”اصحاب“ کی تعبیر اس مناسبت کی طرف اشارہ ہے جو اس گروہ کی روحانیت اور جنت کے ماحول کے درمیان ہے

دوسری آیت میں دوزخیوں کے بارے میں گفتگو ہے جو پہلے گروہ کے مد مقابل ہیں فرمایا گیا ہے: جو لوگ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں انہیں ان کے عمل کے مطابق بری جزا ملے گی ﴿وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ يَمْثِلُهَا﴾۔

یہاں ”زیادہ“ کا ذکر نہیں ہے کیونکہ جزا میں زیادتی فضل و رحمت ہے لیکن سزا میں عدالت میں کا تقاضا ہے کہ وہ ذرہ برابر بھی گناہ سے زیادہ نہ ہو۔ لیکن یہ لوگ پہلے لوگوں کے برعکس سیاہ چہرے والے ہوں گے اور ان کے چہروں کو ذلت و رسوائی نے ڈھانپ رکھا ہوگا ﴿وَتَرَهُمْ ذِلَّةً﴾۔ (۲)

ممکن ہے سوال کیا جائے کہ عدالت کا تقاضا ہے کہ انھیں گنا سے زیادہ سزا دی جائے جب کہ ان کے چہرہ کی سیاہی، ذلت کی گردان کے لئے ایک زیادتی ہے لیکن توجہ رہے کہ یہ عمل کی خاصیت اور اثر ہے جو انسان کی روح کے اندر سے باہر منعکس ہوتا ہے یہ بالکل اسی طرح ہے کہ ہم کہیں کہ شرابیوں کو کوڑے لگانے چاہئیں جب کہ شراب معدہ، دل جگر اور اعصاب میں طرح طرح کی بیماریاں بھی پیدا کر دیتی ہے۔

بہر حال ممکن ہے بدکاریہ گمان کریں کہ انھیں کوئی راہ فرار مل جائے گی یا بت وغیرہ ان کی شفاعت کر سکیں گے لیکن اگلا جملہ صراحت سے کہتا ہے: کوئی شخص اور کوئی چیز انھیں خدائی سزا سے نہ بچا سکے گی (م ﴿لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ﴾۔ ان کے چہروں کی تاریکی اور سیاہی اتنی زیادہ ہوگی ”گویا تاریک رات کے ٹکڑے یکے بعد دیگرے ان چہرے پر پڑے ہوئے ہیں“ ﴿كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطْعًا مِنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا﴾۔

”وہ اہل نار ہیں اور ہمیشہ اس (جہنم) میں رہیں گے“ ﴿وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾۔

۱۔ توجہ رہے کہ اس جملے میں ”حسنی“ بتدائے موخر ہے اور آیت کا معنی اس طرح ہے: الحسنیٰ للذین احسنوا لهذا لفظ ”زیادہ“ جس کا اس طرح عطف ہے، مرفوع آیا ہے نیز ”الحسنی“ ”المثوبة“ کی صفت ہے کہ جو مقدر ہے اور یہ موصوف کی جگہ ہے۔

۲۔ ہو سکتا ہے گزشتہ آیت کے قرینہ سے ”ترهقهم ذلة“ ”تقدیراً“ ”ترهقهم قتر ذلة“ ہو اور مقابلہ کے قرینہ سے اختصار کے لئے ”قتر“ کے وہاں سے حذف ہوا ہو۔

آیات ۲۸، ۲۹، ۳۰

۲۸۔ ﴿وَيَوْمَ نَخْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَائُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَائُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِلَّا نَا تَعْبُدُونَ﴾۔

۲۹۔ ﴿فَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ﴾۔

۳۰۔ ﴿هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَا أَسْلَفَتْ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمْ الْحَقُّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾۔

ترجمہ

۲۸۔ اس دن کو یاد کرو جب ہم ان سب کو جمع کریں گے، اس کے بعد مشرکین کہیں گے کہ تم اور تمہارے معبود اپنی جگہ پر ہو (تاکہ تمہارا حساب کتاب لیا جائے) پھر انہیں ہم ایک دوسرے سے جدا کر دیں گے (اور ہر ایک سے الگ الگ سوال کریں گے) اور ان کے معبود (ان سے) کہیں گے کہ تم (ہرگز) ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔

۲۹۔ یہی کافی ہے کہ خدا ہمارے اور تمہارے درمیان گواہ ہے کہ ہم تمہارے عبادت کرنے سے غافل تھے۔

۳۰۔ اس وقت (اور وہاں) ہر شخص نے جو پہلے سے عمل کیا ہوگا اسے آزمائے گا اور سب کے سب اللہ، اپنے مولا اور حقیقی سرپرست کی طرف پلٹ جائیں گے اور جنہیں وہ جھوٹ موٹ خدا کا شریک قرار دیتے تھے ان سے کھوجائیں گے۔

قیامت میں بت پرستوں کا ایک منظر

ان آیات میں بھی گزشتہ مباحث جاری ہیں جو کہ مبداء و معاد اور مشرکین کی کیفیت کے بارے میں تھیں۔ ان آیات میں ان کی اس حالت بے چارگی کی تصویر کشی کی گئی ہے جب کہ وہ عدل الہی کے حضور اور اس کی بارگاہ حساب و کتاب میں حاضر ہوں گے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اس دن کو یاد کرو جس میں ہم تمام بندوں کی جمع اور محشور کریں گے (وَيَوْمَ نَخْشُرُهُمْ جَمِيعًا)۔

اس کے بعد ہم مشرکین سے کہیں گے کہ تم تمہارے معبود اپنی جگہ پر ٹھہرو تاکہ حساب کتاب دیکھا جائے ﴿ثُمَّ نَقُولُ

لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَائُكُمْ﴾۔^(۱)

وقفوا ہم انہم مستولون۔ انہیں ٹھہراؤ ان سے سوال ہوتا ہے۔

یہ بات توجہ طلب ہے کہ زیر نظر آیت میں بتوں کو ”شراک و کم“ کہا گیا ہے یعنی ”شریک“ جب کہ مشرکین بتوں کو خدا کا شریک قرار دیتے تھے نہ کہ اپنا۔

یہ تعبیر درحقیقت اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ بت در خدا کے شریک نہیں ہوتے اور یہ بت برستوں کے موہوں خیالات تھے کہ جن کی بنا انھوں نے انھیں یہ حیثیت دے رکھی تھی یعنی وہ تمہارے انتخاب شدہ شریک تھے۔
یہ بات بالکل اسی طرح ہے کہ کہیں کہ آدیکھو تمہارے اس استاد اور سربراہ نے کیا کچھ نہیں کیا (حالانکہ وہ اس کا استاد اور سربراہ نہیں ہے بلکہ مدرسہ کا معلم اور سربراہ ہے لیکن اس نے اسے اپنا لیا ہے)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ان دو گروہوں (معبود اور عابد) کو ہم ایک دوسرے سے الگ کر دیں گے“ اور ہر ایک سے الگ سوال کریں گے (جیسا کہ تمام عدالتوں میں یہ معول ہے کہ ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ سوال کیا جاتا ہے)۔
بت پرستوں سے سوال کریں گے کہ کس دلیل کی بناء پر تم نے ان بتوں کو خدا کا شریک قرار دیا تھا اور ان کی عبادت کرتے تھے اور معبودوں سے بھی پوچھیں گے کہ تم کس بناء پر معبود بنے تھے یا اس کام کے لئے تیار ہوئے تھے ﴿فَرِیْلْنَا بَیْنَهُمْ﴾ - (۲)

جنہیں انھوں نے شریک بنایا تھا اس وقت وہ بول اٹھیں گے“ اور کہیں گے تم ہر گز ہماری پرستش نہیں کرتے تھے“ ﴿وَقَالَ شُرَکَاؤُهُمْ مَا کُنْتُمْ اِیَّانَا تَعْبُدُوْنَ﴾ - تم درحقیقت وہو اوہو سا اور اپنے اوہام و خیالات کی پرستش کرتے تھے نہ کہ ہماری۔

علاوہ ازیں تمہاری عبادت کرنا ہمارے فرمان سے نہ تھا اور نہ ہی ہماری رضا سے تھا اور ایسی عبادت دراصل عبادت ہی نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید تاکید کے لئے کہیں گے: ہمارے اور تمہارے درمیان گواہی کے لئے خدا کافی ہے کہ ہم کس طرح بھی تمہاری عبادت سے آگاہ نہ تھے ﴿فَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اِنْ کُنَّا عَنْ عِبَادَتِکُمْ لَغَافِلِیْنَ﴾ - (۳)
یہ کہ زیر نظر آیت میں بتوں اور شرکاء سے کون سے معبود مراد ہیں اور یہ کہ وہ کس طرح ایسی گفتگو کریں گے، اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ مراد انسانی اور شیطانی معبود ہیں یا پھر یہ فرشتوں میں سے ہیں کہ جو عقل و شعور رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود انھیں یہ خبر نہیں ہے کہ کوئی گمروہ ان کی عبادت کرتا ہے کیونکہ یا تو وہ ان کی غیبت میں ایسی

عبادت کرتے تھے اور یا ان کی موت کے بعد ان کی عبادت کی گئی ہے (جیسے بعض انسانوں کی موت کے بعد ان کی عبادت کی گئی ہے)۔

لہذا ان کی یہ گفتگو بالکل فطری اور طبعی ہوگی اس احتمال کی بناء پر یہ آیت سورہ سبا کی آیہ ۴۰ کی طرح ہوگی، جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَائِكَةِ أَهَؤُلَاءِ أَيْكُمُ الَّذِينَ كَانُوا يَعْبُدُونَ﴾ وہ دن کہ جس میں خدا سب کو محشور کرے گا۔ اس کے بعد فرشتوں سے کہے گا! کیا یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کرتے تھے۔

دوسرا احتمال ہے کہ جسے بہت سے مفسرین نے ذکر کیا ہے یہ ہے کہ اس روز خدا تعالیٰ بتوں کو زندگی اور شعور عطا کرے گا اس طرح سے کہ وہ حقائق بیان کر سکیں گے مندرجہ بالا جملہ کہ جو بتوں کی زبانی نقل ہوا ہے کہ وہ خدا گواہ بنائیں گے وہ عبادت کرنے والوں کی عبادت سے غافل تھے اس سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ پتھر اور لکڑی کے بت بالکل کسی چیز کو نہیں سمجھتے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تمام معبودوں کے لئے ہے البتہ جو معبود عقل و شعور رکھتے ہیں وہ اپنی زبان سے حقیقت بیان کریں گے لیکن جو معبود عقل و شعور نہیں رکھتے وہ زبان حال اور آثار عمل کے ذریعے بات کریں گے بلکہ اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں کہ تیرے چہرے کی رنگت تیرے اندر کی بات کر رہی ہے۔

قرآن بھی سورہ فصلت آیہ ۲۱ میں کہتا ہے: انسانی جلد اور چمڑے عالم قیامت میں گفتگو کریں گے۔

اسی طرح سورہ زلزال میں کہتا ہے: وہ زمینیں جن پر انسان زندگی بسر کرتا ہے، حقائق بیان کریں گی۔

یہ معاملہ دور حاضر میں کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے جب کہ ایک بے زبان ٹیپ ہماری تمام باتوں کو ریکارڈ کرتی ہے اور ضرورت کے وقت بیان کرتی ہے لہذا تعجب کا مقام نہیں کہ بت بھی اپنی عبادت کرنے والوں کی حقیقت کو ظاہر کریں۔

بہر حال اس دن، اس جگہ یا اس حالت میں جیسا کہ قرآن زیر نظر آخری آیت میں کہتا ہے: ہر شخص اپنے انجام دئے گئے اعمال کا نتیجہ دیکھے گا بلکہ خود انہیں دیکھے گا چاہے وہ عبادت کرنے والا ہو یا گمراہ معبود کہ جو لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت دیتا تھا، چاہے مشرک ہو یا مومن اور چاہے کسی گروہ یا کسی قبیلے سے ہو ﴿هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ﴾۔

”اور اس دن سب کے سب اللہ کی طرف پلٹ جائیں گے جو ان کا حقیقی مولا اور سرپرست ہے اور قیامت کی عدالت میں ظاہر ہو جائے گا کہ حکومت صرف اس کے زیر فرمان ہے“ ﴿وَرُدُّوْا اِلَى اللّٰهِ مَوْلَاَهُمْ الْحَقِّ﴾۔ ”آخر کار تمام بت

اور جعلی معبود کہ جنہیں وہ غلط طور پر خدا کا شریک قرار دے چکے تھے گم اور نابود ہو جائیں گے“ ﴿وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾ -

کیونکہ وہ بندوں کے اسرار نہاں کے ظہور کا میدان ہے اور کوئی حقیقت ایسی نہیں رہے گی کہ جو اپنے آپ کو شکار نہ کر دے۔ وہاں اصولی طور پر ایسی صورت حال ہے کہ نہ سوال کی ضرورت ہے نہ گفتگو کی بلکہ کیفیت حالات ہر چیز کی ترجمانی کرے گی اور بات چیت کی ضرورت نہیں ہوگی۔

۱۔ ”مکانکم“ اصل میں فعل مقدر کا مفعول ہے اور حقیقت میں یوں تھا ”الزموامکانکم انتم وشركائکم حتی تسئلوا“۔ یہ جملہ فی الحقیقت سورہ الصافات کی آیہ ۲۴ کے مشابہ ہے جہاں فرمایا گیا ہے:

۲۔ ”زیلنا“ ”تزییل“ کے مادہ سے ہے اور جدا کرنے کے معنی میں ہے نیز جیسا کہ بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ اس کا مادہ ثلاثی زال یزیل ہے جو جدا ہونے کے معنی میں ہے۔ نہ کہ زال یزول کے مادہ سے زوال قبول کرنے کے معنی میں ہے۔

۳۔ مندرجہ بالا جملے میں لفظ ”ان“ اصطلاح کے مطابق ثقیلہ سے خفیفہ ہے اور تاکید کے لئے ہے اور جملے کا معنی یہ ہے:۔ اننا عن عبادتکم لغافلین۔ یعنی ہم یقیناً تمہاری عبادت سے غافل تھے۔

آیات ۳۱، ۳۲، ۳۳

- ۳۱۔ ﴿قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ﴾۔
- ۳۲۔ ﴿فَذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعَدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ فَأَنَّا تُصِرُّونَ﴾۔
- ۳۳۔ ﴿كَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ فَسَقُوا أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾۔

ترجمہ

- ۳۱۔ کہہ دو: کو تمہیں آسمان وزمین سے روزی دیتا ہے یا کون کان اور آنکھوں کا مالک (اور خالق) ہے اور کوئی زندہ کو مردہ سے نکلتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور کون (دنیا کے) امور کی تدبیر کرتا ہے جلد ہی وہ (جواب میں) کہیں گے: تو کہو کہ پھر کیوں تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو (اور خدا سے نہیں ڈرتے ہو)۔
- ۳۲۔ اور یہ تمہارا اللہ، تمہارا حقیقی پروردگار، تو اس صورت میں حق کے بعد گمراہی کے علاوہ کچھ ہے؟ پس کوئی (اس کی عبادت سے) رخ پھرتے ہو؟
- اس طرح سے تیرے پروردگار کا حکم فاسقوں پر مسلم ہوا ہے کہ وہ (اس سرکشی اور گناہ کے بعد) ایمان نہیں لائیں گے۔

تفسیر

- ان آیات میں وجود پروردگار کی نشانیوں اور اس کے لائق عبودیت ہونے کے بارے میں گفتگو ہے اور اس سلسلے میں گزشتہ مباحث جاری ہیں۔
- پہلے فرمایا گیا ہے: مشرکین اور بت پرست کہ جو راہ روہی میں سرگرداں ہیں ان سے کہہ دو: کون تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ ﴿قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ﴾۔
- ”رزق“ لگاتار اور دائمی عطا اور بخشش کے معنی میں ہے اور چونکہ تمام نعمتیں بخشنے والا اور حقیقت خدا ہے لہذا ”رزق“ اور رازق“ لئے الفاظ حقیقی معنی کے لحاظ سے صرف اسی کے لئے بولے جاتے ہیں اور اگر اس کے علاوہ کسی اور کے لئے استعمال ہوں تو بلاشبہ مجاز کے حوالے سے ہوں گے جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۳ میں دودھ پلانے والی عورتوں کے بارے میں ہے:- و علی مولودہ رزقہن و کسوتہن بالمعروف۔

باپ پر فرض ہے کہ جو عورتیں اس کی اولاد کو دودھ پلائیں انھیں مناسب رزق دے اور لباس پہنائے۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انسان کی زیادہ تر روزی آسمان سے مربوط ہے۔ حیات بخش بارش آسمان سے برستی ہے۔ ہوا جو کہ تمام زندہ موجودات کی ضرورت ہے وہ بھی زمین کے اوپر ہے اور سب سے زیادہ اہم سورج کی روشنی ہے کہ جس کے بغیر زمین پر کوئی موجود زندہ نہیں رہ سکتا اور جس کے بغیر ساری زمین پر کوئی حرکت و جنبش نہیں ہو سکتی، اس روشنی کا تعلق بھی آسمان سے ہے۔ یہاں تک کہ جو جانور دریاؤں کی گہرائی میں ہیں وہ بھی نور آفتاب ہی کی بدلت زندہ ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے بہت سوں کی غذا بہت ہی چھوٹ نباتات ہیں کہ جو سمندر کی سطح پر موجوں کے درمیان سورج کی روشنی پڑنے سے ہی نشو و نما حاصل کرتے ہیں۔ لیکن زمین صرف اپنے نباتات کو غذا دیتی ہے شاید اسی بنا پر مندرجہ بالا آیت میں پہلے آسمان سے روزی مہی اکیے جانے کا تذکرہ ہے اور بعد میں زمین سے (درجہ اہمیت کے فرق کے ساتھ)۔

اس کے بعد حواس انسانی میں سے دو اہم ترین کا ذکر کیا گیا ہے جن کے بغیر انسان علم حاصل نہیں کر سکتا۔ ارشاد ہوتا ہے: اور کہہ دو کہ کان اور آنکھوں کا خالق، مالک اور انسان کے ان دو حواس کو قدرت دینے والا کون ہے (أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ)۔

در حقیقت اس آیت میں پہلے تو مادی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے اور اس کے بعد معنوی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جن کے بغیر مادہ نعمتیں اپنا مقصد کھودیتی ہیں۔

لفظ ”سمع“ مفرد (اور کان کے معنی میں ہے) اور ”اسار“ ”بصر“ کی جمع ہے، بینائی اور آنکھ کے معنی میں ہے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ”سمع“ قرآن میں تمام جگہوں پر مفرد آیا ہے جب کہ ”بصر“ کبھی جمع کی صورت میں آیا ہے کبھی مفرد، آخر اس کی کیا وجہ ہے اس سوال کا جواب جلد اول ص ۱۰۱ (اردو ترجمہ) پر پیش کیا جا چکا ہے۔

اس کے بعد دو ظاہر ہونے والی چیزیں یعنی موت و حیات کا ذکر ہے جو کہ عالم خلقت کی عجیب و غریب چیزیں ہیں، ارشاد ہوتا ہے: اور کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کا زندہ سے نکالتا ہے ﴿وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾۔

یہ وہی موضوع ہے کہ جس میں ابھی تک طبیعی علوم کے ماہرین اور حیات شناس لوگوں کی عقل حیران و پریشان ہے کہ ایک بے جان چیز سے ایک زندہ موجودہ کس طرح وجود میں آتا ہے۔ کیا ایسی چیز جسکے بارے میں علماء اور سائنس

دانوں کی مسلسل کوشش ابھی تک کسی مقام تک نہیں پہنچی۔ ایک معمولی، اتفاقیہ، بغیر ہدایت کے رونما ہونے والی حادثاتی اور بلا مقصد طبعی ہو سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ظاہر ہونے والی پیچیدہ، ظریف اور آثار آمیز زندگی حد سے زیادہ علم و قدرت اور عقلِ کلی کی محتاج ہے۔

اس نے نہ صرف ابتداء میں زندہ کوزمین کی بے جان موجودات سے پیدا کیا ہے بلکہ اس کی سنت یہ رہی ہے کہ زندگی بھی جاودانی نہ ہو۔ اس بنا پر اس نے موت کو زندگی کے دل میں پیدا کیا ہے تاکہ اس طریقے سے تغیر و تکامل کے لئے میدان کھلا رکھے۔

مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ آیت مادی موت و حیات کے علاوہ معنوی موت و حیات کے بارے میں بھی ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی گمراہ اور بے ایمان ماں باپ سے ایک ہوش مند، پاک دامن اور اب ایمان انسان پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ قانون وراثت کے برخلاف نہایت لائق اور باوقار انسان سے بے وقعت اور مردہ انسان وجود میں آتے ہیں۔^(۱)

البتہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ زیر نظر آیت دونوں قسموں کی موت و حیات کی طرف اشارہ ہو کیونکہ دونوں ہی عجائبِ آفرینش اور عالم کے تعجب انگیز مظاہرہ میں سے ہیں اور اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ طبعی عوامل و حکیم خالق کا دستِ قدرت کار فرما ہے۔

اس کے بارے میں جلد پنجم۔ ص ۲۸۹ (اردو ترجمہ) سورہ انعام کی ۱۱۵ کے ذیل میں ہم کچھ دیگر توضیحات بھی ذکر کر چکے ہیں۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: کون ہے جو اس جہان کے امور کی تدبیر کرتا ہے ﴿وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأُمْرَ﴾۔ درحقیقت پہلے تو نعمات کی خلقت و آفرینش کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور اس کے بعد ان کے محافظ، نگہبان اور مدبر کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

ان تین سوالات کو پیش کرنے کے بعد قرآن بلا فاصلہ کہتا ہے: وہ فوراً ہی جواب میں کہیں گے ”اللہ“ اس جملے سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے مشرکین اور بت پرست بھی عالم ہستی کا خالق، رازق، حیات بخش اور مدبر امور اللہ ہی کو جانتے ہیں اور وہ اس حقیقت کو طریق عقل اور راہ فطرت سے جان چکے تھے کہ یہ نظام اور حساب شدہ جہان بے نظم کی پیداوار یا بتوں کی مخلوق نہیں ہو سکتا۔

آیت کے آخر میں پیغمبر اکرم کو حکم دیا گیا ہے: ان سے کہہ دو کہ کیا اس حالت میں تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو ﴿فَقُلْ﴾
 أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿۱﴾ -

صرف وہ ذات پرستش کے لائق ہے جس کے ہاتھ میں دنیا کی خلقت و تدبیر ہے۔ اگر عبادت معبود کی اہلیت اور عظمت کی بنا پر کی جائے تو پھر یہ اہلیت، لیاقت اور عظمت صرف خدا میں پائی جاتی ہے اور اگر اس بناء پر کی جائے کہ معبود سودزیاں کا سرچشمہ ہے تو یہ بھی خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔

آسمان و زمین میں خدا کی عظمت و تدبیر کے کچھ آثار ذکر کرنے کے بعد اور مخالفین کے وجدان و عقل کو دعوت دینے کے بعد جب وہ اعتراف کر چکے تو اگلی آیت میں قطعی لب و لہجہ کے اختیار کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: یہ ہے خدا تمہارا برحق پروردگار ﴿فَذَلِّكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ الْحَقُّ﴾ -

نہ کہ بت اور دوسرے موجودات کہ جنہیں تم خدا کی عبودیت میں شریک قرار دیتے ہو اور ان کے سامنے سجدہ کرتے ہو اور ان کی تعظیم کرتے ہو۔ وہ کس طرح عبودیت کے لائق ہو سکتے ہیں حالانکہ یہی نہیں کہ وہ تخلیق و تدبیر جہان میں شریک نہیں ہو سکتے بلکہ خود بھی سرتاپا محتاج ہیں۔

اس کے بعد نتیجتاً فرمایا گیا ہے: اب جب کہ حق کو واضح طور پر پہچان چکے ہو۔ تو کیا حق کے بعد گمراہی کے علاوہ کچھ رہ جاتا ہے ﴿فَمَاذَا بَعَدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ﴾ -

اس کے باوجود کیوں تم خدا کی عبادت اور پرستش سے منہ بھرتو ہو حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ معبود برحق اس کے علاوہ کوئی نہیں ﴿أَنِّي تُصْرِفُونَ﴾ -

یہ آیت درحقیقت باطل کی شناخت اور اسے ترک کرنے کے لئے ایک واضح منطقی راستہ بتاتی ہے اور وہ یہ کہ پہلے تو حق کی پہچان کے لئے عقل سے کام لینا چاہیئے اور جب حق کو پہچان لیا جائے تو جو کچھ اس کے مخالف ہے وہ باطل اور گمراہی ہے اور اس سے کنارہ کشی کرنا چاہیئے۔

آخری آیت میں یہ نکتہ بیان کرنے کے لئے کہ وہ لوگ مطلب واضح اور حق آشکار ہو جانے کے باوجود کیوں اس کے پیچھے نہیں جاتے، قرآن کہتا ہے: اسی طرح خدا کا فرمان ان افراد کے بارے میں کہ جو جان بوجھ کر اور عقل کے خلاف چلتے ہوئے اطاعت سے رخ پھرتے ہیں، صادر ہوا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گے ﴿كَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى

الَّذِينَ فَسَقُوا أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ - ﴿۲﴾

حقیقت میں یہ ان کے مسلسل غلط اعمال کی خاصیت ہے کہ جو ان کے دل کو اس طرح سے تاریک اور ان کی روح کو اس طرح سے آلودہ کر دیتی ہے کہ حق کے واضح اور روشن ہونے کے باوجود اسے نہیں دیکھتے اور بے راہ روی اختیار کرتے ہیں۔ اس بناء پر مندرجہ بالا آیت کسی طرح سے بھی مسئلہ جبر پر دلالت نہیں کرتی بلکہ انسان کے خود اپنے اعمال کی طرف اشارہ ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ ان اعمال میں یہ خصوصیت فرمان الہی سے ہے۔

یہ بالکل اس طرح ہے جیسے ہم کسی سے کہیں کہ ہم نے تجھے سو مرتبہ کہا ہے کہ نشہ آور چیزوں اور شراب کے پیچھے نہ جاو، اب جب کہ تو نے کان میں نہیں دھرے اور ان کا سخت عادی ہو چکا ہے تو اب تیرے لئے یہی حکم ہے کہ مدتوں بد بختی میں رہے۔

۱۔ تفسیر برہان ج، ۱ ص ۵۴۳، سورہ انعام کی آیت ۹۵ کے ذیل میں متعدد روایات کے حوالے سے یہ مضمون ذکر کیا گیا ہے۔

۲۔ کاف تشبیہ یہاں ایک مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ جو گزشتہ آیت کے آخری جملے میں ذکر ہوا ہے اور آیت کا معنی اس طرح ہے (انہ لیس بعد الحق الا الضلال کذلک حقت کلمۃ ربک) یعنی پہلے حق کے بعد گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہے اسی طرح خدا کا حکم صادر ہو چکا ہے۔

آیات ۳۴، ۳۵، ۳۶

۳۴۔ ﴿قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ قُلْ اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ فَأَنَا تَتُفَكُونُ﴾۔

۳۵۔ ﴿قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ قُلْ اللَّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمْ لَا يَهْدِي إِلَّا أَنْ يُهْدَىٰ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ﴾۔

۳۶۔ ﴿وَمَا يَتَّبِعْ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ﴾۔

ترجمہ

۳۴۔ کہہ دو! کیا تمہارے معبودوں میں سے کوئی مخلوق کو ایجاد کر سکتا ہے اور پھر اسے پلٹا سکتا ہے؟ کہہ دو! صرف خدا نے مخلوق کو پیدا کیا ہے اور پھر واپس پلٹائے گا۔ اس کے باوجود حق سے کیوں روگرداں ہوتے ہو۔

۳۵۔ کہہ دو! کیا تمہارے معبودوں میں سے کوئی حق کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ کہہ دو صرف خدا حق کی ہدایت کرتا ہے۔ کیا وہ جو حق کی ہدایت کرتا ہے پیروی کے زیادہ لائق نہیں ہے یا وہ کہ جسے ہدایت نہ کی جائے تو وہ خود ہدایت حاصل کرتا تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کس طرح فیصلہ کرتے ہو۔

۳۶۔ ان میں سے اکثر سوائے گمان (اور بے بنیاد خیالات) کے کسی چیز کی پیروی نہیں کرتے (حالانکہ) گمان کبھی انسان کو حق سے بے نیاز نہیں کرتا (اور حق تک نہیں پہنچاتا) اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے باخبر اور آگاہ ہے۔

حق و باطل کی ایک پہچان

ان آیات میں بھی مبداء اور معاد سے مربوط استدالات کا سلسلہ جاری ہے۔ پہلی آیت میں پیغمبر اکرم کو حکم دیا گیا ہے: ان سے کہہ دو کہ تمہارے معبودوں کہ جنہیں تم خدا کا شریک قرار دیتے ہو میں سے کوئی ہے جو عالم آفرینش کو ایجاد کر کے پھر لوٹا سکتا ہے ﴿قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ﴾۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: کہہ دو کہ خدا نے عالم آفرینش کو پیدا کیا ہے اور پھر اسے لوٹائے گا ﴿قُلْ اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ﴾۔ ”اس کے باوجود حق سے کیوں روگردانی کرتے ہو اور بے راہ روی میں سرگرداں ہو“ ﴿فَأَنَّى تَتُفَكُونُ﴾۔

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں: پہلا یہ کہ مشرکین عرب عام طور پر معاد اور قیامت کا عقیدہ خصوصاً جیسے قرآن کہتا ہے، نہیں رکھتے تھے اس کے باوجود قرآن ان سے کیونکہ اعتراف چاہتا ہے۔

دوسرا یہ کہ گذشتہ آیت میں مشرکین کے اعتراف کا ذکر تھا لیکن یہاں پیغمبر کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اس حقیقت کا اعتراف کرو تبیر کا یہ فرق کیوں ہے؟

لیکن ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے دونوں سوالوں کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ مشرکین معاد (معاد جسمانی) کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے ان کا بس یہ اعتقاد تھا کہ خلقت کی ابتداء خدا کی طرف سے ہے اور یہی بات معاد کو تسلیم کرنے کے لئے کافی ہے کیونکہ جس نے ابتداء کی ہے وہ اعادہ بھی کر سکتا ہے لہذا مبداء کے عقیدہ پر تھوڑا سا بھی غور و فکر کیا جائے تو اس سے معاد کا عقیدہ ثابت ہو جاتا ہے۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ کس بناء پر مشرکین کی بجائے پیغمبر اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کیونکہ اگرچہ معاد پر ایمان مبداء کے لئے ایمان کے لوازمات میں سے ہے لیکن چونکہ وہ اس لزوم کی طرف متوجہ نہیں تھے لہذا طرز تبیر بدل گئی اور پیغمبر نے ان کی جگہ اعتراف کیا۔

دوبارہ پیغمبر اکرم کو حکم دیا گیا ہے: ان سے کہہ دو کہ کیا کوئی تمہارے جعلی معبودوں میں سے حق کی طرف ہدایت کر سکتا ہے ﴿قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ﴾۔ کیونکہ معبود کو اپنی عبادت کرنے والوں کا رہبر ہونا چاہیئے اور رہبری بھی حق کی طرف کرنا چاہیئے۔ حالانکہ مشرکین کے معبود چاہے وہ بے جان بت ہوں یا جاندار، کوئی بھی یہ طاقت نہیں رکھتا کہ ہدایت الہی کے بغیر حق کی طرف رہبری کر سکے کیونکہ حق کی طرف ہدایت کرنا مقام عصمت اور خطاہ و اشتباہ سے محفوظ ہونے کا مقام ہے اور یہ خدا کی ہدایت اور حمایت کے بغیر ممکن نہیں ہے، لہذا بلا فاصلہ مزید فرمایا گیا ہے: کہہ دو کہ صرف خدا ہی حق کی طرف ہدایت کرتا ہے ﴿قُلْ اللَّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ﴾۔ تو ایسے میں ”کیا وہ جو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے پیروی کے زیادہ لائق ہے یا وہ کہ جس کی ہدایت اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ اسے ہدایت کی نہ جائے ﴿أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمْ مَنْ لَا يَهْدِي إِلَّا أَنْ يُهْدَى﴾۔

آیت کے آخر میں سرزنش کے انداز میں اور جھنجھوڑتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ کس طرح کا فیصلہ کرتے ہو ﴿فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ﴾۔

زیر نظر آخری آیت میں ان کے انحراف کی بنیاد اور سرچشمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان میں سے اکثر خیال اور گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کرتے جبکہ خیال اور گمان کبھی بھی انسان کو نہ حق سے بے نیاز کر سکتا ہے اور نہ حق تک پہنچا سکتا ہے ﴿وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾۔

جو لوگ کسی منطق اور حساب کتاب کے تابع نہیں، آیت کے آخر میں انہیں تہدید آمیز لہجے میں کہا گیا ہے: جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں، خدا اس کا عالم اور جاننے والا ہے ﴿إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ﴾ -

چند اہم نکات

۱۔ ”خدا ہی حق کی طرف ہدایت کرتا ہے“

مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ صرف خدا حق کی ہدایت کرتا ہے یہ انحصار یا تو اس بناء پر ہے کہ ہدایت کے مراد راستہ دکھانا نہیں ہے بلکہ مقصد تک پہنچانا بھی ہے اور یہ کام صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور یا اس بناء پر ہے کہ راستہ دکھانا اور اس کی نشاندہی کرنا بھی پہلے درجے میں خدا ہی کا کام ہے اور اس کے غیر یعنی انبیاء الہی اور ہادیان برحق صرف اس کے طریق ہدایت سے ہدایت کے راستوں سے آگاہ ہوتے ہیں اور اس کی تعلیم سے عالم ہوتے ہیں۔

۲۔ مشرکین کے معبود خود ہدایت کے محتاج ہیں:

یہ جو زیر بحث آیات میں آیا ہے کہ مشرکین معبود نہ صرف کسی کو ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ خود بھی ہدایت الہی کے محتاج ہیں اگر پتھر اور لکڑی کے بتوں کے بارے میں صادق نہیں آتا کیونکہ وہ تو بالکل شعور نہیں رکھتے تھے لیکن صاحب شعور معبودوں کے بارے میں مثلاً جن فرشتوں اور انسانوں کو معبود قرار دیا گیا ہے پر مکمل طور پر صادق آتا ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ مذکورہ جملہ ایک قضیہ شرطیہ کے معنی میں ہو یعنی فرض کریں کہ بت عقل و شعور رکھتے ہوتے تو خدائی راہنمائی کے بغیر خود راہ تلاش نہ کر سکتے چہ جائیکہ دوسروں کی راہنمائی کرتے۔

بہر حال مندرجہ بالا آیات اچھی طرح سے نشاندہی کرتی ہیں کہ بندوں کے لئے خدا کا ایک طرف سے ہدایت کا ایک بنیادی پروگرام ہے جس کے تحت انہیں حق کی طرف ہدایت کی جاتی ہے اور یہ کام عقل و خرد، بخشش، طریق فطرت سے انہیں مختلف درس دینے، جہاں خلقت میں اپنی آیات دکھانے اور اسی طرح انبیاء اور آسمانی کتب بھیجنے کے ذریعے عمل پذیر ہوتا ہے۔

۳۔ بت پرست گمان کی پیروی کرتے ہیں:

زیر بحث آخری آیت میں ہم نے پڑھا ہے کہ اکثر بت پرست اور مشرک اپنے ظن و گمان کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ کیوں نہیں فرمایا کہ وہ سب کے سب ایسے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تمام بت پرست اس گمان باطل میں شریک ہیں کہ وہ بتوں کو حقیقی معبود، نفع و نقصان کا مالک اور بارگاہ خدا میں شفیع خیال کرتا

ہوں۔ اسی بناء پر بعض مجبور ہوئے ہیں کہ لفظ ”اکثر“ سے تمام کے معنی مراد لیں اور ان کا نظریہ ہے کہ یہ بعض اوقات تمام اور کل کے معنی میں آتا ہے۔

لیکن یہ جواب کوئی زیادہ قابل لحاظ نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم کہیں کہ بت پرست دو طرح کے ہیں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو بیہودہ، نادان اور جاہل ہیں اور غلط سلط خیالات اور گمانوں کے زیر اثر رہتے ہیں اور انھوں نے بتوں کو پرستش کے لئے منتخب کر رکھا ہے جب کہ اقلیت میں وہ بت پرست ہیں جو سیاہ دل اور آگاہ ہیں اور اکثریت کے رہبر و راہنما ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بت پرستی کے لئے بے بنیاد ہونے کو جاننے کے باوجود اپنے مفادات کے لئے لوگوں کو بتوں کی طرف دعوت دیتے ہیں لہذا صرف پہلے گروہ کو جواب دیتا ہے کیونکہ وہ قابل ہدایت ہیں۔ لیکن دوسرا گروہ جو جان بوجھ کر غلط راستے چل رہے اسے بالکل قابل اعتناء قرار نہیں دیتا۔

۴۔ علماء اصول کی ایک بحث:

کچھ علماء اصول زیر نظر آیت اور اس قسم کی آیات کو اس امر کی دلیل سمجھتے ہیں کہ ظن اور گمان کسی طرح حجت اور سند نہیں بن سکتے اور صرف قطعی دلائل پر ہی اعتماد کیا جاسکتا ہے لیکن بعض دیگر علماء کہتے ہیں کہ فہقی دلائل میں ہمارے پاس بہت سے ظنی دلائل ہیں (مثلاً الفاظ کے ظواہر کا حجت ہونا، دو عادل گواہوں کی گواہی می خبر واحد ثقہ اور اس قسم کے دیگر دلائل) وہ کہتے ہیں کہ زیر نظر آیت اس امر کی دلیل ہے کہ اصلی قاعدہ کے مطابق ظن حجت نہیں ہے مگر یہ کہ کسی ظن کا حجت ہونا قطعی دلیل سے ثابت ہو جائے، جیسے مذکورہ چند مثالوں کے بارے میں ہے۔

مگر انصاف یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت صرف بے اساس خیالات اور بے ہودہ گمانوں کے بارے میں بات کر رہی ہے جیسے بت پرستوں کے گمان۔ اس آیت کا تعلق اس ظن سے نہیں جو عقلاء کے نزدیک قابل اعتماد ہے لہذا مندرجہ بالا آیت اور اس طرح کی دیگر آیات سے ظن کے حجت نہ ہونے کے بارے میں سند پیش نہیں کی جاسکتی۔ (غور کیجئے گا)

آیات ۳۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷

۳۷۔ ﴿وَمَا كَانَ هَذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ

رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾۔

۳۸۔ ﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِثْلِهِ وَادْعُوا مَنْ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾۔

۳۹۔ ﴿بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ كَذَّابٌ كَذَّابٌ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

الظَّالِمِينَ﴾۔

۴۰۔ ﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يُؤْمِنُ بِهِ وَمِنْهُمْ مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهِ وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِينَ﴾۔

ترجمہ

۳۷۔ مناسب نہیں (اور ممکن نہ تھا) کہ بغیر وحی الہی کے اس قرآن کی نسبت خدا کی طرف دی جائے لیکن (آسمانی کتب میں سے) جو کچھ موجود ہے یہ اس کی تصدیق ہے اور اس کی تفصیل ہے اور اس میں شک نہیں کہ عالمین کے پروردگار کی طرف سے ہے۔

۳۸۔ وہ کہتے ہیں کہ اس نے قرآن کی خدا کی طرف جھوٹی نسبت دی ہے۔ کہہ دو کہ اگر سچ کہتے ہو تو اس جیسی ایک سورت لے آ اور خدا کے علاوہ جسے چاہتے ہو (اپنی مدد کے لئے) بلا لو۔

۳۹۔ (وہ علم و دانش کی بناء پر قرآن ک انکار کرتے) بلکہ وہ ایسی چیز کی تکذیب کرتے ہیں جس سے آگاہی نہیں رکھتے اور ابھی تک اس کی حقیقت ان کے لئے واضح نہیں ہوئی اسی طرح سے ان سے پہلے لوگوں نے بھی تکذیب کی تھی۔ پس دیکھو کہ ظالموں کا انجام کیا ہوا۔

۴۰۔ اور ان میں سے بعض اس پر ایمان لے آتے ہیں اور بعض ایمان نہیں لاتے اور تیرا پروردگار فساد کرنے والوں سے زیادہ باخبر اور آگاہ (اور انھیں اچھی طرح سے جانتا ہے)۔

دعوتِ قرآن کی عظمت اور حقانیت

یہ آیات مشرکین کی کچھ ناراباتوں کا جواب دے رہی ہیں۔ کیونکہ وہ صرف مبداء کی پہچان کے بارے میں انحراف اور کجروی کا شکار نہ تھے بلکہ پیغمبر اسلام پر بھی افتراء باندھتے تھے کہ انھوں نے قرآن خود اپنی فکر و نظر سے بنا کر خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اسی لئے ہم نے گزشتہ آیات میں پڑھا ہے کہ وہ رسول اللہ سے تقاضا کرتے تھے کہ اس کے

علاوہ کوئی اور قرآن لے آئیں یا پھر کم از کم اس میں رد و بدل کردیں۔ ان کا یہ تقاضا خود اس امر کی دلیل ہے کہ وہ قرآن کو فکر پیغمبر کی تخلیق خیال کرتے تھے۔

زیر بحث پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: مناسب نہیں کہ وحی الہی کے بغیر اس قرآن کی خدا کی طرف نسبت دی جائے

﴿وَمَا كَانَ هَذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ -

یہ بات کاذب نظر ہے کہ سادہ نفی کی بجائے مناسبت کی نفی کی گئی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ سادہ نفی کی بجائے ایسی تعبیر زیادہ رسا اور عمدہ ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص اپنا دفاع کرتے ہوئے کہے کہ یہ میری شان کے خلاف ہے کہ میں جھوٹ بولوں۔

ظاہر ہے کہ اس طرح سے کہنا یہ کہنے سے زیادہ پر معنی اور گہرائی کا حامل ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔

اس کے بعد قرآن کی اصالت اور اس کے وحی آسمانی ہونے کی دلیل کے طور پر کہتا ہے: لیکن یہ قرآن اپنے سے پہلے کی کتب آسمانی کی تصدیق کرتا ہے ﴿وَلَكِنْ تَصْدِيقُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ - یعنی وہ تمام بشارتیں اور حقانیت کی نشانیاں جو گزشتہ آسمانی کتب میں آئی ہیں وہ مکمل طور پر قرآن اور قرآن لانے والے پر منطبق ہوتی ہیں اور یہ امر خود اس بات کا اثبات ہے کہ یہ خدا پر تہمت نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔ اصولی طور پر قرآن خود ”آفتاب آمد دلیل آفتاب“ کے مصداق اپنے مشمولات کی سچائی پر شاہد ہے۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ جو اس قسم کی آیات قرآن کے زمانے میں تھیں، تصدیق نہیں کرتا بلکہ صرف پیغمبر اکرم اور قرآن کے بارے میں ان کتب میں جو نشانیاں تھیں ان کی تائید کرتا ہے (غور کیجئے گا)۔

اس سلسلے میں مزید توضیحات تفسیر نمونہ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت - ۴۱ - کے ذیل میں پیش کی جا چکی ہیں۔

اس کے بعد اس آسمانی وحی کی صداقت کے بارے میں ایک اور دلیل پیش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس قرآن میں گزشتہ انبیاء کی اصل کتب کی تشریح، بنیادی احکام اور اصولی عقائد بیان کیئے ہیں اور اسی وجہ سے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ پروردگار عالمین کی طرف سے ہے ﴿وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ -

دوسرے لفظوں میں گزشتہ انبیاء کے پیش کردہ پرگرام سے اس کا کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ اس میں ان تعلیمات اور پروگراموں کی تکمیل کی گئی ہے اور اگر یہ قرآن جعلی ہوتا تو یقیناً ان کے مخالف اور متضاد ہوتا۔

یہیں سے معلوم ہوتا ہے، کہ اصولی مسائل میں چاہے وہ دینی عقائد ہوں، یا اجتماعی پروگرام، چاہے حفظ حقوق کے معاملات ہوں یا چاہے جہالت کے خلاف جہاد، حق و عدالت ہو یا اخلاقی اقدار کا احیاء اور یا اس قسم کے دیگر مسائل، ان کے بارے میں کتب آسمانی میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ بعد میں نازل ہونے والی کتاب پہلی کتاب سے بالاتر اور کامل تر سطح کی تھی۔ جیسا کہ تعلیم کی مختلف کلاسیں ہوتی ہیں۔ پرائمری، میٹرک، کالج اور یونیورسٹی میں ایک ہی علم کی کتاب مختلف سطح کی ہوتی ہے۔ اسی طرح آخری آسمانی کتاب امتوں کی دینی تعلیم کے آخری دور کے لئے مخصوص تھی جو کہ قرآن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ احکام کی جزئیات اور فروع میں آسمانی مذاہب میں فرق ہے لیکن یہاں ہم ان کے بنیادی اصول کی بارت کر رہے ہیں جو کہ ہر جگہ ہم آہنگ ہیں۔

اگلی آیت میں قرآن کی اصالت کے لئے تیسری دلیل پیش کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس قرآن کی خدا کی طرف غلط نسبت دی ہے، ان سے کہہ دو کہ اگر سچ کہتے ہو تو تم بھی اس جیسی ایک سورت لے آؤ اور خدا کے علاوہ جس سے چاہو مدد طلب کر لو (لیکن تم یہ کام ہرگز نہیں کر سکو گے اور اس سے ثابت ہو جائے گا کہ یہ وحی آسمانی ہے) ﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا مَنْ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾۔

یہ آیت ان آیات میں سے ہے کہ جو صراحت سے اعجاز قرآن کا ذکر کرتی ہیں اس آیت میں نہ صرف سارے قرآن کے اعجاز کا ذکر ہے بلکہ یہاں تک کہ ایک سورت کے اعجاز کو بیان کیا گیا ہے اور بلا استثناء تمام عالمین کو دعوت دی گئی ہے کہ اگر تم یہ نظریہ رکھتے ہو کہ یہ آیات خدا کی طرف سے نہیں ہیں تو اس قرآن کی مانند یا کم از کم اس کی ایک سورہ کی مثل تم بھی آیات لے آؤ۔

جیسا کہ ہم پہلی جلد میں سورہ بقرہ کی آیہ ۲۳ کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔ آیات قرآن میں کبھی سارے قرآن کے مقابلے کے لئے چیلنج کیا گیا ہے کبھی دس سورتوں کی دعوت دی گئی اور کبھی ایسی ایک سورت بنا کر لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ قرآن کا جزو اور کل سب معجزہ ہے۔ نیز چونکہ کسی معین سورہ کا ذکر نہیں ہوا لہذا قرآن کی ہر سورت کے مقابلے کی دعوت اس میں شامل ہے۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ قرآن کا اعجاز فصاحت و بلاغت، شیرینی بیان اور عمدورساتعیرات میں منحصر نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض پہلے مفسرین کا نظریہ ہے کہ بلکہ اس کے علاوہ اس کے دینی معارف، اس وقت تک کشف نہ ہونے والے

علوم کا اس میں ذکر، اس کے احکام و قوانین، ہر غلطی اور خرافات سے پاک گزشتہ لوگوں کی تاریخ اور اس میں تضاد و اختلاف کا نہ ہونا بھی معجزاتی پہلو رکھتے ہیں۔ (برائے شرح بیشتر)۔

اعجاز قرآن کا ایک نیا جلوہ

یہ امر جاذبِ توجہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اعجاز قرآن کے نئے نئے جلوے آشکار ہوتے ہیں جن کی طرف گزشتہ زمانے میں توجہ نہیں ہو سکی ان میں سے ایک یہ ہے کہ کمپیوٹر کے ذریعہ الفاظ قرآن، قرآنی جملوں کی بدنش اور ہر سورت کے زمانہ نزول سے ان کے ربط کی نئی نئی خصوصیات سامنے آتی ہیں، اس کا ایک نمونہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

آج کے محققین اور دانشوروں نے تحقیق و جستجو اور چھان بین سے آیات قرآن اور سورتوں کے نہایت پیچیدہ باہمی روابط معلوم کیئے ہیں اور اس سلسلے میں حیرت انگیز حتمی فامولے معلوم کئے ہیں۔ اس امر کے یقین کے ساتھ ایسا عملی نظم و نسق قرآن کی عمارت میں موجود ہے کہ اعداد شمار کی تحقیق و مطالعہ سے اور ریاضی کے دقیق قواعد کے ذریعہ آیات قرآن میں ریاضی کے فامولوں کے مطابق حسابات اور کامل منحنی خطوط (complete curves) اور پیچیدہ اصول معلوم ہوئے اور یہ دریافت اتنی اہم ہے کہ زمین کی کشش کے بارے میں نیوٹن کے قانون کی دریافت کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔

ایک عظیم قرآن شناس نے اپنے کام کا آغاز اس معمولی مسئلہ سے کیا ہے کہ مکہ میں نازل ہونے والی آیات چھوٹی چھوٹی ہیں جبکہ مدینہ میں نازل ہونے والی آیات طویل ہیں۔ یہ ایک فطری سی بات ہے کہ ہر لکھنے اور بولنے والا اپنے جملوں کی طوالت اور الفاظ کا آہنگ موضوع سخن کے اعتبار سے بدلتا ہے۔

توصیفی اور تعریفی مسائل چھوٹے چھوٹے جملوں میں بیان ہوتے ہیں اور تحلیلی و استدلالی مسائل طویل جملوں میں بیان کئے جاتے ہیں۔ جہاں گفتگو تحریک کے لئے ہو یا انتقادی اور تنقیدی حوالے سے عمومی اصول سے متعلق ہو یا اعتقاد کے حوالے سے کلی اصول بیان کرنا مقصود ہو تو لب و لہجہ شعار اور نعرے کا اختیار کیا جاتا ہے اور عبارتیں چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں لیکن جہاں کوئی داستان بیان کرنا ہو، کوئی واقعہ ذکر کرنا ہو، یا اخلاقی حوالے سے کوئی نتیجہ نکالتا ہو تو لب و لہجہ میں ٹھہراؤ ہوتا ہے اور عبارتیں لمبی ہوتی ہیں اور آہنگ میں نرمی ہوتی ہے۔

مکہ میں جو مسائل درپیش تھے وہ پہلی قسم کے تھے اور مدینہ میں پیش آنے والے معاملات دوسری قسم کے تھے۔ کیونکہ مکہ میں ایک تحریک اور انقلاب کی ابتداء تھی۔ وہاں بات اعتقادی اور انتقادی حوالے سے کلی اصول کے مطابق کرنا

تھی۔ لیکن مدینہ میں ایک معاشرہ کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ یہاں حقوق و اخلاق سے متعلق بات کرنا تھی، تاریخی واقعات بیان کرنا تھے اور ان سے فکری و علمی نتائج اخذ کرنا تھے۔

قرآن ایک فطری کلام ہے لہذا یہ امر ناگزیر ہے کہ یہ آسان، خوبصورت اور بلیغ طریقے کے مطابق ہو اور اسکے نتیجے میں آیات کے اختصار اور طوالت میں بھی مفاہیم کی مناسبت کو ملحوظ رکھے۔ اگر ہم قبول کر لیں کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو فطرت کے بھی مطابق ہے تو پھر اس کا یہ اختصار اور طوالت بغیر کسی حساب کتاب کے نہیں ہو سکتا ایک دقیق علمی قاعدہ کے مطابق اس کی ابتداء مختصر آیات سے ہوئی ہے اور آہستہ آہستہ آیات طویل ہوتی گئی ہیں لہذا ہر آیت اگلے برس نازل ہونے والی آیت سے چھوٹی ہے اور کسی ایک برس میں نازل ہونے والی آیت گزشتہ برس نازل ہونے والی آیت سے طویل تر ہے اس طرح سے ۲۳ سال کی مدت میں جو وحی نازل ہوئی ہے آیات کی اوسط طوالت کے لحاظ سے اسے تیس حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اس قاعدہ کی بناء پر تیس کالم ہونے چاہئیں کہ جن میں ان آیات کو ان کی طوالت کے لحاظ سے تقسیم کیا جاسکے۔ اب ہمیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ تقسیم بندی صحیح ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بعض آیات قرآن کی شان نزول معلوم ہے۔ بعض کے سال نزول کو تاریخی روایات نے معین کیا ہے اور صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ وہ کس سال میں نازل ہوئی ہیں اور بعض کو ان کے مفاہیم کے ذریعے معین کیا جاسکتا ہے مثلاً قبلہ کی تبدیلی، حرمت شراب حجاب اور احکام خمس و زکوٰۃ کے بارے میں جو آیات ہیں جن میں ہجرت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

ہم انتہائی تعجب سے دیکھتے ہیں کہ یہ آیات کہ جن کا سال نزول معلوم ہے ٹھیک انہی کالموں میں آتی ہیں جو آیات کی اوسط طوالت کے جدول میں ہر سال کے لحاظ سے خاص طور پر معین کئے گئے ہیں (غور کیجئے گا)۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس سلسلے میں دو تین استثنائی مواقع پیدا ہوئے ہیں مثلاً:

سورہ مائدہ نازل ہونے والی آخری بڑی سورت ہے جب کہ اس کی چند آیات کو فارمولے کے مطابق پہلے سالوں میں نازل ہونا چاہیئے تھا۔ تفاسیر تاور اسلامی روایات کی تحقیق کے بعد ہمیں معتبر مفسرین کے اقوال ملتے ہیں کہ جنہوں نے کہا ہے کہ یہ چند آیات ابتداء میں نازل ہوئی تھیں لیکن تدوین کے لحاظ سے پیغمبر کے حکم سے سورہ مائدہ میں موجود ہیں۔ لہذا اس طریقے سے ہر آیت کے سال نزول کو ریاضی کے قاعدے سے معین کیا جاسکتا ہے اور قرآن کی تدوین سال نزول کے حساب سے بھی کی جاسکتی ہے۔

دنیا میں کون ایسا خطیب ہے جس کی عبارت کی طوالت سے اس کے ہر جملے کی دائیگی کے سال کو معین کیا جاسکے خصوصاً جب کہ وہ کسی مولف کے علمی یا ادبی کتاب کا متن نہ ہو کہ جسے اس نے ایک معین مدت میں تسلسل کے ساتھ تحریر کیا ہو اور پھر اس کی زبان پر جاری ہوئی ہو۔ خصوصاً جب کہ وہ ایسی کتاب نہ ہو جسے لکھنے والے نے کسی ایک موضوع یا حتیٰ کہ معین شدہ مضامین میں تالیف کیا ہو۔ بلکہ اس میں گونا گوں مسائل ہوں کہ جو تدریجاً معاشرے کی ضرورت کے مطابق اور پیش آنے والے سوالات کے جواب میں بیان کیے گئے ہوں، ایسے مسائل جو ایک طویل جد و جہد اور مقابلے کے دوران پیدا ہوئے ہوں اور ایک رہبر کے ذریعے بیان ہوئے ہوں اور پھر انہیں جمع کر کے منظم کیا گیا ہو اور کتابی شکل دی گئی ہو۔^(۱)

بلکہ بعض مفسرین کے بقول قرآن کے مخصوص لغات و الفاظ کی طرز بھی اپنی نوع میں ایک معجزہ ہے۔ انہوں نے اس کے لئے مختلف اور جاذب نظر شواہد پیش کئے ہیں۔ ان میں سے ایک وہ واقعہ ہے جو مشہور مفسر سید قطب کو پیش آیا۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں وہ کہتے ہیں، میں ان حوادث و واقعات کے بارے میں بات نہیں کرتا جو دوسروں کو پیش آئے صرف وہ واقعہ بیان کرتا ہوں جو خود مجھے پیش آیا اور میرے علاوہ اسے دیکھنے والے پانچ افراد تھے۔ ہم چھ مسلمان ایک مصری بحری جہاز میں سوار تھے۔ بحری جہاز نیویارک جانے کے لئے اوقیانوس اطلس کو عبور کر رہا تھا جہاں میں کل ۱۲۰ مسافر تھے جن میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی تھے اور ہمارے سوا مسافروں میں سے کوئی مسلمان نہ تھا۔ جمعہ کے روز ہم نے سوچا کہ نماجمعہ وسط سمندر میں جہاز کے اوپر کی جائے ہم چاہتے تھے کہ مذہبی فریضہ کی ادائیگی کے علاوہ ایک عیسائی مبلغ کے سامنے اسلامی جرات کا مظاہرہ کیا جائے جس نے کشتی میں اپنا تبلیغی پر گرام ترک نہیں کیا تھا اور پھر خصوصاً جب کہ وہ ہمیں بھی مسیحیت کی تبلیغ کرنا چاہتا تھا۔ جہاز کا کپتان ایک انگریز تھا اس نے جہاز کے اوپر نماز باجماعت کی ہمیں اجازت دے دی۔ نیز جہاز پر رکام کرنے والوں کو بھی ہمارے ساتھ نماز نماز پڑھنے کی اجازت دے دی جو کہ سب افریقی مسلمان تھے۔ وہ بھی اس واقعہ سے بڑے خوش ہوئے کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ نماز جمعہ انجام پا رہی تھی۔

میں نماز جمعہ کا خطبہ پڑھنے لگا اور امامت کے لئے تیار ہوا۔ یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ تمام غیر مسلم مسافر ہمارے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہوئے گئی اور بڑے غور سے اس اسلامی فریضے کی انجام دہی دیکھتے رہے۔

نماز کے اختتام پر ان میں سے بہت سے لوگ ہمارے پاس آئے اور ہمارے اس کام کی تعریف کی۔ ان میں سے ایک خاتون تھی کہ جس کے بارے میں مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ یوگوسلاویہ کی ایک عیسائی عورت تھی جو ٹیٹو اور اس کے کمیونزم کے جہنم سے فرار کیے ہوئے تھی۔ وہ ہماری نماز سے بے حد متاثر ہوئی اس حد تک کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ اپنے اوپر کنٹرول نہیں کر پارہی تھی۔

وہ اپنی عام انگریزی زبان میں جو شدید تاثیر اور ایک خاص خضوع و خشوع میں ملی ہوئی تھی، گفتگو کر رہی تھی، اس کی گفتگو کے کچھ الفاظ یہ تھے:

بتاؤ کہ میں دیکھوں تمہارا کشیش کس زبان میں باتیں کرتا تھا (اس کا خیال تھا کہ یقیناً ایسی نماز فقط کشیش یا کوئی عالم ہی قائم کر سکتا ہے جیسا کہ عیسائیوں کے ہاں نماز ہوتی ہے لیکن ہم نے اسے جلد ہی سمجھا دیا کہ اس اسلامی پروگرام کو ہر صاحب ایمان مسلمان انجام دے سکتا ہے)

آخر میں ہم نے اس سے کہ ا: ہم تو عربی زبان میں بول رہے تھے۔

وہ کہنے لگی: میں اگرچہ تمہارے مطالب میں سے ایک لفظ بھی نہ سمجھ پائی تھی تاہم میں سے ایک صراحت سے دیکھا کہ تمہارے الفاظ عجیب و غریب طرز کے تھے۔

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: اور اس کی وہ بات وجوہ زیادہ اہم ہے اور جس نے مجھے بہت زیادہ متوجہ کیا یہ تھی، کہ تمہارے پیش نماز کے خطبے کے دوران کچھ جملے ایسے تھے جو باقی جملوں سے ممتاز تھے وہ بہت زیادہ موثر تھے اور گہرے معلوم ہوتے تھے یہاں تک کہ انھوں نے مجھے لرزہ بر اندام کر دیا۔ یقیناً ان جملوں میں کچھ اور مطالب تھے۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ تمہارا پیش نماز جب ان جملوں کو ادا کرتا ہے تو وہ روح القدس سے ملا ہوتا ہے۔

ہم نے تھوڑا سا غور و فکر کیا تو متوجہ ہوئے کہ یہ جملے آیات قرآن ہی تھیں جو میں نے خطبے کے دوران اور نماز میں پڑھی تھی۔

اس بات نے ہمیں ہلا کے رکھ دیا اور اس نکتے کی طرف متوجہ کیا کہ قرآن کی مخصوص طرز اس قدر موثر ہے کہ حتیٰ کہ ایک ایسی خاتون جو اس کے ایک لفظ کا مفہوم نہیں سمجھتی وہ بھی اس سے شدید متاثر ہو جاتی ہے۔ (تفسیر فی ظلال جلد

بعد والی آیت میں مشرکین کی مخالفتوں کی ایک بنیادی علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ وہ قرآن کا انکار اشکالات اور اعتراضات کی بناء پر نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی تکذیب اس وجہ سے تھی کہ وہ اس کے مضامین سے آگاہ نہیں تھے ﴿بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ﴾۔ در حقیقت ازن کے انکار کا عامل اور سبب ان کی عدم آگہی اور جہالت تھی

رہا یہ سوال کہ اس سے مراد کن امور کے بارے ان کی جہالت تھی اس سلسلے میں مفسرین نے کئی احتمالات ذکر کیے ہیں کہ جو سب کے سب آیت میں مراد ہو سکتے ہیں، منجملہ ان کے:

معارف دینی اور مبداء و معاد سے جہالت جیسا کہ قرآن معبود حقیقی اللہ کے بارے میں مشرکین کا قول نقل کرتا ہے کہ وہ کہتے تھے: اجعل الالهة الها واحداً ان هذا الشئ عجاب۔

کیا اس نے ہمارے خداؤں کو ایک معبود میں بدل دیا ہے، عجیب و غریب چیز ہے (ص ۵) یا پھر وہ معاد کے بارے میں کہتے تھے: ﴿هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يَنْبِئُكُمْ إِذَا مَرَّ قَتَمٌ كُلِّ مَرَّ قٍ أَنْكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ افْتَرَىٰ عَلَىٰ اللَّهِ كَذِبًا أَمْرٌ بِهِ جَنَّةٌ﴾ (سبا، ۷-۸)

کیا تمہیں اسے شخص کے بارے میں بتائیں جو تم سے بیان کرے گا کہ جب تم (مر کر گل سڑ جاو گے اور) بالک ریزہ ریزہ ہو جاو گے تو تم ایک نیا جنم لو گے کیا اس شخص (محمد) نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے یا اسے جنون (ہو گیا) ہے۔

در حقیقت ان لوگوں کے پاس مبداء و معاد کی نفی کے لئے کوئی دلیل نہیں تھی صرف جہالت اور بے خبری ضرافات اور بڑے بوڑھوں کے مذہب کے عادی ہو جانے سے، ان کے لئے سدرہ تھی۔

پھر وہ احکام کے اسرار سے جاہل تھے اسی طرح آیات تشابہ کے مفہوم سے جاہل تھے یا صرف، مقطعات کے مفہوم سے نابلد تھے۔

یہی سب جہالتیں انھیں تکذیب اور انکار پر ابھارتی تھیں جب کہ ابھی تک مسائل مجہولہ کی تاویل، تفسیر اور حقیقت ان پر واضح نہیں ہوئی تھی۔ ﴿وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ﴾۔

”تاویل“ اصل لغت میں کسی چیز کو لوٹانے کے معنی میں ہے لہذا کوئی کام اور بات اپنے اصلی مقصد تک پہنچ جانے تو ہم کہتے ہیں کہ اس کی تاویل آگئی ہے۔ اس بناء پر کسی اقدام کے اصلی ہدف کا بیان، کسی بات کی حقیقی تشریح یا کسی

خواب کی تعبیر اور نتیجہ یا کسی بات کا عملی صورت اختیار کر جانا، سب کو تاویل کہا جاتا ہے (اس سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد دوم ص ۲۵۴۔ اردو ترجمہ پر ہم تفصیل سے گفتگو کر آئے ہیں)۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ یہ غلط روش صرف زمانہ جاہلیت کے مشرکین میں ہی منحصر نہیں ہے بلکہ گزشتہ گرامہ قویں بھی اسی ابتلاء میں مبتلا تھیں، وہ بھی حقائق کی پہچان اور تحقیق کے بغیر اور ان کے تحقق کی انتظار کے بغیر ان کا انکار اور تکذیب کرتے تھے ﴿كَذَلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ﴾۔

سورہ بقرہ کی آیت ۱۱۳۔ اور ۱۱۸۔ میں گزشتہ امتوں کی کیفر کی طرف اس حوالے سے اشارہ کیا گیا ہے۔ درحقیقت ان سب کا عذر ان کی جہالت ہی تھی اور حقائق کے بارے میں تحقیق نہ کرنا ان کی بد بختی کا باعث تھا جبکہ عقل و منطق کا تقاضا ہے کہ انسان جس چیز کو نہیں جانتا اس کا ہرگز انکار نہ کرے بلکہ اس کی جستجو اور تحقیق کرے۔

آخر میں روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: دیکھو کہ ان ستم گروں کا انجام کار کیا ہوا ﴿فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ﴾۔ یعنی وہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں گے۔

زیر بحث آخری آیت میں مشرکین کے دو بڑے گروہوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ سب کے سب اسی حالت میں باقی نہیں رہیں گے بلکہ ”ان میں سے ایک گروہ جس میں حق طلبی کی روح مردہ نہیں ہوئی، آخر کار اس قرآن پر ایمان لے آئے گا جب کہ دوسرا گروہ اس ی طرح اپنی جہالت اور ہٹ دھرمی پر قائم رہے گا اور ایمان نہیں لائے گا“ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يُؤْمِنُ بِهِ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَا يُؤْمِنُ بِهِ﴾۔

واضح ہے کہ یہ دوسرا گروہ فاسد اور مفسد ہے اسی وجہ سے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: تیرا پروردگار مفسدین کو بہتر جانتا ہے ﴿وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِينَ﴾۔

یہاں طرف اشارہ ہے کہ جو افراد حق قبول نہیں کرتے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے معاشرے کا شیرازہ بکھیر دیا ہے اور معاشرے کے نظام کو خراب کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

جہالت اور انکار

جیسا کہ مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اصولی طور پر زیادہ تر حق کی مخالفتوں، دشمنیوں اور حق کے خلاف جنگ کا سرچشمہ جہالت اور نادانی ہے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ جہالت کا انجام کفر ہے۔

پہلا فریضہ جو ہر حق طلب انسان کے ذمہ ہے یہ ہے کہ جسے وہ جانتا اس کے بارے میں سکوت اور خاموشی اختیار کرے، انتظار کرے اور تحقیق و سجتجو کے لئے اٹھ کھڑا ہو، جس مطلب کو نہیں جانتا اس کے تمام پہلوؤ کا مطالعہ کرے تحقیق کرے۔ جب تک اس کی نفی پر کوئی قطعی دلیل نہ مل جائے اس کی نفی نہ کرے جیسا کہ بغیر قطعی دلیل کے اثبات بھی نہ کرے۔

مرحوم طبری نے مجمع البیان میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس سلسلے میں ایک نہایت عمدہ حدیث نقل کی ہے۔ آپ نے فرمایا:

اللہ نے قرآن کی دو آیات میں اس امت کو دو اہم درس دیئے ہیں۔ پہلا یہ کہ جسے جانتے ہو اس کے سوا کوئی بات نہ کہو اور دوسرا یہ کہ جسے جانتے نہیں ہو اس کا انکار نہ کرو۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ دو آیات تلاوت کیں: ﴿لَمَّا لِيُوْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّثْقَالُ الْكِتَابِ اِنْ لَا يَقُولُوْا عَلٰی اللّٰهِ الْحَقُّ﴾۔

کیا خدا نے ان سے آسمانی کتاب کا عہد و پیمان نہیں لیا کہ خدا کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہیں۔

﴿بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعَلَمِهِ﴾۔

مشرکین نے ایسی چیزوں کا انکار کیا کہ جن آگاہی نہیں رکھتے تھے جب کہ جہالت کسی چیز کے انکار کے لئے دلیل نہیں ہے۔

آیات ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴

۴۱۔ ﴿وَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ لِي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ أَنْتُمْ بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِمَّا تَعْمَلُونَ﴾۔

۴۲۔ ﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ﴾۔

۴۳۔ ﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْظُرُ إِلَيْكَ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْى وَلَوْ كَانُوا لَا يَبْصُرُونَ﴾۔

۴۴۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسُهُمْ يَظْلِمُونَ﴾۔

ترجمہ

۴۱۔ انھوں نے تیری تکذیب کی ہے تو کہہ دے کہ میرا عمل میرے لئے اور تمہارا عمل تمہارے لئے۔ جو کچھ میں انجام دیتا ہوں تم اس سے بیزار ہو اور میں اس سے بیزار ہوں جو تم کرتے ہو۔

۴۲۔ اور ان میں سے ایک گروہ تیری طرف کان دھرتا ہے (لیکن گویا وہ بالکل نہیں سنتا اور بہرہ ہے) کیا تو اپنی بات بہروں کے کانوں تک پہنچا سکتا ہے، اگر وہ نہ سمجھیں۔

۴۳۔ اور ان میں سے ایک گروہ تیری طرف دیکھتا ہے (لیکن گویا وہ بالکل نہیں دیکھتا) کیا تو نابینوں کو ہدایت کر سکتا ہے۔

۴۴۔ خدا انسانوں پر بالکل ظلم نہیں کرتا لیکن انسان ہیں کہ جو اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

اندھے اور بہرے

گزشتہ آیات میں ہٹ دھرمی پر بنی مشرکین کے انکار کے بارے میں بحث آئی ہے۔ یہاں بھی اسی بحث کو آگے بڑھایا گیا ہے۔

پہلی آیت میں ایک نئے طریقے سے پیغمبر کو مقابلے کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اگر وہ تیری تکذیب کریں تو ان سے کہہ دو کہ میرا عمل میرے لئے اور تمہارا عمل تمہارے لئے ﴿وَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ لِي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ﴾۔

جو میں انجام دیتا ہوں اس سے تم بیزار ہو اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو میں اس سے بیزار ہوں ﴿أَنْتُمْ بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِمَّا تَعْمَلُونَ﴾۔

بیزاری اور بے اعتنائی کا یہ اعلان جس سے اپنے مکتب پر قطعی اعتماد اور ایمان جھلکتا ہے خاص طور پر ہٹ دھرمی منکرین پر ایک مخصوص نفسیاتی اثر رکھتا ہے یہ اعلان ان پر واضح کرتا ہے کہ اس مکتب کو قبول کرنے میں کوئی اصرار اور

جبر نہیں ہے وہ حق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کی وجہ سے اپنے آپ کو محرومیت کی طرف لے گئے ہیں اور اس طرح صرف اپنے ہی کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

ایسی تعبیریں قرآن کی دیگر آیات میں بھی ہیں۔ جیسا کہ سورہ کافرون میں ہے:- ﴿لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾۔

تمہارا دین تمہارے لئے اور میرا دین میرے لئے۔

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایسی آیات کا مفہوم مشرکین کے مقابلے میں تبلیغ اور جہاد کے حکم کے منافی نہیں کہ ہم انھیں منسوخ سمجھنے لگیں بلکہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ یہ بے اعتنائی اور بے نیازی کے انداز میں ہست دھرم اور کینہ پرور افراد سے ایک منطقی مقابلہ ہے۔

بعد والی آیات میں حق سے ان کے احراف اور عدم تعلیم کی دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ایک انسان کی ہدایت کے لئے صرف صحیح، ہلادینے والی اور پر اعجاز آیات اور واضح دلائل کافی نہیں ہیں بلکہ قبول کرنے کے لئے آمادہ گی اور قبولیت حق کی لیاقت بھی ضروری ہے جیسا کہ سبزہ پھول اگانے کے لئے صرف تیار شدہ بیج کافی نہیں ہے۔ آمادہ زمین بھی ضروری ہے۔

اسی لئے پہلے فرمایا گیا: ان میں سے ایک گمروہ تیری طرف کان تو دھرتا ہے لیکن گویا یہ لوگ بہرے ہیں ﴿وَمِنْهُمْ﴾

يَسْتَمْعُونَ إِلَيْكَ^(۱)

باوجودیکہ وہ سننے والا کان نہیں رکھتے، کیا تم ان بہروں کے کانوں تک اپنی آواز پہنچا سکتے ہو، چاہے وہ عقل و ادراک نہ رکھتے ہوں ﴿أَفَأَنْتَ تَسْمَعُ الصَّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ﴾۔

”اور ایک گمروہ تیرے طرف آنکھ لگائے ہوئے ہے اور تیرے اعمال دیکھتا رہتا ہے کہ جن میں سے ہر ایک تیری حقانیت اور راست گوئی کی نشانیوں کو دیکھ سکتا ہے لیکن گویا یہ لوگ اندھے ہیں“ ﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْظُرُ إِلَيْكَ﴾۔ کیا اس کے باوجود تو ان نابینوں کو ہدایت کر سکتا ہے اگرچہ ان کے پاس کوئی بصیرت نہ ہو

﴿أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْى وَلَوْ كَانُوا لَا يَبْصُرُونَ﴾۔^(۲)

لیکن جان لو اور وہ بھی جالیں کہ یہ فکری نارسائی، عدم بصیرت، حق کا چہرہ دیکھنے کے بارے میں اندھا پن اور کلام الہی کے لئے ناشنوائی کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جسے وہ شکم مادر سے اپنے ساتھ لائے ہیں اور خدا نے ان پر کوئی ظلم کیا ہو خود انہیں نے اپنے غلط اعمال، حق دشمنی اور گناہوں سے اپنی روح کو تاریک کر کے اپنی دیکھنے والی آنکھ اور اہنے سننے

والے کان کو بیکار کر دیا ہے، کیونکہ ”خدا کسی شخص پر ظلم کرتا لیکن یہ لوگ ہیں جو خود اپنے اوپر ظلم روا رکھتے ہیں“ ﴿إِنَّ
اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسُهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ -

۱۔ اس آیت میں درحقیقت ”کاہم صم لایسمعون“ کا جملہ مقدر ہے۔

۲۔ یہاں ”کاہم عمی لایبصرون“ کا جملہ مقدر ہے۔

دو قابل توجہ نکات

۱۔ ”﴿مَنْ يَسْتَمْعُونَ﴾“ اور ”﴿مَنْ يَنْتَظِرُ﴾“ سے کیا مراد ہے:

یہ جو دوسری آیت میں ہے کہ ”ان میں سے کچھ لوگ تیری بات سنتے ہیں“ اور تیسری آیت میں ہے کہ ”ان میں سے کچھ نہیں جو تیری طرف دیکھتے ہیں“ اور یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ تیری اعجاز نما باتوں کو سنتے ہیں اور کچھ سنتے ہیں اور کچھ دوسرے ہیں جو تیرے معجز نشان اعمال دیکھتے ہیں کہ جو سب کے سب تیری صدق گفتار اور تیری دعوت کی حقانیت کی دلیل ہیں لیکن کان دھرنے اور دیکھنے والے ان دونوں گروہوں میں سے کوئی بھی فائدہ نہیں اٹھاتا، کیونکہ ان کی نگاہ فہم و ادراک کی نگاہ نہیں ہے، بلکہ تنقید، عیب جوئی، اور مخالفت کی نظر ہے۔ وہ کان دھرنے کے سننے سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتے کیونکہ ان کا مقصد مفہوم سخن نہیں ہوتا بلکہ وہ تو تکذیب اور انکار کے لئے بہانے تلاش کرتے پھر تے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ انسان کے اعمال کی بنیاد اس کا راہ اور نیت ہی ہے۔ نیت اور ارادہ ہی انسانی اعمال کے اثرات کو دیگر گون کر دیتا ہے۔

۲۔ ”﴿وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ﴾“ اور ”﴿وَلَوْ كَانُوا لَا يَبْصُرُونَ﴾“ کا مفہوم:

زیر نظر الفاظ سننا کافی نہیں بلکہ دوسری آیت کے آخر میں ”وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ“ آیا ہے۔ اور تیسری آیت کے اختتام پر ”وَلَوْ كَانُوا لَا يَبْصُرُونَ“ آیا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ فقط کانوں سے تفکر و تدبر بھی ضروری ہے تاکہ انسان الفاظ کے مفہیم سے فائدہ اٹھائے اسی طرح کسی چیز کو آنکھوں سے صرف دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ بصیرت اور رجن چیزوں کو انسان دیکھتا ہے انہیں سمجھنا بھی ضروری ہے تاکہ ان کی گہرائی تک پہنچے اور ہدایت حاصل کرے۔

آیات ۳۵، ۳۶، ۳۷

۴۵۔ ﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُهُمْ كَأَن لَّمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ وَمَا كَانُوا

مُهْتَدِينَ﴾۔

۴۶۔ ﴿وَأَمَّا نُزُيِّنُكَ بِغَضِّ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَقَّيْنِكَ فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ﴾۔۔

۴۷۔ ﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾۔

ترجمہ

۴۵۔ اس دن کو یاد کرو جب انھیں جمع (اور محشور) کرے گا اور انھیں ایسا محسوس ہو گا جیسے (دنیا میں) انھوں نے دن کی ایک گھڑی سے زیادہ توقف نہیں کیا۔ بس اتنی مقدار کہ ایک دوسرے کو (دیکھیں اور) پہچان لیں۔ وہ کہ جنہوں نے لقاۃ الہی (اور روز قیامت) کا ناکر کیا وہ خسارے میں رہے، اور انھوں نے ہدایت حاصل نہ کی۔

۴۶۔ اور گارہم کچھ سزائیں کہ جن کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے (تیری زندگی میں) تجھے دکھائیں یا (قبل اس کے کہ وہ عذاب میں گرفتار ہوں) تجھے دنیا سے لے جائیں، بہر حال ان کی بازگشت ہماری طرف ہے۔ اس کے بعد خدا اس پر گواہ ہے جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں۔

۴۷۔ اور ہدایت کے لئے ایک رسول ہے۔ جب ان کا رسول ان کی طرف آئے تو خدا ان کے درمیان عدل سے فیصلہ کرتا ہے اور ان پر ظلم نہیں ہوگا۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں مشرکین کی بعض صفات بیان کرنے کے بعد اب ان آیات میں قیامت میں ان کی دردناک کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس دن کو یاد کرو جب خدا ان سے کو محشور کرے گا اور اس حالت میں کہ وہ محسوس کریں گے کہ دنیا میں ان کی ساری عمر دن کی ایک گھڑی سے زیادہ بس اتنی مقدار کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ لیں، اور پہچان لیں ﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُهُمْ كَأَن لَّمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ﴾۔

دنیا میں تھوڑی سی دیر کا یہ احساس اس بناء پر ہے کہ آخرت کی دائمی زندگی کے مقابلے میں یہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ہے۔

یا اس بناء پر کہ یہ ناپائیدار اور دنیا ان پریوں تیزی سے گزری ہے کہ ایک ساعت سے زیادہ نہ تھی۔

یا پھر اپنی زندگی سے صحیح فائدہ نہ اٹھانے کی وجہ سے یوں خیال کریں گے کہ ان کی ساری عمر ایک گھڑی سے زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتی تھی۔

جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہ ہے اس کے پیش نظر ”﴿یتعارفون بینہم﴾“ (ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں) کا جملہ دنیا میں ان کے قیام کی مقدار کی طرف اشارہ ہے یعنی اس طرح وہ اپنی عمر کو مختصر اور کم محسوس کریں گے گویا صرف اتنی مقدار تھی کہ جس میں دو آدمی ایک دوسرے کو دیکھ کر آپس میں متعارف ہوں اور پھر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ مراد یہاں زمانہ برزخ کی کمی کا احساس ہے یعنی وہ لوگ دورانِ برزخ کی نیند کی سی کیفیت میں ڈوب جائیں گے جس میں ساہا سال اور صدیوں اور زمانوں کے گزرنے کا احساس نہیں کریں گے اور قیامت کے دن ہزار ہا سال پر مشتمل زمانہ برزخ انہیں ایک ساعت سے زیادہ محسوس نہیں ہوگا۔

اس تفسیر کے لئے شاہد سورہ روم کی آیت (۵۵۔ ۵۶) ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے:-

﴿وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ مَا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذَلِكَ كَانُوا يُؤْفَكُونَ وَقَالَ الَّذِينَ اٰتَوْا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ

لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ اللّٰهِ الْيَوْمَ الْبَعْثُ فَهٰذَا يَوْمَ الْبَعْثِ وَلَكِنَّكُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ -

ان دو آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت قیامت برپا ہوگی، مجرمین کا ایک گروہ قسم کھائے گا کہ ان کے برزخ ک ادور ایک ساعت سے زیادہ نہیں تھا لیکن مومنین ان سے کہیں گے وہ طولانی دور تھا اور اب قیامت برپا ہوئی ہے او ر تمہیں معلوم نہیں ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ برزخ تمام لوگوں کے لئے ایک جیسی نہیں ہے اور اس کی تفصیل ہم متعلقہ آیات کے ذیل میں بیان کریں گے۔

اس تفسیر کے مطابق ”﴿یتعارفون بینہم﴾“ کا معنی یہ ہوگا کہ وہ لوگ زمانہ برزخ کی مقدار اتنی کم محسوس کریں گے کہ انہیں دنیا کی کوئی بات بھولی نہیں ہوگی اور وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سے پہچان لیں گے۔

اور یہ کہ وہاں ایک دوسرے کے برے اعمال کو دیکھیں گے اور ایک دوسرے کے باطن کو پہچان لیں گے اور یہ خود ان کے لئے ایک بہت بڑی رسوائی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ اس دن ان سب پر ثابت ہو جائے گا کہ وہ افراد جنہوں نے روز قیامت اور لقائے الہی کی تکذیب کی، انہوں نے نقصان اٹھایا۔ اور وہ اپنے وجود کا سارا سرمایہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے اور اسے کوئی نتیجہ بھی حاصل نہ کیا ﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ﴾۔

اور یہ لوگ اس تکذیب، انکار، گناہ پر اصرار ہست دھرمی کی وجہ سے ہدایت کی اہلیت نہیں رکھتے تھے ﴿وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ﴾۔ کیونکہ ان کا دل سیاہ اور ان کی روح تاریک تھی۔

اگلی آیت میں کفار کی تہدید کے لئے پیغمبر کو تسلی دینے کی خاطر فرمایا گیا ہے: جن سزاؤں کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے اگر ان کا کچھ حصہ ہم تجھے دکھائیں اور اپنی زندگی کے دوران اگر تو ان کے عذاب اور سزا کو دیکھ لے اور یا پھر اس سے قبل کہ وہ ایسے کام سے دوچار ہوں ہم تجھے دنیا سے لے جائیں، بہر حال ان کی بازگشت ہماری طرف ہے اور خدا ان کے انجام دیئے ہوئے اعمال پر شاہد ہے ﴿وَأَمَّا نُزِیْنَكَ بَعْضَ الَّذِی نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّیْنَكَ فَإِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللَّهُ شَهِیْدٌ عَلَی مَا یَفْعَلُونَ﴾۔

زیر نظر آیت میں بشمول پیغمبر اسلام تمام انبیاء کے بارے میں اور تمام امتوں کے بارے میں کہ جن میں رسول اللہ کے زمانے کی امت بھی شامل ہے، ایک کلی قانون بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ہدایت کے لئے خدا کی طرف سے ایک رسول اور فرستادہ الہی ہوتا ہے ﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ﴾۔

جب ان کی طرف رسول آیا اور اس نے ابلاغ رسول کیا اور کچھ لوگوں نے حق کو قبول کر لیا اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا اور ایک ایک گروہ مخالفت اور تکذیب کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تو خدا ان کے درمیان اپنے عدل سے فیصلہ کرتا ہے اور کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔ مومن اور نیک لوگ باقی رہ جاتے ہیں اور برے اور مخالفت یا تو نابود ہو جاتے ہیں اور یا پھر شکست سے دوچار ہوتے ہیں ﴿فَإِذَا جَاءَ رَسُوْلُهُمْ فَضَیْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ﴾۔

اسی طرح پیغمبر اسلام اور ان کے معاصر امت کے ساتھ ہوا کہ ان کی دعوت کے مخالف یا تو جنگوں میں ختم ہو گئے اور یا آخر کار شکست کھا کر معاشرے سے مسترد ہو گئے اور مومنین نے امور کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ لہذا جس فیصلے کی طرف آیت میں اشارہ ہوا ہے یہ وہی تکوینی قضاوت اور فیصلہ ہے جو اسی دنیا میں جاری ہوا ہے۔ باقی رہا یہ جو بعض نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ روز قیامت خدا کے فیصلے کی طرف اشارہ ہے، خلاف ظاہر ہے۔

آیات ۲۸، ۳۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲

۴۸۔ ﴿وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾۔

۴۹۔ ﴿قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ إِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾۔

۵۰۔ ﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن آتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتًا أَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ﴾۔

۵۱۔ ﴿أَنْتُمْ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنْتُمْ بِهِ أَلَاآنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ﴾۔

۵۲۔ ﴿ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ﴾۔

ترجمہ

۴۸۔ وہ کہتے ہیں یہ جو (سزا کا) وعدہ ہے، اگر سچ کہتے ہو تو کب اس پر عمل ہو گا۔

۴۹۔ کہہ دو میں اپنے لئے نقصان اور نفع کا مالک نہیں ہوں (چہ جائیکہ تمہارے لئے) مگر وہ جو خدا چاہے۔ ہر قوم و ملت کے لئے ایک اجل اور انجام ہے جب ان کی اجل آجاتی ہے (اور ان کی سزا یا موت کا حکم صادر ہو جائے) تو نہ ایک گھڑی تاخیر کرتے ہیں اور نہ ہی ایک گھڑی آگے ہوتے ہیں۔

۵۰۔ کہہ دو کہ اگر اس کی سزرات کے وقت یا دن کو تمہیں آہنچے (تو کیا تم اسے دور کر سکتے ہو) پس مجرمین کس بناء پر جلدی کرتے ہیں۔

۵۱۔ یا یہ کہ جب واقع ہوگی تو ایمان لے آؤ گے (لیکن جا لو کہ تمہیں کہا جائے گا کہ) اب جب کہ پہلے اس کے لئے جلدی کرتے تھے (اس وقت کیا فائدہ)۔

۵۲۔ پھر جنہوں نے ظلم کیا ہے ان سے کہا جائے گا: ابدی عذاب چکھو، جو کچھ تم انجام دیتے تھے کیا تمہیں اس کے علاوہ کی سزا دی جائے گی۔

خدائی سزا میرے ہاتھ میں نہیں ہے

منکرین حق کو عذاب اور سزا کی تہدیدوں کے بعد اب ان آیات میں پہلے تو ان کی تکذیب اور تمسخر بھری بات بیان کی گئی ہے: وہ کہتے ہیں کہ عذاب کے بارے میں تم جو وعدہ کرتے ہو اگر سچ ہو تو وہ کب ہے؟ ﴿وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾۔

یقیناً یہ باتیں پیغمبر اسلام کے زمانے کے مشرکین کرتے تھے۔ کیونکہ بعد والی آیات جس میں پیغمبر اکرم کا جواب موجود ہے اس امر پر شاہد ہے۔

بہر حال اس طرح سے وہ پیغمبر کی تہدوں کے بارے میں اپنی اعتنائی کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے اور جو افراد ان تہدیدوں کی وجہ سے متزلزل ہو گئے تھے ان کے قوت قلب اور سکون فکر کا سامان کرنا چاہتے تھے۔ اس کے جواب میں خدا تعالیٰ پیغمبر اکرم کو حکم دیتا ہے کہ انہیں چند طریقوں سے جواب دیں۔

پہلا یہ کہ فرماتا ہے: ان سے کہہ دو کہ ان کام کا وقت اور وعدہ گاہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں اپنے لئے نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں، چہ جائیکہ تمہارے لئے، مگر جو کچھ خدا چاہے۔ اور جو وہ ارادہ کرے ﴿قُلْ لَا أَفْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ﴾۔ میں تو صرف اس کا بھیجا ہوا اور پیغمبر ہوں فزول عذاب کے لئے وعدہ گاہ کا وقت کا تعین اسی کے ہاتھ میں ہے۔ جب میں اپنے بارے میں نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں تو تمہارے بارے میں بدرجہ اولیٰ نہیں ہوں گا۔

یہاں درحقیقت توحید افعالی کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اس عالم میں تمام چیزوں کی بازگشت خدا کی طرف ہے۔ ہر کام اسی کی طرف سے ہے کہ جو اپنی حکمت سے مومنین کو کامیابی عطا کرتا ہے اور وہی ہے جو منخرفین کو اپنے عدل سے سزا دیتا ہے۔

واضح ہے کہ یہ اس بات کے منافی نہیں کہ اللہ نے ہمیں قدرت و طاقت دی ہے کہ جس کے ذریعے ہم اپنے بعض منافع اور نقصانات کے مالک ہیں اور اپنی سرنوشت کے بارے میں ہم ارادہ کر سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ آیت مالکیت بالذات کی نفی کرتی ہے نہ کہ مالکیت بالغیر کی اور ”الا ماشاء اللہ“ اس کے لئے واضح قرینہ ہے۔

یہاں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس آیت سے جو بعض متعصب افراد مثلاً مولف المنار نے پیغمبر سے توسل کے جواز کی نفی کا مطلب لیا ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ اگر توسل سے مراد یہ ہو کہ ہم پیغمبر اکرم کو بالذات صاحب قدرت اور مالک سود و زیاں سمجھیں تو مسلم ہے کہ یہ شرک ہے اور کوئی مسلمان یہ عقیدہ نہیں رکھ سکتا اور اگر یہ مالکیت خدا کی طرف سے ہو اور ”الا ماشاء اللہ“ کے مفہوم کے مطابق ہو تو اس میں کوئی مانع نہیں ہے اور یہ عین ایمان و توحید ہے۔ مذکورہ مولف نے اس نکتے سے غفلت کی وجہ سے طویل بحثوں سے اپنا اور اپنے قارئین کا وقت جاع کیا ہے۔ افسوس

سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کی تفسیر تمام تر خصوصیات کے باوجود اس میں اشتباہات بہت زیادہ ہیں۔ جن کا سرچشمہ تعصب کو سمجھا جاسکتا ہے۔

دوسرا یہ کہ فرماتا ہے: ہر قوم اور جمیعت کے لئے ایک معین زمانہ اور اجل ہے جن ان کی اجل آجاتی ہے تو وہ اس میں نہ ایک گھڑی تاخیر کر سکتے ہیں نہ گھڑی بھر کے لئے آگے بڑھ سکتے ہیں ﴿لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ إِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾۔

دوسرے لفظوں میں کوئی قوم و ملت جب راہ حق سے منحرف ہو تو اپنے اعمال کے نتیجے میں خدا کی سزا سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ جب لوگ ایسے راستوں پر چل پڑیں اور آفرینش کے قطعی قوانین سے انحراف کریں تو اپنے مسائل کھو بیٹھتے ہیں اور آخر کار قعر مذلت میں جا گرتے ہیں تاریخ عالم ایسے لوگوں کی مثالوں میں بھری پڑی ہے۔

مشرکین جو عذاب الہی کے آنے میں تعجیل کا تقاضا کرتے تھے، درحقیقت انھیں خبرداری کرتا ہے کہ وہ بلا وجہ جلدی نہ کریں، جب وقت آئے گا تو اس عذاب میں لمحہ بھر کی تاخیر و تقدیم نہیں ہوگی۔

ضمنی طور پر متوجہ رہنا چاہیئے کہ لفظ ”ساعت“ کبھی لحظہ اور لمحہ کے لئے آتا ہے اور کبھی زمانے کی تھوڑی سی مدت کے لئے آتا ہے اگرچہ آج کل رات دن کے چوبیسویں حصہ (ایک گھنٹہ) کو ”ساعت“ کہتے ہیں۔

تیسرا جواب اگلی آیت میں پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: ان سے کہہ دو کہ اگر رات یا دن کے وقت پروردگار کا عذاب تم پر آجائے تو یہ کوئی غیر ممکن بات نہیں ہے، کیا تم اس ناگہانی عذاب کو دو کر سکتے ہو۔ ﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَنَاكُمْ عَذَابُهُ بَيِّنَاتًا أَوْ هَارًا﴾۔

ان حالات میں مجرم اور گنہگار اگر کیوں جلدی کرتے ہیں ﴿مَاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ﴾۔^(۱)

بعض نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ ”ماذا يستعجل“ جزائے شرط ہے، بہت بعید ہے۔ (غریب نے گا)۔

دوسرے لفظوں میں ان جسور مجرموں کو انزول عذاب کا یقین ہے تو کم از کم اس کا احتمال تو انھیں ہے ہی کہ اچانک عذاب ان کے پیچھے آجائے۔ ان کے پاس اس کے لئے کیا بند و سبب، ضمانت اور دلیل ہے کہ پیغمبر کی تہدیدیں بالکل وقوع پذیر نہیں ہوں گی۔ عقل مند انسان کو ایسے احتمال ضرر کی صورت میں بھی کچھ نہ کچھ احتیاط کرنا چاہیئے اور اس سر ڈرنا چاہیئے۔

ایسا ہی مفہوم دیگر تعبیرات کی صورت میں قرآن کی سدوسری آیات میں موجود ہے: مثلاً: افامنهم ان یخسف بکم جانب البر او یرسل علیکم حاصباً ثم لا تجدوا الکم وکیلاً -

کیا تم اس سے مامون ہو کہ خدا تمہیں زمین کے کسی حصہ میں اندر سما دے (یعنی تم زمین میں دھنس جاو) یا تم پر آسمان سے سنگریزے برسائے اور پھر تم اپنے لئے کوئی نگہبان نہ پاؤ۔ (بنی اسرائیل ۶۸)

یہ وہی چیز ہے جسے علم کلام اور علم اصول میں ”لزوم دفع ضرر محتمل“ کہا جاتا ہے۔

چوتھا جواب اس سے بعد والی آیت میں دیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: اگر تم گمان کرتے ہو کہ فزول عذاب کے وقت ایمان لاو گے تمہارا ایمان قبول کر لیا جائے گا تو یہ خیال باطل ہے ﴿اَنْتُمْ اِذَا مَا وَقَعَ اَمَنْتُمْ بِهِ﴾۔ کیونکہ فزول عذاب کے بعد توبہ کے دروازے تم پر بند ہو جائیں گے اور پھر ایمان لانے کا ذرہ بھر اثر بھی نہ ہوگا۔ بلکہ ”تم سے کہا جائے گا کہ اب ایمان لا رہے ہو جب کہ پہلے تم تمسخر اور تکذیب کرتے ہوئے عذاب کے لئے تعجیل کرتے تھے ﴿الْاَنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ﴾۔

یہ ان کی دنیاوی سزا ہے ”پھر روز قیامت جن لوگوں نے ظلم کیا ہے، ان سے کہا جائے گا ابدی اور ہمیشہ کا عذاب چکھو“ ﴿ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ﴾۔

کیا جو کچھ تم نے انجام دیا ہے تمہیں اس کے سوا سزا دی جائے گی ﴿هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ﴾۔

یہ درحقیقت تمہارے ہی اعمال ہیں جو تمہیں دامن گیر ہوئے ہیں، وہی تمہارے سامنے مجسم ہوئے ہیں اور وہی تمہیں ہمیشہ تکلیف و آزار پہنچاتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ قرآنی آیت سے غلط استدلال:

جیسا کہ سورہ اعراف کی آیہ ۳۴ کے ذیل میں ہم نے کہا ہے کہ ہمارے زمانے کے بعض دین ساز لوگوں نے ”لکل امۃ اجل“ جیسی آیات سے جو قرآن میں دو مرتبہ آئی ہے، پیغمبر اسلام کی خاتمیت کی نفی کے لئے استدلال کیا ہے اور یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ہر دین و مذہب آخر کار ختم ہو جاتا ہے اور اپنی جگہ دوسرے کو دے دیتا ہے حالانکہ لفظ ”امت“ گروہ اور جماعت کے معنی میں ہے نہ کہ مذہب کے معنی میں خصوصاً ایک مذہب کے پیروکار۔

ان آیات کا مقصد یہ ہے کہ قانونِ موت و حیات افراد سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ملتوں اور گروہوں پر بھی یہ قانون حاوی ہے، اور جب وہ ظلم و گناہ اختیار کریں گے تو ختم ہو جائیں گے، خصوصاً زیر بحث آیت سے پہلے اور بعد کی آیات کی طرف توجہ سے یہ حقیقت واضح پر ثابت ہو جاتی ہے کہ یہاں کسی مذہب کے منسوخ ہونے سے متعلق گفتگو نہیں ہے بلکہ خزل عذاب اور ایک گروہ و ملت کے نابود اور ختم ہو جانے کے بارے میں ہے کیونکہ قبل و بعد کی دونوں آیات دنیاوی عذاب اور سزا کے بارے میں بات کر رہی ہیں۔

۲۔ دنیا میں مسلمانوں کے لئے سزا:

مندرجہ بالا آیات کی طرف توجہ کرنے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمانوں کے معاشرے بھی اس دنیا میں سزا و عذاب میں گرفتار ہوں گے؟

اس سوال کا جواب ہاں میں ہے کیونکہ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ امت دنیاوی عذاب سے مستثنیٰ ہے بلکہ یہ قانون تمام امتوں اور ملتوں کے بارے میں ہے اور جو ہم نے بعض آیاتِ قرآن (مثلاً انفال ۳۳) میں پڑھا ہے کہ خدا اس امت کو سزا نہیں دے گا وہ دو میں سے ایک شرط کے ساتھ مشروط ہے پہلی پیغمبر اکرم کا امت میں موجود ہونا اور دوسری استغفار اور گناہ سے توبہ کرنا۔ لہذا یہ فرمان غیر مشروط ہے۔

۳۔ نزولِ عذاب کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی:

مندرجہ بالا آیات دوبارہ اس حقیقت کو تاکید کرتی ہیں کہ نزولِ عذاب کے وقت توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور عذاب کے وقت کی پشیمانی بے فائدہ ہے۔ اس کی دلیل بھی واضح ہے اور وہ یہ کہ اس حالت میں توبہ اجباری اور اضطراری صورت میں ہوگی اور ایسی توبہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔

۱۔ جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ زیر نظر قضیہ شرطیہ پر مشتمل ہے جس کی شرط ذکر ہوئی ہے اور جزا مقدر ہے، اور ”ماذا يستعجل منه المجرمون“ ایک مستقل جملہ ہے۔ آیت کی تقدیر اسی طرح ہے: (أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيِّنَاتٍ أَوْ تَحَارًا كُنْتُمْ تَقْدِرُونَ عَلَىٰ دَفْعِهِ أَوْ تَعْدُونَهُ أَمْ لَا مَحَالَا فَإِذَا كَانَ الْأَمْرُ كَذَلِكَ مَاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمَجْرِمُونَ)۔ یعنی کیا تم سمجھتے ہو کہ اگر تم رات یا دن کے وقت عذاب آجائے تو تم اسے روکنے کی قدرت رکھتے ہو یا اسے امر محال سمجھتے ہو۔ جب معاملہ ایسا ہے تو پھر مجرمین آخر کس طرح اس کی تعجیل چاہتے ہیں۔

آیات ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶

۵۳- ﴿وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقُّ هُوَ قُلٌّ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ﴾-

۵۴- ﴿وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْأَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهِ وَأَسْرُوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾-

۵۵- ﴿أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْأَيُّ وَالْعَدَدُ اللَّهُ حَقٌّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾-

۵۶- ﴿هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾-

ترجمہ

۵۳- تجھ سے پوچھتے ہیں کیا وہ (خدائی سزا والا وعدہ) حق ہے؟ کہہ دو خدا کی قسم یقیناً حق ہے اور تم اس سے بچ نہیں سکتے۔

۵۴- اور جس نے ظلم کیا ہے اگر وہ تمام کچھ جو روئے پر ہے اس کے اختیار میں ہو تو وہ (سب کچھ عذاب کے خوف سے) اپنی نجات کے لئے دے گا اور جب عذاب کے دیکھے گا تو (پشیمان ہو گا لیکن) اپنی پشیمانی کو چھپائے گا (کہ کہیں زیادہ سوار نہ ہو) اور ان کے درمیان عدل سے فیصلہ ہو گا اور ان پر ظلم و ستم نہیں ہو گا۔

۵۵- آگاہ ہو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خدا کا ہے۔ آگاہ رہو کہ خدا کا وعدہ حق ہے۔

۵۶- وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جاو گے۔

خدائی سزا میں شک نہ کرو

گزشتہ آیات میں مجرمین کے لئے اس جہان میں اور آرت میں سزا اور عذاب کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر نظر آیات میں یہی بحث جاری ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: مجرمین اور مشرکین تجھ سے تعجب سے سوال کرتے ہیں کہ کیا اس جہان میں اور دوسرے جہان میں خدائی سزا والا وعدہ حق ہے

﴿وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقُّ هُوَ﴾-

یاد رہے کہ یہاں ”حق“ ”باطل“ کے مقابلے میں نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ کیا یہ سزا اور کیفر کردار واقعیت رکھتا ہے اور مستحق ہوگا؟ کیونکہ ”حق“ اور تحقیق ”دونوں ایک ہی مادہ سے ہیں البتہ اگر یہاں وہ ”حق“ مراد لیا جائے جو ”باطل“

کے مقابلے میں ہے تو پھر اس کا ایک وسیع معنی ہوگا اور یہ ہر موجود کی حقیقت پر محیط ہوگا اور اس نقطہ مقابل معدوم اور باطل ہوگا۔

خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ اس سوال کا جواب میں بڑی تاکید سے کہہ دو: مجھے اپنے پروردگار کی قسم! یہ حقیقت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے ﴿قُلْ اِي وَرَبِّي اِنَّهُ لَحَقُّ﴾۔

اور اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ تم خدائی سزا کی گرفت سے بھاگ سکتے ہوئے تو تم نے بہت بڑا اشتباہ کیا ہے کیونکہ ”تم ہر گز اس سے نہیں بچ سکتے اور نہ ہی اپنی طاقت سے تم اسے عاجز سکتے ہو۔ ﴿وَمَا اَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ﴾۔

در حقیقت یہ جملہ مندرجہ بالا جملے کے ساتھ مقتضی اور مانع کے بیان کے قبیل میں سے ہے۔ پہلے جملے میں فرمایا گیا ہے، کہ مجرمین کی سزا ایک حقیقت ہے اور دوسرے جملے میں مزید کہا گیا ہے کہ کوئی طاقت اس سے بچا نہیں سکتی۔ سورہ طور کی آیت ۷-۸، میں بالکل اسی طرح ہے۔ ﴿ان عذاب ربك لواقع ماله من دافع﴾۔

یقیناً تیرے رب کا عذاب واقع ہو کر رہے گا اور کوئی اس سے بچانے والا نہیں ہے زیر بحث آیت میں جو تاکیدیں دکھائی دیتی ہیں وہ قابل توجہ ہیں۔ ایک طرف قسم کھا کر بات کی گئی ہے دوسری ”ان“ اور لام تاکید ہے اور تیسری طرف ”وما انتم بمعجزین“ کا جملہ یہ سب اس امر پر تاکید ہیں کہ سنگین جرائم کے ارتکاب پر خدائی سزا حتمی ہے۔

بعد والی آیت میں اس سزا کے عظیم ہونے خصوصاً قیامت میں اس کے بڑے ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: عذاب الہی اس طرح سے وحشت ناک اور ہول انگیز ہے کہ ظالموں میں سے ہر ایک زمین کی تمام قمر ثروت کا مالک ہو تو وہ تیار ہوگا کہ سب کچھ دے تاکہ اس عذاب اور سزا سے رہائی پالے

﴿وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ﴾ - (۱)

در حقیقت وہ عذاب الہی سے بچنے کے لئے بڑی بڑی رشوت دینے کو تیار ہیں لیکن ان سے کچھ بھی قبول نہیں کیا جائے گا اور سوئی کی نوک کے برابر بھی ان کی سزائیں کمی نہیں کی جائے گی۔

خصوصاً ان میں سے بعض سزائیں تو معنوی پہلو رکھتی ہیں اور وہ یہ کہ وہ عذاب الہی کے مشاہدے پر پشیمان ہوتے ہیں لیکن دوسرے مجرموں یا اپنے پیروکاروں کے سامنے زیادہ رسوائی سے بچنے کے لئے اظہار ندامت نہیں کرتے ﴿وَأَسْرُوا

النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ﴾ -

اس کے بعد تاکید اُکھا گیا ہے کہ ان تمام چیزوں کے باوجود ان کے درمیان عمل سے فیصلہ ہوگا اور ان کے بارے میں ظلم نہیں ہوگا ﴿وَقَضَىٰ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾۔

یہ جملہ قرآنی روش کے مطابق تمام مقامات پر سزا میں عدالت کے سلسلے میں تاکید ہے کیونکہ گزشتہ آیت میں سزا کے بارے میں موجود تاکیدوں سے غافل لوگ یہ وہم کرتے کہ یہاں انتقام جوئی کا جذبہ کارفرما ہے لہذا قرآن پہلے کہتا ہے کہ ان کے درمیان عدل سے فیصلہ ہوگا اور پھر تاکید کے طور پر کہتا ہے کہ ان پر ظلم نہیں ہوگا۔

اس کے بعد اس بناء پر کہ کہیں لوگ اللہ کے اس وعدہ اور وعید کو مذاق نہ سمجھیں اور یہ خیال نہ کریں کہ خدا اسے انجام دینے سے قاصر ہے، قرآن مزید کہتا ہے: آگاہ رہو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خدا کا مال ہے اور اس کی مالکیت و حکومت تمام جہان ہستی پر محیط ہے اور کوئی اس کی سلطنت سرِ باہر نہیں جاسکتا ﴿أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾۔

نیز آگاہ رہو کہ مجرمین کی سزا کے بارے میں خدا کا وعدہ حق ہے اگرچہ بہت سے لوگ جن کے نفس پر جہالت نے اپنا منحوس سایہ ڈال دیا ہے اس حقیقت کو نہیں جانتے ﴿أَلَا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾۔

زیر نظر آخری آیت بھی اسی مسئلہ حیات کے بارے میں مزید تاکید ہے، ارشاد ہوتا ہے: خدا ہے کہ جو زندہ کرتا ہے اور وہی ہے جو مارتا ہے ﴿هُوَ يَخْيِي وَيُمِيتُ﴾۔ لہذا وہ بدنوں کو مارنے اور انھیں قیامت کے عدالت کے لئے زندہ کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔

اور اگر کا تم سب کے سب اس کی طرف پلٹ جاو گے ﴿وَالَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾۔ اور وہاں پھر اپنے اعمال کی جزا اور سزا پاو گے۔

دو اہم نکات

ایک سوال اور اس کا جواب:

زیر بحث آیات کے بارے میں ایک سوال کیا جاتا ہے کہ خدائی سزا کے واقعی ہونے کے بارے میں مشرکین کا سوال تمسخر تھا یا حقیقی سوال تھا بعض کہتے ہیں کہ حقیقی سوال شک کی نشانی ہے اور یہ مشرکین کی کیفیت نہ تھی۔

لیکن بہت سے مشرکین شک اور تردد کی حالت میں تھے اور ان میں ایک گروہ پیغمبر اکرم کی حقانیت کا علم رکھنے کے باوجود ہٹ دھرمی تعصب اور عناد وغیرہ کی وجہ سے مخالفت پر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس صورت حال کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی طرف سے حقیقی سوال کیا جانا کوئی بعید نہیں ہے۔

۲۔ ”ندامت“ کا مفہوم:

”ندامت“ کا مطلب ہے ایسے کام پر پشیمانی جس کے غیر مطلوب آثار واضح ہو چکے ہوں، چاہے انسان اس کا مداوا کر سکے یا نہ کر سکے۔ مجرین کی قیامت میں پشیمانی دوسری طرح کی ہے اور اسے پوشیدہ رکھنا اس بناء پر ہے کہ اسے واضح کرنا زیادہ رسوائی کو موجب ہے۔

۱۔ حقیقت مندرجہ بالا جملے میں یہ عبارت مقدر ہے: من حول القيامة و العذاب۔

آیات ۵۷، ۵۸

۵۷- ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾۔

۵۸- ﴿قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ﴾۔

ترجمہ

۵۷- اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے نصیحت اور موعظہ آیا ہے اور جو کچھ سنیوں میں ہے اس کے لئے باعث شفا ہے اور مومنین کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔
۵۸- کہہ دو کہ خدا کے فضل اور رحمت سے خوش رہو، کیونکہ جو کچھ انھوں نے جمع کر رکھا ہے وہ اس سے بہتر ہے۔

قرآن خدا کی عظیم رحمت ہے

بعض گزشتہ آیات میں قرآن کے بارے میں کچھ مباحث آئی ہیں اور ان میں مشرکین کی مخالفت کا کچھ ذکر آیا ہے۔ زیر بحث آیات میں بھی اسی مناسبت سے قرآن کے بارے میں گفتگو آئی ہے۔
پہلے ایک ہمہ گیر عالمی پیغام کے حوالے سے تمام انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اے لوگوں تمہارے لئے تمہارے پروردگار کی طرف سے وعظ و نصیحت آئی ہے ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ﴾۔ اور ایسا کلام کہ جو تمہارے دلوں کی شفاء کا سبب ہے ﴿وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ﴾۔ ایسی چیز کہ جو ہدایت اور راہنمائی کا باعث ہے ﴿وَهُدًى﴾ اور مومنین کے لئے رحمت ہے ﴿وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾۔

اس آیت میں قرآن کی چار صفات بیان ہوئی ہیں، انھیں سمجھنے کے لئے پہلے ان کے لغوی معانی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا ”وعظ“ (اور ”موعظہ“) جیسا کہ مفردات میں آیا ہے، ایسی نہیں کو کہتے ہیں جسمیں تہدید کی آمیزش ہو لیکن ظاہراً ”موعظہ“ کا معنی اس سے وسیع تر ہے جیسا کہ مشہور عرب دانشر خلیل کا قول مفردات ہی میں لکھا ہے کہ ”موعظہ“ نیکوں کا تذکر اور یاد دہانی ہے جس میں رقتِ قلب بھی موجود ہو۔

در حقیقت ہر قسم کی پسند و نصیحت جو مخاطب پر اثر کرے، اسے برائیوں سے ڈرائے یا اس کے دل کے نیکیوں کی طرف متوجہ کرے اسے ”وعظ“ اور ”موعظہ“ کہتے ہیں البتہ اس بات کا یہ مطلب نہیں کہ ہر موعظہ کا اثر ہونا چاہیے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ آمادہ دلوں پر اس طرح سے اثر کرے۔

دلوں کی بیماری سے شفاے کا باعث یا قرآن کی تعبیر میں اس سے شفاء کا سبب جو سینوں میں ہے اس سے مراد معنوی اور روحانی آلودگیوں سے شفاء ہے۔ مثلاً بخل، کینہ، حسد، بزدلی، شرک اور نفاق وغیرہ سے شفاء کہ جو سب کی سب روحانی بیماریاں ہیں۔

”ہدایت“ سے مراد ہے مقصود کی طرف راستہ مل جانا۔ یعنی انسان کا تکل، ارتقاء اور پیش رفت تمام مثبت پہلوؤں کے سلسلے میں۔

نیز ”رحمت“ سے مراد خدا کی بخشی ہوئی وہ مادی اور معنوی نعمتیں ہیں جو اہل انسانوں کو میسر آتی ہیں جیسا کہ مفردات میں ہے کہ ”رحمت“ کی جب خدا کی طرف نسبت دی جائے تو اس کا معنی نعمت بخشنا ہے اور جب انسانوں کی طرف اس کی نسبت ہو تو اس کا مطلب ہے رقت طلبی اور مہربانی۔

قرآن کے سائے میں انسان کی تربیت اور اس کے تامل و ارتقاء کو مندرجہ بالا آیات میں درحقیقت چار مراحل میں بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا مرحلہ طرح طرح کے اخلاقی رذائل سے روح پاک انسانی کو پاک کرنا ہے۔

تیسرا مرحلہ ہدایت کا ہے جو پاک سازی کے بعد انجام پاتا ہے اور

چوتھا مرحلہ وہ ہے کہ انسان اس لائق ہو جاتا ہے کہ پروردگار کی رحمت و نعمت اس کے شامل حال ہو۔

ان میں سے مرحلہ دوسرے کے بعد آتا ہے اور جاذبِ نظریہ ہے کہ یہ سب مراحل قرآن کے زیر سایہ انجام پاتے ہیں۔

قرآن ہے کہ جو انسانوں کو پسند و نصیحت کرتا ہے، قرآن ہے کہ جو گناہ کے زنگ اور مری صفت کو اس کے دل سے

دھوتا ہے۔ قرآن ہے کہ جو انسانوں کے دلوں میں نور ہدایت کی روشنی کرتا ہے، اور قرآن ہی ہے جو فراور معاشرے پر

خدائی نعمتوں کے نزول کا باعث ہے۔

نبی البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام نے اپنی جامع گفتگو میں نہایت خوبصورت انداز میں اس حقیقت کی وضاحت

فرمائی ہے، آپ ﷺ فرماتے ہیں:

فاستشفعوا من ادوائکم و استعینوا به علی لاوائکم فان فیہ شفاء من اکبر الداء وهو الکفر و النفاق و الغی و

ضلال۔

قرآن سے اپنی بیماریوں کی شفاء طلب کرو اور اپنی مشکلات کے حل کے لئے اس سے مدد طلب کرو کیونکہ قرآن میں سب بڑی بیماری یعنی کفر، نفاق گمراہی کی شفاء ہے۔ (نبج البلاغہ خطبہ ۱۷۶)۔

یہ چیز بتاتی ہے کہ قرآن ایک ایسا نسخہ ہے جو فرد اور معاشرے کی مختلف اخلاقی اور اجتماعی بیماریوں کے علاج کے لئے کارگر ہے اور یہ وہ حقیقت ہے، جس مسلمان بھلا چکے ہیں اور بجائے اس کے کہ وہ اس شفاء بخش دوا سے فائدہ اٹھائیں، اپنا علاج دوسرے مکاتب میں تلاش کرتے پھرتے ہیں اور انھوں نے اس عظیم آسمانی کتاب کو فقط پڑھنے کے لئے رکھ چھوڑا ہے اور یہ نہیں کہ وہ اس میں غور و فکر کریں اور اس پر عمل کریں۔

اگلی آیت میں بحث کی تکمیل کے لئے اور اس عظیم خدائی نعمت یعنی قرآن مجید کہ جو ہر نعمت سے برتر ہے کے بارے میں تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اے پیغمبر! کہہ دو کہ لوگ پروردگار کے فضل اور اس کی بے پایاں رحمت پر اور اس عظیم آسمانی کتاب کے نزول پر خوش و جائیں کہ جو تمام نعمتوں کی جامع ہے۔ نہ کہ دولت کے انباروں پر، بڑے مقام و منصب پر اور قوم و قبیلہ کی کثرت پر ﴿قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا﴾۔ کیونکہ یہ سرمایہ ان تمام چیزوں سے بہتر اور بالاتر ہے کہ جو انھوں نے جمع کر رکھی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی اس سے موازنہ کے قابل نہیں ہے ﴿هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ﴾۔

دو قابل توجہ نکات

۱۔ کیا دل احساسات کا مرکز ہے؟

زیر بحث پہلی آیت اور اس قسم کی بعض دیگر قرآنی آیات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اخلاقی بیماریوں کا مرکز دل ہے۔ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ابتداء میں یہ اعتراض پیدا ہوتا کہ ہم جانتے ہیں کہ تمام اخلاقی اوصاف اور فکری و جذباتی مسائل کا تعلق روح انسانی سے ہے اور دل تو صرف ایک خود کار پمپ کے طور پر خون کی نقل و انتقال اور بدن کے سالموں کی آبیاری اور انھیں غذا پہنچانے کا کام کرتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حق یہی ہے کہ دل صرف جسم انسانی کو منظم رکھنے پر مامور ہے اور نفسیاتی مسائل کا تعلق روح سے ہے لیکن ایک دقیق نکتہ موجود ہے کہ جس کی طرف توجہ کرنے سے قرآن کی اس تعبیر کا مقصد واضح ہو جائے گا اور وہ یہ کہ جسم انسانی میں مرکز موجود ہیں کہ جن میں سے ہر ایک انسان کے نفسانی اعمال کا مظہر ہے یعنی ان دو مرکز میں سے ہر ایک نفسانی فعل اور انفعال پر فوراً رد عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ان میں سے ایک دماغ پر ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں

دماغ روح کو فکری مسائل میں مدد دینے کے لئے ایک آلہ ہے۔ اسی لئے غور و فکر کرتے وقت خون دماغ میں تیزی سے حرکت کرتا ہے، دماغ کے لئے سالے (Molecules) زیادہ فعل و انفعال کرتے ہیں، زیادہ غذا جذب کرتے ہیں اور زیادہ لہریں بھیجتے ہیں۔ مگر جب معاملہ جذبات سے متعلق ہو، مثلاً عشق و محبت، عزم غصہ، کینہ، حسد اور درگزر وغیرہ تو انسان کے دل میں عجیب طرح کی فعالیت پیدا ہو جاتی ہے، بعض اوقات دل کی دھڑکن بڑی تیزی ہو جاتی ہے اور کبھی حرکت قلب اتنی کمزور پڑ جاتی ہے کہ گویا اب دل کام کرنا چھوڑ دے گا، گاہے ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا دل پھٹنے لگا ہے۔ یہ سب کچھ اس نزدیکی تعلق کی بناء پر ہے جو دل اور ان نفسیاتی معاملات کے مابین ہے۔

اسی بناء پر قرآن مجید ایمان کی نسبت دل کی طرف دیتا ہے۔ ﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ﴾

اور تمہارے دلوں میں ایمان ہرگز داخل نہ ہوگا۔ (حجرات ۱۴)

اسی طرح جہالت، ہٹ دھرمی اور حق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کو دل کے اندھے پن سے تعبیر کیا گیا ہے:

﴿وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾

اور لیکن وہ دل جو سینوں میں ہیں، اندھے ہیں۔ (حج ۴۶)

یہ بات کہے بغیر نہیں نہ رہ جائے کہ انسان ہمیشہ، کینہ یا حسد وغیرہ کے وقت ایک خاص اثر اپنے دل میں محسوس کرتا ہے یعنی ان نفسیاتی مسائل کے شعلے تپش جسم انسانی میں سب سے پہلے دل میں محسوس ہوتی ہے۔

البتہ ان تمام باتوں کے علاوہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ”قلب“ کے معانی میں سے ایک معنی انسانی عقل اور روح کے بھی ہے۔ لہذا اس کا معنی اسی عضو کے ساتھ مخصوص نہیں جو سینے کے اندر ہے اور یہ امر آیات قلب کے لئے خود ایک تفسیر ہے۔ لیکن تمام آیات قلب کے لئے نہیں بلکہ بعض آیات میں تصریح کی گئی ہے کہ وہ دل جو سینوں میں ہیں۔ (غور کیجئے گا)

۲۔ ”فضل“ اور ”رحمت“ میں کیا فرق ہے؟

زیر بحث دوسری آیت میں ”فضل“ اور ”رحمت“ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے۔

الف: بعض نے فضل الہی کو ظاہری نعمتوں کی طرف اور رحمت کو باطنی نعمتوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک نعمت مادی کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا لفظ نعمت معنوی کی طرف (اور بارہا قرآنی آیات میں ”وابتغوا من فضلہ“ یا ”لتبتغوا من فضلہ“ تحصیل روزی اور مادی نعمتوں کے لئے آیا ہے)۔

ب: کچھ مفسرین نے کہا ہے کہ فضل الہی نعمت کا آغاز ہے اور اس کی رحمت نعمت کا دوام ہے (البتہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے فضل نعمت بخشنے کے معنی میں ہے اور اس کے بعد رحمت کے ذکر میں کسی چیز کا اضافہ ہونا چاہئیے یہ تفسیر قابل فہم ہے)۔

یہ جو متعدد روایات میں ہے کہ فضل الہی سے مراد جو پیغمبر اور نعمت نبوت ہے اور رحمت پروردگار سے مراد وجودِ علی اور نعمت ولایت ہے، شاید اسی تفسیر کی طرف اشارہ ہو کیونکہ رسول اللہ سر آغاز اسلام ہیں، علی ؑ کی بقاء اور حیاتِ دوام کا سبب ہیں (ایک علت محدثہ اور ایجاد کنندہ ہیں اور دوسرے علت مبقیہ اور بقائے دینے والے ہیں)۔ ۱۔ ج: یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ”فضل“ پروردگار کی اس نعمت کی طرف اشارہ ہے جو دوست و دشمن کے لئے عام ہے اور گزشتہ آیت میں ”للمؤمنین“ کی طرف توجہ کرتے ہوئے ”رحمت“ اس کی مخصوص رحمت کی طرف اشارہ ہے جو باایمان افراد سے مختص ہے۔

د: ایک اور تفسیر جو ان دونوں الفاظ کے لئے ذکر ہوئی ہے یہ ہے کہ پروردگار کا فضل ایمان کی طرف اشارہ ہے اور رحمت قرآن کی طرف کہ جس کے بارے میں اس سے پہلے کی آیت میں گفتگو ہوئی ہے۔ ان میں سے زیادہ قر معانی آپس میں تضاد نہیں رکھتے اور ہو سکتا ہے یہ سب مفہیم فضل اور رحمت کے ایک جامع معنی میں جمع ہوں۔

۱۔ ان روایات سے آگاہی کے لئے تفسیر نور الثقلین ج ۲ ص ۳۰۷ اور ص ۳۰۸ کی طرف رجوع کریں۔

آیات ۵۹، ۶۰، ۶۱

۵۹۔ ﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَامًا وَحَلَالًا قُلْ اللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ﴾۔

۶۰۔ ﴿وَمَا ظَنُّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ﴾۔

۶۱۔ ﴿وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ وَمَا

يَعُزُّبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ﴾۔

ترجمہ

۵۹۔ کہہ دو: کیا وہ رزق کو خدائے نے تم پر نازل کیا ہے تم نے اسے دیکھا ہے کہ اس میں سے کچھ تم نے حلال قرار دے دیا ہے اور کچھ کو حرام۔ کہہ دو: کیا تمہیں خدا نے اجازت دی ہے یا خدا پر افتراء باندھتے ہو (اور اپنی طرف سے کسی کو حلال قرار دیتے ہو اور کسی کو حرام)۔

۶۰۔ جو خدا پر افتراء باندھتے ہیں وہ روز قیامت (کی سزا) کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ خدا سب لوگوں کے لئے فضل (اور بخشش) کرنے والا ہے لیکن ان میں سے اکثر شکر گزاری نہیں کرتے۔

۶۱۔ تم کسی حالت (اور فکر) میں نہیں ہوتے، نہ قرآن کے کسی حصے کی تلاوت کرتے ہو اور نہ ہی تم کوئی عمل انجام دیتے ہو مگر یہ کہ جب تم ان میں وارد ہوتے ہو ہم تم پر نگران ہوتے ہیں اور زمین و آسمان میں کوئی چیز تیرے پروردگار سے مخفی نہیں رہتی ذرہ برابر اور نہ اس سے کم و بیش۔ مگر یہ کہ وہ سب کچھ واضح کتاب (اور علم خدا کی لوح محفوظ) میں ثبت ہے۔

خدا ہر جگہ ناظر ہے

گزشتہ آیات میں اور قرآن میں خدا کے وعظ و نصیحت اور ہدایت و رحمت کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیات میں اسی مناسبت سے مشرکین کے گھڑے ہوئے قوانین اور جھوٹے احکام کے بارے میں بات کی گئی ہے کیونکہ جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ تمام نعمات اور رزق اس کی طرف سے ہے اسے چاہیے کہ وہ یہ حقیقت بھی قبول کرے کہ ان نعمات کے بارے میں حکم دینا اور ان کے بارے میں حلال و حرام کا تعین خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس کے اذن اور حکم کے بغیر اس کام میں دخل اندازی صحیح نہیں ہے۔

زیر نظر پہلی آیت میں روئے سخن پیغمبر اکرم کی طرف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان سے کہہ دو کہ خدا نے جو رزق تمہارے لئے نازل کیا ہے اس میں سے کیوں کچھ کو حرام قرار دیتے ہو اور کچھ کو حلال ﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَامًا وَحَلَالًا﴾۔ اپنی بے ہودہ رسوم کے مطابق کچھ چوپایوں کو سانبہ، کچھ کو بحیرہ اور کچھ کو وصیلہ^(۱) کہتے ہو اسی طرح تم نے اپنی کھیتی باڑی کے بعض محصولات کو حرام قرار دے رکھا ہے اور ان کو ان پاک نعمتوں سے محروم رکھا ہے علاوہ ازیں یہ امر تم سے مربوط نہیں ہے کہ کس چیز کو حلال ہونا چاہیے اور کس چیز کو حرام۔ یہ امر تو صرف ان کے پروردگار اور خالق کے اختیار میں ہے۔

کہہ دو: کیا خدا نے تمہیں اجاز دی ہے کہ ایسے قوانین وضع کرو یا خدا پر افتراء باندھتے ہو ﴿قُلْ اللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ﴾۔ یعنی اس کام کی دوہی صورتیں ہو سکتی ہیں کوئی تیسری نہیں یا تو ایسا پروردگار کی اجازت سے ہو اور یا پھر یہ تہمت اور افتراء ہے اور چونکہ پہلی بات نہیں ہے لہذا تہمت اور افتراء کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔

اب جبکہ یہ مسلم ہو گیا ہے کہ وہ اپنے ان خود ساختہ اور بے ہودہ احکام کے ذریعے نعمات الہی سے محروم ہوئے ہیں اور پروردگار کی ذات مقدس پر افتراء باندھا ہے لہذا مزید فرمایا گیا ہے جو خدا پر جھوٹ ناھتے ہیں وہ روز قیامت کی سزا کے بارے میں کیا سوچتے ہیں کیا انھوں اس دردناک سزا سے نجات کا کوئی بندوبست کیا ہے ﴿وَمَا ظَنُّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾۔ لیکن ”لوگوں پر خدا فضل اور رحمت وسیع ہے“ لہذا وہ انھیں ایسے برے اعمال پر سزا نہیں دیتا ﴿إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ﴾۔ مگر وہ لوگ بجائے اس کے کہ اس خدائی مہلت سے فائدہ اٹھائیں، عبرت حاصل کریں اس کا شکر بجالائیں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں۔

”ان میں سے اکثر غافل ہیں“ اور وہ اس عظیم نعمت کا شکر بجا لاتے ﴿وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ﴾۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ ان تمام نعمات اور رزق کا حلال ہونا (سوائے چند نقصان دہ اور ناپاک مستثنیٰ چیزوں کے) خود خدا کی ایک عظیم نعمت ہے اور بہت سے لوگ اس عظیم نعمت کی شکر گزاری کی بجائے نا شکری کرتے ہیں اور بے ہودہ احکام اور چیزوں کو بلا دلیل ممنوع قرار دے کر اپنے آپ کو ان سے محروم رکھتے ہیں۔

اس بناء پر کہیں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ خدا کی یہ مہلت اس لئے ہے کہ وہ ان کے کرتوتوں کو نہیں جانتا، زیر بحث آگرمی آیت میں یہ حقیقت نہایت عمدہ عبارت سے بیان کی گئی ہے کہ وہ آسمان وزمین کی وسعت میں تمام ذرات موجودات اور ر بندوں کے اعمال کی جزئیات سے باخبر ہے، ارشاد ہوتا ہے: تو کسی حالت اور کسی اہم کام میں نہیں ہوتا اور تو کسی

آیت کی تلاوت نہیں کرتا، اور وہ کوئی عمل انجام نہیں دیتے مگر یہ کہ ہم اس پر شاہد اور ناظر ہوتے ہیں جب بھی وہ کام کرنے لگتے ہو ﴿وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ﴾
 - (۳)

”شہود“ ”شاہد“ کی جمع ہے یہ اصل میں حضور اور موجودگی کے معنی میں ہے۔ جس میں آنکھ یا قلب و فکر کا مشاہدہ شامل ہو۔

جمع کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ نہ صرف خدا بلکہ فرشتے جو اس کے فرمانبردار ہیں اور انسانوں کے اعمال کے نگران ہیں ان کے سب کاموں سے باخبر ہیں اور ان کے شاہد و ناظر ہیں۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ خدا کے بارے میں جمع کا صیغہ جب کہ اس کی ذات پ اک ہر لحاظ سے یکتا و بیگانہ ہے، اس کے مقام کی عظمت کی طرف اشارہ ہے اور ہمیشہ اسکے مامور اس کے فرمان کے تابع ہیں اور اس کے امر کی طاعت کے لئے تیار ہیں۔

اور درحقیقت گفتگو صرف اس کے بارے میں نہیں بلکہ اس کے تمام مطیع مامورین کے بارے میں بھی ہے۔
 اس کے بعد خدا کی تمام چیزوں سے آگاہی کے مسئلے پر زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: زمین اور آسمان میں چھوٹی سے چھوٹی چیز یہاں تک کہ کوئی ذرہ بے مقدار بھی تیرے پروردگار کے علم کی نظر سے مخفی نہیں رہتا نہ اس سے کوئی چھوٹی چیز ہے اور نہ اس سے بڑی۔، مگر یہ کہ سب کی سب لوح محفوظ اور علم خدا کی واضح کتاب میں ثبت ہے ﴿وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ﴾۔

”یعذب“ اور ”عذوب“ کے مادہ سے دراصل گھر اور گھر والوں سے چوپایوں کے لئے چراگاہ تلاش کرنے کے لئے جدائی کے معنی میں ہے بعد ازاں یہ لفظ مطلقاً غیبت اور جدائی کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

”ذرة“ نہایت چھوٹے سے جسم کے معنی میں ہے۔ اسی لئے چوہٹی چھوٹی چوٹیوں کو بھی ”ذره“ کہا جاتا ہے۔
 مزید وضاحت کے لئے جلد سوم ص ۲۸۹ کی طرف مراجعت کیجئے۔

”کتاب مبین“ پروردگار کے وسیع علم کی طرف اشارہ ہے کہ جسے بعض اوقات ”لوح محفوظ“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
 (اس بارے میں جلد پنجم ص ۱۸۵، اردو ترجمہ پر بھی بات کی گئی ہے)۔

چند اہم نکات

۱۔ قانون بنانے کا حق صرف خدا کو ہے:

مندرجہ بالا آیات کی مختصر سی عبارتوں کے ذریعہ یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ قانون بنانے کا حق خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور جو شخص اس کے فرمان اور اجازت کے بغیر ایسا کرے تو وہ خدا پر تہمت اور افتراء کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ رزق اور تمام عالم ہستی کی نعمات اس کی جانب سے نازل ہوتی ہیں اور درحقیقت ان سب کا حقیقی مالک وہی ہے۔ اسی لئے اسی کو حق پہنچتا ہے کہ کسی کو جائز یا ناجائز قرار دے۔ البتہ اس سلسلے میں اس کے احکام خود بندوں کے مفاد میں ہیں اور انہی کے تکامل و ارتقاء کے لئے ہیں اور اسے ان کی ذرہ بھر بھی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن بہر حال صاحب اختیار اور قانون گزار وہی ہے مگر یہ کہ جتنا مناسب سمجھے کسی پیغمبر کو یا کسی حد تک کوئی اجازت دے دے۔

جیسا کہ بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام بعض امور کو واجب یا حرام قرار دیتے تھے کہ جنہیں روایات کی زبان میں ”فرض النبی“ کہا جاتا ہے البتہ یہ سب کے سب خدا کے حکم کے تابع ہیں اور ایسے اختیارات ہیں جو پیغمبر اکرم کو ودیعت کئے گئے ہیں۔

”اللہ اذہب لکم“ اس پر دلیل ہے کہ خدا اس قسم کی اجازت کسی کو دے۔

یہ مسئلہ ”ولایت تشریعی“ کی بحث سے مربوط ہے جو انشاء اللہ تعالیٰ کسی دوسرے مقام پر ہم تشریح کے ساتھ بیان کریں گے۔

۲۔ رزق کا نزول:

مندرجہ بالا آیات میں ارزاق کے لئے نزول کی تعبیر استعمال ہوئی ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ صرف بارش کا پانی آسمانی سے اترتا ہے۔ یہ یا تو اس بناء پر ہے کہ بارش کے یہ حیات بخش قطرے تمام قر رزق کی اصل بنیاد ہیں اور یا اس بناء پر ہے کہ مراد نزول مقامی ہے کہ جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہ تعبیر روزمرہ کی گفتگو میں نظر آتی ہے کہ اگر ایک بزرگ شخص کی طرف سے کوئی حکم یا احسان کسی چھوٹے شخص کے لئے ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ ”اوپر“ سے معین کیا گیا ہے یا اوپر سے ہمیں ملا ہے۔

۳۔ علماء علم اصول کا ایک استدلال:

علماء اصول نے ”اللہ اذن لکم ام علی اللہ تفترون“ سے ”اصل عدم حجیت ظن“ کو ثابت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ احکام الہی میں سے کوئی یقین کے بغیر ثابت نہیں کیا جاسکتا ورنہ خدا پر افتراء ہوگا کہ جو حرام ہے۔

البتہ اس استدلال پر ہمارے کچھ اعتراضات ہیں کہ جو ہم نے علم اصول کے مباحث میں ذکر کئے ہیں۔

۴۔ ایک درس:

مندرجہ بالا آیات میں سے ہمیں ایک اور درس بھی ملتا ہے اور وہ یہ ہے کہ قانون خدا کے مقابلے میں قانون بنانا جاہلیت کا طریقہ ہے۔

ایسے لوگ اپنے آپ کو حق دار سمجھتے تھے کہ اپنے نارسا اور ناپختہ افکار سے احکام قراش لیں۔ ایک حقیقی خدا پرست ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو ایمان ب خدا کا دم بھرتے ہیں اس کے باوجود دوسروں کے غیر اسلامی قوانین کی طرف دست سوال دراز کرتے ہیں یا جو قوانین اسلام کو ناقابل عمل قرار دے کر خود قانون وضع کرتے ہیں وہ بھی جاہلیت کے طریقوں کے پیروکار ہیں۔

حقیقی اسلام قابل تقسیم اور تجزیہ پذیر نہیں ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں تو اس کے قوانین کو قبول کرنا چاہیے اور یہ جو بعض کہتے ہیں کہ اس کے سب قوانین قابل اجراء ہیں، ان کی سوچ بے بنیاد اور یہ خیال ایک قسم کی مگر بزدلی اور خود نمائی پر مبنی ہے۔

البتہ اسلام اپنی جامعیت کے لحاظ سے بعض مسائل میں اصول بیان کر کے ہمارے ہاتھ کھلے رکھتا ہے تاکہ ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق شوری کے اصولوں کی روشنی میں ہم تنظیم کریں اور انھیں جاری کریں۔

۵۔ علم الہی کے تین پہلو:

محل بحث آخری آیت میں علم پروردگار کی وسعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تین نکاتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ تو کسی کام اور حالت میں نہیں ہے اور کوئی آیت تلاوت نہیں کرتا اور تم لوگ کوئی عمل انجام نہیں دیتے ہو مگر یہ کہ ہم تم پر شاہد اور ناظر ہیں۔

یہ تین تعبیریں اصل میں انسانوں کے افکار، گفتار اور کردار کی طرف اشارہ ہیں، یعنی جس طرح خدا ہمارے اعمال دیکھتا ہے،۔ ہماری باتوں کو بھی سنتا ہے اور ہمارے افکار اور نیتوں سے بھی آگاہ ہے اور ان میں سے کوئی چیز بھی علم پروردگار کے دائرے سے خارج نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ نیت اور روح کی کیفیت کا مرحلہ پہلے آتا ہے، گفتگو اس کے بعد ہوتی ہے اور کردار کا مرحلہ آخر میں آتا ہے۔ اسی لئے آیت میں بی اسی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے اور دوسرے مرحلے کا ذکر مفرد کی شکل میں پیغمبر سے خطاب کی صورت میں ہے اور تیسرے مرحلے کا ذکر جمع کی صورت میں ہے اور تمام مسلمانوں سے خطاب ہے، جیسا کہ خدا کی طرف سے آیات قرآن لے کر انھیں لوگوں کے سامنے تلاوت کرنا بی آنحضرت سے مربوط ہے۔ لیکن ان پروگراموں پر عمل کرنا ساری ملت سے مربوط ہے اور کوئی شخص اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

۶۔ ہماری ہر کیفیت کی نگرانی ہو رہی ہے:

زیر نظر آخری آیت میں تمام مسلمانوں کے لئے ایک عظیم درس موجود ہے کہ جو انھیں راہ حق پر ڈال سکتا ہے اور انحرافات سے روک سکتا ہے یہ ایک ایسا درس ہے کہ جس کی طرف توجہ کرنے سے صالح اور پاکیزہ معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیں یہ حقیقت نظر میں رکھنا چاہیے کہ ہم جو بھی قدم اٹھاتے ہیں، جو بھی بات کرتے ہیں، جو کچھ بھی سوچتے ہیں، جس طرف بھی دیکھتے ہیں اور ہم جس حالت اور کیفیت میں بھی ہوتے ہیں نہ صرف خدا کی پاک ذات بلکہ اس کے فرشتے بھی ہمارے نگران ہوتے ہیں اور پوری توجہ سے ہمیں دیکھتے ہیں۔ زمین و آسمان کے طول و عرض میں چھوٹی سے چھوٹی حرکت بھی خدا کی نگاہ سے پنہاں نہیں ہو سکتی، نہ صرف پنہاں نہیں ہوتی بلکہ لوح محفوظ میں بھی ثبت ہوتی ہے اور اس میں تبدیلی، اشتباہ یا غلطی نہیں ہو سکتی۔ نہ خدا کے علم بے پایاں کے صفحہ میں نہ مقرب فرشتوں اور بندوں کے اعمال لکھنے والوں کی سوچ میں اور نہ ہماری ڈائری اور ہمارے نامہ اعمال میں کہیں بھی تبدیلی، اشتباہ یا غلطی نہیں ہو سکتی۔

بلاوجہ نہیں ہے کہ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: کان رسول اللہ اذا قرء هذه الآية بکی بکاء شدیداً۔

جب رسول اللہ اس آیت کی تلاوت کرتے تھے تو شدت سے گریہ کرتے تھے۔ (مجمع البیان جلد ۵ ص ۱۱۶، مذکورہ آیت کے ذیل میں) جب رسول اللہ اپنے خلوص و بندگی، خدمت خلق اور عبادتِ خالق کے باوجود علم خدا کے سامنے ترساں ہو تو ہماری اور دوسروں کی حالت واضح ہے۔

۱۔ ”بحیرہ“ اس جانور کو کہتے ہیں جس نے کئی مرتبہ بچہ جتنا ہو۔ ”سائبہ“ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس نے دس یا بارہ بچے دیئے ہوں اور ”وصیلہ“ اس گوسفند کو کہتے ہیں جس نے سات بچے دیئے ہوں (مزید وضاحت کے لئے جلد پنجم ص ۹۷ کی طرف رجوع کریں)۔

۲۔ بعض مفسرین ضمیر ”منہ“ کو خدا کی طرف پلٹاتے ہیں یعنی جو آیات تو خدا کی طرف سے پڑھتا ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ ضمیر لفظ شان یا قرآن کی طرف لوٹتی ہے جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے یعنی وہ آیات جن کی کسی اہم کام کے بارے میں تو تلاوت کرتا ہے یا قرآن کی جو آیات تو تلاوت کرتا ہے۔

آیات ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵

۶۲۔ ﴿الْأَيْنَ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾۔

۶۳۔ ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ﴾۔

۶۴۔ ﴿هُمْ الْبَشَرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾۔

۶۵۔ ﴿وَلَا يَحْزَنُكَ قَوْلُهُمْ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾۔

ترجمہ

۶۲۔ آگاہ رہو کہ خدا کے اولیاء (اور دوست) نہ ڈرتے ہیں اور نہ غمگین ہوتے ہیں۔

۶۳۔ وہی کہ جو ایمان لائے اور جنہوں نے (حکم خدا کی مخالفت سے) پرہیز کیا۔

۶۴۔ وہ دنیاوی زندگی اور آخرت میں خوش (اور مسرور) ہیں۔ خدا کے وعدوں کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی اور

عظیم کامیابی ہے۔

۶۵۔ ان کی گفتگو تجھے غمگین نہ کرے۔ تمام عزت و قدرت خدا کے لئے ہے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

روحانی سکون ایمان کے زیر سائی ہے

گزشتہ آیات میں مشرکین اور بے ایمان افراد کے حالات کا کچھ حصہ پیش کیا گیا تھا۔ ان آیات میں ان کے مد مقابل مخلص، مجاہد اور پرہیزگار مومنین کی کیفیت بیان ہوئی ہے تاکہ موازنہ ہو سکے۔ جیسا کہ قرآن کی روش ہے کہ وہ نور کو ظلمت سے اور سعادت کو بد بختی سے میز کرتا ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: آگاہ رہو کہ اولیاء خدا پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ انھیں کوئی حزن و غم ہے ﴿الْأَيْنَ أَوْلِيَاءَ

اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾۔

اس بات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اولیاء کا معنی خوب معلوم ہونا چاہیے ”اولیاء“ ”ولی“ کی جمع ہے یہ اصل میں ”ولی ملی“ کے مادہ سے لیا گیا ہے جو دو چیزوں کے نزدیک واسطہ نہ ہونے اور ان کے ایک دوسرے کے نزدیک پڑے در پڑے ہونے کے معنی میں ہیں لہذا ہر اس چیز کو جو دوسری سے مکان، زمان، نسب یا مقام کے لحاظ سے قرابت رکھتی ہے ”کہا جاتا ہے۔ اس لفظ کا ”سرپرست“ اور ”دوست“ وغیرہ کے لئے استعمال بھی اسی بناء پر ہے اس لئے اولیاء وہ ہیں جن کے اور خدا کے درمیان کوئی فاصلہ نہ ہو۔ اولیاء خدا معرفت اور ایمان کے نور سے اور اپنے پاک عمل کی بناء

پر خدا کو دل کی آنکھ سے اس طرح دیکھتے ہیں کہ ان کے دل میں کسی قسم کا کوئی شک اور تردید پیدا نہیں ہوتا اور خدا کہ جو بے انتہا ہے جس کی قدرت بے پایاں ہے اور جو کمال مطلق ہے، سے اسی آشنائی کے سبب جو کچھ خدا کے علاوہ ہے، ان کی نگاہ میں حقیر، بے وقعت، ناپائیدار اور بے مقدار ہے۔ جو شخص سمندر سے آشنا ہے قطرہ اس کی نگاہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتی اور جو آفتاب کو دیکھتا ہے وہ ایک سمع بے فورج سے بے اعتناء ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ انہیں کیوں خوف و اندوہ نہیں ہے کیونکہ خوف عام طور پر میسر نعمتوں کے فقدان کے احتمال پر ہوتا ہے یا ان خطرات سے ہو سکتا ہے جبکہ خدا کے اولیاء اور سچے دوست مادی دنیا کی ہر قسم کی وابستگی اور عقد سے آزاد ہیں اور ”زہد“ اپنے حقیقی مفہوم میں ان کے وجود پر حکومت کرتا ہے وہ نہ مادی وسائل کے چھن جانے پر واویلا کرتے ہیں اور نہ آئندہ کے لئے ایسے مسائل کا احتمال ان کے اذہان کو اپنی طرف مشغول رکھتا ہے: ان کے وجود میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

کسی چھوٹے سے برتن کا پانی انسان کی ایک پھونک ہی سے متلاطم ہو جاتا ہے لیکن ایک وسیع سمندر کے لئے طوفان بھی کم اثر ہوتے ہیں۔ اسی لئے سمندر کو سکون کہا جاتا ہے۔ ﴿لَکِی لَا تَأْسُوا عَلٰی مَافَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاکُمْ﴾۔ تاکہ نہ افسوس کرو تم اس چیز کا جو تم سے چھن جائے اور نہ خوش ہو تم اس چیز سے جو تم کو دی جائے۔ (حدید-۲۳) نہ وہ دن کہ جب دنیا ان کے پاس تھی انہوں نے اس سے دل لگایا اور نہ آج جبکہ اس سے جدا ہو رہے ہیں انہیں اس کا غم ہے۔ ان کی روح بزرگ تر ہے اور ان کی روح سے بالما تر ہے کہ ایسے حوادث ان کے گزشتہ اور آئندہ پر اثر انداز ہوں گے۔

اس طرح سے حقیقی امن و سکون ان کے وجود پر حکم فرما ہے۔ قرآن کے مطابق: ﴿وَلَفْکَ لَہُمُ الْاَمْنُ﴾

انہیں لوگوں کے لئے امن اور سلامتی ہے۔ (انعام - ۸۲)۔

یا دوسرے لفظوں میں: ﴿اَلَا بِذَکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾۔

خدا کی یاد ان کے دلوں کے سکون کا باعث ہے۔ (رعد - ۲۸)

خلاصہ یہ کہ عموماً غم اور خوف انسانوں میں دنیا پرستی کی روح کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جو لوگ اسی روح سے تہی داماں ہیں اگر انہیں کوئی غم اور خوف نہ ہو تو یہ بہت فطری اور طبعی بات ہے یہ اس مسئلہ کا استدلالی بیان ہے۔ کبھی اس مسئلے کو عرفانی صورت میں یوں بیان کیا جاتا ہے:

اولیاء اللہ اس طرح صفات جلال و جمال میں مستغرق ہیں اور کی ذات پاک کے مشاہدہ میں محو ہوتے ہیں اور اس کے غیر کو بھول جاتے ہیں کہ کسی چیز کے لئے کھو جانے کے غم میں اور کسی خطرناک دشمن کے خوف کی ان کے دل میں کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ جس کے دل میں خدا کے سوا کسی کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو اور جو اس کے غیر کی فکر نہ کرے اور اس کی روح اس کے علاوہ کسی کو قبول نہ کرے تو کیسے ممکن ہے کہ وہ کسی غم و اندوہ یا خوف و وحشت سے دو چار ہو۔

جو کچھ ہم نے کہ ہے اس سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ اس سے مراد مادی نجات و غم اور دنیاوی خوف و ہراس ہے۔ ورنہ اللہ کے دوستوں کا وجود اس کے خوف سے مالا مال ہوتا ہے۔ فرائض اور ذمہ داریوں کے انجام نہ دینے کا خوف اور ان مواقع کا دکھ کہ جو ان سے جائع ہو گئے۔ یہ حزن و ملال روحانی پہلو اور وجود انسان کے تکامل اور ترقی کا باعث ہے جبکہ اس کے برعکس مادی خوف اور غم انحطاط اور تنزل کا سبب ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اپنے مشہور خطبہ ہمام میں اولیاء اللہ کے حالات کی نہایت خوبصورت تصویر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿قلوبهم مخزونة و شرورهم مامونة﴾۔

ان کے دل مخزون و غمزہ ہیں اور لوگ ان کے شر سے امان میں ہیں۔

آپ ﷺ مزید فرماتے ہیں: ﴿ولو لا الاجل الذی کتب اللہ علیہم لم تستقر ارواحہم فی اجسادہم طرفۃ عین شوقاً الی الثواب وخوفاً من العقاب﴾۔

اگر وہ اجل جو خدا نے ان کے لئے مقرر کی ہے نہ ہوتی تو ثواب الہی کے شوق میں اور عذاب الہی کے خوف سے ان کے جسموں میں ان کی روح چشم زدن کی دیر بھی ٹھہرتی۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۳) (صبحی صالح)،۔

قرآن مجید بھی مومنین کے بارے میں کہتا ہے: ﴿الذین یخشون ربہم بالغیب وہم من الساعۃ مشفقون﴾۔

وہ لوگ جو پروردگار سے اس کے غضب کو نہ دیکھنے کے باوجود ڈرتے ہیں۔ (انبیاء - ۴۹)

اس بناء پر ان کا خوف و ہراس دوسری قسم کا ہے۔^(۱)

۱ اس وقت جب کہ ہم یہ آیات لکھ رہے ہیں اللہ کے ایک سچے ولی کی شہادت کی خبر پہنچی ہے یعنی فلسفی، عالم، مجاہد عظیم آقائے مرتضیٰ مطہری کی خبر شہادت۔ اس شہادت نے ہمارے لئے یہ حقیقت ایک مرتبہ ثابت کر دی ہے کہ عظیم اسلامی انقلاب کی حفاظت کے لئے جسے ہم نے دورِ حاضر میں اس ملک میں شروع کر رکھا ہے اور جس میں قوم کے تمام طبقے شریک ہیں، ابھی ہمیں بہت سا خون اور بہت سی قربانیاں دینی ہوں گی۔ لیکن اب کے دشمنوں نے ہم سے ایک ایسے جوان مرد کو چھینا ہے جس کی ساری عمر علم و دانش کی خدمت میں صرف ہوئی تھی اور اسکے گراں بہا آثارِ علمی اس دعویٰ پر شاہدِ ناطق ہیں۔ وہ مخلص مجاہد اور آزاد مومن تھے۔ وہ بھی انہی افراد میں سے تھے کہ جن کے

بارے میں قرآن کہتا ہے کہ :- ”نہ انھیں خوف ہے اور نہ غم و حزن“ کیونکہ اس شہید نے اپنے پیغام اور ذمہ داری کو عمدہ طریقے سے انجام دیا اور اپنے پیغام اور ذمہ داری کی راہ میں شہید ہو گیا۔ (۱۲ اردی بہشت ۱۳۵۸ ہجری شمسی)

یہ کہ اولیاء خدا سے مراد کون سے افراد ہیں، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے لیکن دوسری آیت اس مطلب کو واضح کرتی ہے اور بحث کردیتی ہے ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ہمیشہ تقویٰ اور پرہیزگاری کو اختیار کئے رکھا ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ﴾۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ ایمان کا ذکر ماضی مطلق کی صورت میں ہے اور تقویٰ کا ذکر ماضی استمراری کی شکل میں ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا ایمان حد کامل کو پہنچ گیا ہے لیکن تقویٰ جو کہ روزمرہ کے عمل میں منعکس ہوتا ہے، ہر گھڑی نئے کام کا مطالبہ کرتا ہے اور تدریجی پہلو رکھتا ہے یہ ان کے لئے ایک دائمی ذمہ داری کی صورت میں ہے۔

جی ہاں یہ وہ لوگ ہیں جو دین اور شخصیت کے ان دو بنیادی ارکان کے حامل ہیں اور اس کی وجہ سے اپنے اندر ایک ایسا سکون محسوس کرتے ہیں کہ جسے زندگی کا کوئی طوفان مضطرب نہیں کر سکتا بلکہ: المؤمن الحبل الراسخ لا تحركه العواصف۔

مومن مضبوط پہاڑ کی طرح ہے جسے تیز آندھیاں ہلا نہیں سکتیں۔

یعنی وہ پہاڑ کی طرح حوادث کی تند ہوا کے سامنے استقامت اور پامردی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

تیسری آیت میں اولیاء حق کے وجود میں خوف و غم اور وحشت و اضطراب کے نہ ہونے کی تاکید یوں کی گئی ہے: ان کے لئے دنیاوی زندگی میں اور آخرت میں بشارت، خوشحالی اور سرور نصیب ہوگا (توجہ رہے کہ البشریٰ میں الف لام جنس کے حوالے سے مطلق ذکر ہوا ہے اور اس میں طرح طرح کی بشارتوں کا مفہوم موجود ہے)۔

دوبارہ تاکید کے لئے فرمایا گیا ہے: پروردگار کی باتوں اور خدائی وعدوں میں تغیر نہیں ہوتا اور خدا اپنے دوستوں کے بارے میں اپنا وعدہ پورا کرے گا (لا تبدل کلمات اللہ)، اور یہ جسے نصیب ہوا اس کے لئے عظیم کامیابی اور سعادت ہے ﴿ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾۔

آخری آیت میں روئے سخن پیغمبر اکرم کی طرف ہے جو اولیاء اللہ اور دوستان خدا کے سردار ہیں۔ ان کی دلجوئی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: غافل اور جاہل مخالفین اور مشرکین کی غیر موزوں باتیں تجھے غمگین نہ کریں ﴿وَلَا يَحْزَنكَ قَوْلُهُمْ جَمِيعًا﴾۔ کیونکہ تمام عزت و قدرت خدا کے لئے ہے اور خدا کے ارادہ حق کے سامنے دشمن کچھ نہیں کر سکتے ﴿إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ

﴿ - خدا ان کی سب سازشوں سے باخبر ہے - ان کی باتوں کو سنتا ہے اور ان کے اندرونی اسرار و رموز سے آگاہ ہے ﴾ ھُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ -

دواہم نکات

۱۔ ”بشارت سے کیا مراد ہے؟

مندرجہ بالا آیات میں خدا نے اپنے دوستوں کے لئے دنیا و آخرت میں جس بشارت کا تذکرہ ہے اس سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں تمام مفسرین کے درمیان اختلاف ہے -

بعض نے اس آیت کو اس بشارت کے ساتھ مخصوص سمجھا ہے جو فرشتے مومنین کو موت اور اس جہان سے انتقال کے وقت دیتے ہیں اور کہتے ہیں: ﴿و ابشروا بالجنة التي كنتم توعدون﴾ -

خوشخبری ہو تمہیں اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے - (حکم سجدہ - ۳۰)

بعض دوسرے اسے ان کے مومن اور صالح ہونے تک کے لئے دشمنوں پر غلبہ اور روئے زمین پر حکومت کرنے کے وعدہ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں -

لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ لفظ مطلق ہے اور ”البشری“ پر الف لام جنس کے حوالے سے ہے اس طرف توجہ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک وسیع مفہوم پنہاں ہے، جس میں ہر قسم کی بشارت، کامیابی اور موفقیت شامل ہے اور جن امور کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ سب اس میں شامل ہیں اور درحقیقت ان میں سے ہر ایک خدا کی اس وسیع بشارت کے ایک گوشے کی طرف اشارہ ہے اور شاید یہ جو بعض روایات میں عمدہ خوابوں اور رویائے صالحہ سے اس کی تفسیر کی گئی ہے، اس طرف اشارہ ہے کہ ہر قسم کی بشارت یہاں تک کہ چھوٹی بشارتیں بھی ”البشری“ کے مفہوم میں موجود ہیں اور یہ نہیں کہ اس کا مفہوم ان میں منحصر ہے -

درحقیقت جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ایمان اور تقویٰ کا یہ تلوینی اور طبعی اثر ہے کہ جو انسان کی روح اور جسم کو ہر قسم کے خوف و دہشت سے دور کر دیتا ہے کہ جو شک اور تردد سے اور اسی طرح گناہ اور مختلف آلودگیوں سے پیدا ہوتا ہے کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے اندر ایمان اور معنویت نہ رکھتا ہو پھر بھی سکون محسوس کرے - ایک شخص ایک بے لنگر کشتی کی طرح ہے جو طوفان میں پھنس گئی ہو کہ جسے کوہ پیکر موجیں ہر لمحہ الٹ دینا چاہتی ہوں اور گرداب اسے نگلنے کے لئے منہ کھولے ہوئے ہوں -

کسی طرح سے ممکن ہے کہ وہ شخص جس نے لوگوں پر ظلم و ستم کیا ہو، انسانوں کا خون بہایا ہو اور دوسروں کے اموال و حقوق غصب کئے ہوں، چین سے بیٹھا ہو۔ مومنین کے برعکس اسے سکون کی نیند نہیں آسکتی۔ وہ زیادہ تر ڈراؤ نے خواب دیکھتا رہے گا کہ جن میں وہ اپنے آپ کو دشمنوں میں گھرا ہوا پائے گا اور یہ خود ان کی بے آرامی اور روح میں موجود تلاطم پر ایک دلیل ہے۔

یہ یک فطری بات ہے کہ ایک مجرم اور ظالم، خصوصاً جب اس کا تعاقب ہو رہا ہو عالم خواب میں اپنے آپ کو ہولناکیوں کے سامنے دیکھتا ہے کہ جو اس کا پیچھا کرنے اور اسے پکڑنے کے درپے ہیں یا یہ کہ مقتول و مظلوم کی روح اس کے ناگاہ ضمیر کے اندر سے فریاد کرتی ہے اور اسے سخت مضطرب کرتی ہے۔ اسی لئے جب وہ بیدار ہوتا ہے تو یزید کی طرح کہتا ہے:

مالی وللحسین؟

میرا حسین سے کیا تعلق ہے؟

یا حجاج کہتا ہے: مالی و لسعید بن جبیر

مجھے سعید بن جبیر سے کیا واسطہ؟

۲۔ آئمہ ہدای کی چند روایات:

زیر بحث آیات کے ذیل میں آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے بڑی عمدہ روایات منقول ہیں ان میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کرتے ہیں۔

امیر المومنین علی علیہ السلام نے آیت الا ان اولیاء اللہ کی تلاوت فرمائی اور پھر اپنے اصحاب سے سوال کیا: جانتے ہو کہ اولیاء خدا کون لوگ ہیں؟

انھوں نے سوال کیا: یا امیر المومنین! آپ ہی فرمائیے کہ وہ کون ہیں؟

امام علیؑ نے فرمایا: ہم نحن و اتباعنا فمن تبعنا من بعدنا طوبی لنا ، طوبی لهم افضل من طوبی لنا ، قالوا : یا امیر المومنین ماشاءن طوبی لهم افضل من طوبی لنا ؛ السنا نحن وهم علی امر؛

قال : لا ، انهم حملوا مالم تحملوا علیہ ، وطاقوا مالم تطیقوا۔

خدا کے دوست ہم اور ہمارے پیروکار ہیں جو ہمارے بعد آئیں گے۔ کیا کہنا ہمارا اور اس سے بڑھ کر کیا کہنا ان کا۔

بعض نے پوچھا: ان کے لئے آپ نے بڑھ کر کیوں کہا: کیا ہم اور وہ ایک ہی مکتب کے پیرو نہیں ہیں کیا ہمارا معاملہ ایک جیسا نہیں ہے۔

آپ نے فرمایا:

نہیں کیونکہ ان کی اس قسم کی ذمہ داریاں ہیں جیسی تمہاری نہیں ہے اور وہ ایسی مشکلات سے دوچار ہوں گے کہ تم دوچار نہیں ہو۔^(۱)

کتاب کمال الدین میں ابو بصیر کے واسطے سے امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔

آپ علیہ السلام نے فرمایا:۔ طوبیٰ لشیعة قائمنا المنتظرین لظہور ہ فی غیبتہ ، و المطعین لہ فی ظہورہ، اولئک اولیاء اللہ الذین لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون۔

خوشا حال امام قائم علیہ السلام کے پیروکاروں کا کہ جو ان کی غیبت میں (اپنی خود سازی کے ساتھ) ان کے ظہور کا انتظار کریں گے اور ان کے ظہور کے وقت ان کے فرماں بردار ہوں گے، وہ اولیاءِ خدا ہیں کہ جنہیں نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ مخزون و مغوم ہوتے ہیں۔^(۲)

حضرت صادق علیہ السلام کا ایک موالی نقل کرتا ہے کہ امام علیہ السلام نے فرمایا:

اس مکتب کے پیروکار زندگی کے آخری لمحات میں ایسی چیزیں دیکھتے ہیں کہ جن سے ان کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ راوی کہتا ہے: میں نے اصرار کیا کہ وہ کیا دیکھتے ہیں؟ اس سوال کا میں نے دس سے زیادہ مرتبہ تکرار کیا۔ لیکن امام ہر مرتبہ صرف اتنا کہتے۔

وہ دیکھیں گے

مجلس کے اختتام پر آپ علیہ السلام نے میری طرف رخ کیا اور مجھے پکار کر فرمایا:

گویا تو اصرار کرتا ہے کہ یہ جانے کہ وہ کیا دیکھتے ہیں؟

میں نے عرض کیا:

یقین پھر میں رونے لگا۔

امام کو میری حالت پر رحم آیا اور کہا:

ان دونوں کو دیکھیں گے۔

میں نے اصرار کیا: کن دونوں کو؟ فرمایا:۔ پیغمبر اکرم اور حضرت علیؓ کو کوئی صاحبِ ایمان دنیا سے آنکھ بند نہیں کرے گا مگر یہ کہ ان دو بزرگوں کو دیکھے گا کہ وہ اسے بشارت دے رہے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا:

اسے خدا نے قرآن میں بیان کیا ہے۔

سوال: کہاں اور کس سورہ میں؟

فرمایا:

سورہ یونس میں جہاں فرمایا گیا ہے: ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْآخِرَةِ﴾۔

اسی مضمون کی اور روایات بھی موجود ہیں۔

واضح ہے کہ یہ روایات اشارہ ہیں کہ حاصِبِ ایمان تقویٰ افراد کے لئے کچھ یوں بشارتوں کی طرف، نہ کہ ان سب بشارتوں کی طرف نیز واضح ہے کہ یہ مشاہدہ مادی جسم کا نہیں ہے بلکہ برزخی نگاہ سے جسم کے مشاہدے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ عالم برزخ جو کہ اس جہاں اور عالم آخرت میں حد فاصل ہے، میں انسانی روح برزخی جسم میں باقی رہ جائے گی۔

۱۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۳۰۹۔

۲۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۳۰۹۔

آیات ۶۶، ۶۷

۶۶۔ ﴿الْأَيْنَ لِلَّهِ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ﴾۔

۶۷۔ ﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ لَتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ﴾۔

ترجمہ

۶۶۔ آگاہ ہو کہ وہ تمام جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں، خدا کے ہیں اور جو غیر خدا کو اس کا شریک بناتے ہیں وہ دلیل و منطق کی پیروی نہیں کرتے وہ صرف ظن اور گمان کی پیروی کرتے ہیں اور وہ صرف جھوٹ بولتے ہیں۔

۶۷۔ وہ وہ ہے کہ جس نے تمہارے لئے رات کو پیدا کیا تاکہ اس میں سکون حاصل کرو اور اس نے دن کو روشنی بخش قرار دیا۔

اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو سننے والے رکھتے ہیں۔

عظمت الہی کی کچھ نشانیاں

زیر نظر آیات دوبارہ مسئلہ توحید و شرک کی طرف لوٹی ہیں یہ مسئلہ اسلام اور اس سورہ کے اہم ترین مباحث میں سے ہے۔ ان آیات میں مشرکین کی خبر لی گئی ہے اور انکی عاجزی و ناتوانی کو ثابت کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: آگاہ ہو کہ وہ تمام لوگ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں خدا کے لئے ہیں (اور اس کی ملکیت ہیں)

﴿الْأَيْنَ لِلَّهِ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ﴾۔

جہاں اشخاص اس کی ملکیت ہوں اور اس کے لئے ہوں وہاں اشیاء اس جہاں میں بدرجہ اولیٰ اس کی ہیں اور اس کے لئے ہیں اس بناء پر وہ تمام عالم ہستی کا مالک ہے اس حالت میں کیونکہ ممکن ہے کہ اس کے مملوک اس کے شریک ہوں۔

مزید ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ غیر خدا کو اس کا شریک قرار دیتے ہیں وہ دلیل و منطق کی پیروی نہیں کرتے اور ان کے پاس اپنے قول کے لئے کوئی سند اور شاہد نہیں ہے ﴿وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ﴾۔

وہ صرف بے بنیاد تصورات اور گمانوں کی پیروی کرتے ہیں ﴿إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ﴾۔

بلکہ وہ تو صرف تخمینے سے بات کرتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں ﴿وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ﴾۔

”خرص“ لگت میں ”جھوٹ“ کے معنی میں بھی آیا ہے اور تخمین اور وہم و خیال کے معنی میں بھی آیا ہے۔ دراصل جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے کہ یہ پھلوں کی جمع آوری کے معنی میں ہے اور بعد ازاں حساب کے لئے جمع کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

نیز درختوں پر پھلوں کا تخمینہ اور اندازہ لگانے کو کہتے ہیں اور چونکہ کبھی کبھی تخمینہ غلط نکل آتا ہے لہذا یہ مادہ ”جھوٹ“ کے معنی میں بھی آیا ہے۔

اصولی طور پر بے بنیاد گمان کی پیروی کی یہ خاصیت ہے کہ آخر کار انسان جھوٹ کی وادی میں جا پہنچتا ہے۔ جنہوں نے بتوں کو خدا کا شریک قرار دیا تھا ان کی بیاد اوہام سے بڑھ کر نہ تھی۔ وہ اوہام کہ جن کا تصور کرنا ہمارے لئے مشکل ہے کہ کیونکہ ممکن ہے کہ انسان بے روح شکلیں اور مجسمے بنائے اور پھر اپنی بنائی ہوئی چیز کو اپن ارب اور صاحب اختیار سمجھنے لگے، اپنی تقدیر اس کے سپرد کر دے اور اپنی مشکلات کا حل اس سے طلب کرے۔ کیا یہ چیز جھوٹ اور جھوٹ قبول کر لینے کے سوا کچھ اور کہلا سکتی ہے۔

اس آیت میں تھوڑا سا غور کر کے اس سے ایک عمومی قانون اخذ کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ جو شخص بے بنیاد گمان کی پیروی کرتا ہے آخر کار جھوٹ تک جا پہنچتا ہے۔ صداقت اور سچائی یقین کی بنیاد پر استوار ہے اور جھوٹ کی عمارت بے بنیاد وہم و گمان کے سہارے قائم ہے۔

اس کے بعد بحث کی تکمیل، راہ خدا شناسی کی نشاندہی اور شرک و بت پرستی سے دوری کے لئے خدائی نعمات کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یہ پہلو نظام خلقت اور اللہ کی عظمت، قدرت اور حکمت کی نشاندہی کرتا ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ: وہ وہ ہے جس نے رات کو تمہارے لئے باعث سکون قرار دیا ہے

﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ﴾۔ اور دن کو روشنی بخش بنایا ہے ﴿وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا﴾۔

نور ظلمت کا یہ نظام جس کا ذکر قرآن میں بارہا آیا ہے، حیرت انگیز اور پر بار نظام ہے جس میں کچھ عرصہ میں تابش نور سے انسانوں کے صحیح حیات کو روشن کیا گیا ہے۔ یہ عرصہ حرکت آفرین ہے اور انسان کو جستجو اور عمل پر آمادہ کرتا ہے۔ دوسرا عرصہ سیاہ پردوں میں لپٹی ہوئی آرام بخش رات کا ہے۔ اس رات کے ذریعے تھکی ہوئی روح اور جسم کا کام اور حرکت کے لئے پھر سے تیار ہوتا ہے۔

جی ہاں اس حساب شدہ نظام میں پروردگار کی قدرت کی آیات اور نشانیاں ہیں لیکن ان کے لئے جو سننے والے کان رکھتے ہیں اور حقائق کو سنتے ہیں

﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ﴾۔ وہ جو سنتے اور ادراک کرتے ہیں اور جو ادراک حقیقت کے بعد اسے استعمال میں لاتے ہیں اور کام کرتے ہیں۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ رات آرام و سکون کے لئے ہے:

رات کے بنائے کا مقصد آیت میں آرام و سکون قرار دیا گیا ہے یہ ایک مسلم علمی ہے جسے آج کے علم سے درجہ ثبوت تک پہنچایا ہے کہ تاریکی کے پردے نہ صرف دن بھر کے کام کاج کے لئے جبری تعطیل ہیں بلکہ انسان اور دوسرے جانداروں کے اعصاب پر ان کا مستقیم اثر ہے اور انھیں اسراحت، نیند اور سکون بخشتے ہیں کس قدر ناداں ہیں وہ لوگ کہ جو رات کو ہوس رانی میں بسر کر دیتے ہیں اور دن کو خصوصاً نشاط انگیز صبح کو نیند میں گزار دیتے ہیں۔ اسی بناء پر ایسے لوگوں کے اعضاء ہمیشہ غیر معتدل اور بے آرام رہتے ہیں۔

۲۔ ”وَالنَّهَارُ مَبْصَرًا“ کا مفہوم:

ماہ ”ابصار“ بینائی کے معنی میں ہے۔ اس طرح ”وَالنَّهَارُ مَبْصَرًا“ کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے ”دن کو بینا قرار دیا ہے“ حالانکہ دن بینا کرنے والا ہے نہ کہ خود بینا ہے یہ ایک خوبصورت تشبیہ اور مجاز ہے جو ”توصیف سبب باوصاف“ مسبب کے قبیل سے ہے۔ جیسا کہ رات کے بارے میں بی کہا جاتا ہے کہ ”لیل ناٹم“ یعنی سوئی ہوئی رات“ حالانکہ رات تو نہیں سوئی بلکہ رات سبب ہے لوگوں کے لئے سونے کا۔

۳۔ کیا آیت ہر طرح کے ظن کی نفی کرتی ہے:

زیر نظر آیات میں ظن اور گمان کی ایک مرتبہ مذمت کی گئی ہے اور اسے مردود قرار دیا گیا ہے لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گفتگو بت پرستوں کے بے ہودہ اور بے بنیاد خیالات کے بارے میں ہے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں ”ظن“ عقلی اعتبار سے سوچے سمجھے گمان کے معنی میں نہیں ہے کہ جو بعض مواقع پر مثلاً شہادت و شہود، ظاہر الفاظ، اقرار اور تحریروں میں حجت ہے لہذا یہ آیات ”ظن“ کے حجت نہ ہونے پر دلیل نہیں ہو سکتیں۔

آیات ۶۸، ۶۹، ۷۰

۶۸۔ ﴿قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ هُوَ الْغَنِيُّ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ إِنَّ عِنْدَكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ بِهَذَا أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾۔

۶۹۔ ﴿قُلْ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ﴾۔

۷۰۔ ﴿مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ﴾۔

ترجمہ

۶۸۔ انھوں نے کہا کہ خدا نے اپنے لئے بیٹا چنا ہے (وہ ہر عیب، نقص اور احتیاج سے) منزہ ہے، وہ بے نیاز ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس کے لئے۔ تمہارے پاس اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیا خدا کی طرف ایسی نسبت دیتے ہو جسے جانتے نہیں ہو۔۔۔

۶۹۔ کہہ دو کہ جو خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں (وہ کبھی بھی) فلاح نہیں پائیں گے۔

۷۰۔ (زیادہ سے زیادہ) انھیں دنیا کا فائدہ ہوگا پھر ان کی بازگشت ہماری طرف ہے۔ اس کے بعد ان کے لئے عذاب شدید ہے، ان کے کفر کے بدلے کہ جو ہم انھیں چکھائے گے۔

تفسیر

ان آیات میں بی اسی طرح مشرکین کے بارے میں بحث جاری ہے یہاں خدا کی ذات مقدس کے بارے میں انکی ایک تہمت بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: انھوں نے کہا کہ خدا نے اپنے لئے ایک بیٹا چنا ہے (قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا)۔

یہ بات سب سے پہلے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں کی۔ پھر زمانہ جاہلیت کے بت پرستوں نے فرشتوں کے بارے میں کی، وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں خیال کرتے ہیں اور اسی طرح یہودیوں نے حضرت عزیر کے بارے میں یہ بات کی۔

قرآن ان لوگوں کا جواب دو طریقوں سے دیتا ہے۔

پہلا یہ کہ خدا ہر قسم کے عیب اور نقص سے منزہ ہے اور تمام چیزوں سے بے نیاز ہے ﴿سُبْحَانَهُ هُوَ الْغَنِيُّ﴾۔

یہ اس طرف اشارہ کہ اولاد کی ضرورت یا تو جسمانی قوت کی احتیاج اور مدد کے طور پر ہوتی ہے اور یا روحانی اور جذباتی ضرورت کے تحت اور چونکہ خدا ہر عیب و نقص اور ہر وجہی کمی سے منزہ ہے اور اس کی ذات پاک غنی اور بے نیاز ہے لہذا ممکن نہیں کہ وہ اپنے لئے بیٹے کا انتخاب کرے ”وہ آسمانوں اور زمین میں موجود تمام مرقوم موجودات کا مالک ہے“ ﴿لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ -

اس صورت میں اس کے لئے بیٹے کا کیا مفہوم وہ رہ جاتا ہے کہ جو اسے سکون بخشے یا اس کی مدد کرے۔ امر جاذب نظر ہے کہ یہاں ”اتخذ“ (انتخاب کیا اور اختیار کیا) استعمال ہوا۔ یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ ان کا نظریہ تھا کہ خدا سے بیٹا پیدا نہیں ہو بلکہ وہ کہتے تھے کہ خدا نے ایک موجود کو اپنے فرزند کے طور پر چن لیا ہے جیسے بعض لوگوں کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تو وہ کسی بچہ کسی پرورش گاہ وغیرہ سے گود لے لیتے ہیں بہر حال یہ کوتاہ نظر جاہل خالق و مخلوق کے موازنہ میں اشتباہ میں پڑ گئے تھے اور انھوں نے خدا کی بے نیاز ذات کو اپنے ضرورت مند اور نیاز مند وجود کی طرح سمجھ لیا تھا۔

دوسرا جواب جو قرآن انھیں دیتا ہے یہ کہ جو شخص بھی کوئی دعویٰ کرتا ہے اسے اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل پیش کرنا چاہتا ہے۔ ”کیا تمہارے پاس اس بات کی کوئی دلیل ہے“۔ نہیں تمہارے پاس اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں ہے ﴿إِنْ عِنْدَكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ بِهَذَا أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ -

یعنی بالفرض اگر تم پہلی دلیل کو قبول نہیں کرتے تو پھر بھی تم اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتے کہ تمہاری بات ایک تہمت ہے اور ایسا قول ہے جس کی بنیادیں کوئی علم نہیں ہے۔

اگلی آیت میں خدا پر تہمت باندھنے کے منحوس انجام کا تذکرہ ہے۔ خدا تعالیٰ روئے سخن اپنے پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے ان کہہ دو: وہ لوگ جو خدا پر افتراء باندھتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں وہ رگز فلاح کا منہ نہیں دیکھیں گے ﴿قُلْ إِنَّ الدِّينَ يَفْتَرُونُ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ﴾ -

فرض کریں کہ وہ اپنے جھوٹ اور تہمتوں سے چند دن کے لئے دنیا کے مال و منال تک پہنچ بھی جائیں تو یہ صرف اس جہان کا ایک زود گزر مال و متاع ہی ہے۔ اس کے بعد یہ ہماری طرف پلٹ کر آئیں گے اور ہم ان کے کفر کی وجہ سے انھیں عذابِ شدید کا مزہ چکھائیں گے ﴿مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نَذِيقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ﴾ -

در حقیقت اس آیت میں اور اس سے پہلے کی آیت میں خدا کی طرف بیٹے کے انتخاب کی نسبت دینے والے جھوٹوں کے لئے دو قسم کی سزائیں بیان کی گئی ہیں ایک یہ کہ جھوٹ اور افتراء کبھی ان کی فلاح کا سبب نہیں بنے گا اور کبھی انہیں ان کے مقصد تک نہیں پہنچائے گا بلکہ وہ بے راہ ویوں میں سرگرداں رہیں گے اور بد بختی اور شکست انہیں دامن گیر ہوگی۔ دوسرا یہ کہ فرض کریں کہ وہ ان باتوں سے چند لوگوں کو غفلت میں رکھ لیں اور بت پرستی کے مذہب سے کوئی مقصد حاصل کر لیں تاہم اس مفاد میں دوام و بقاء نہیں ہے اور خدا کا دائمی عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

چند الفاظ کا مفہوم

۱۔ ”سلطان“:

یہ لفظ یہاں ”دلیل“ کے معنی میں ہے یہ لفظ ”دلیل“ سے بھی زیادہ پر معنی اور رسا تر ہے کیونکہ ”راہنما“ کے معنی میں ہے۔ لیکن ”سلطان“ کا مطلب ہے وہ چیز جو انسان کو اپنے مد مقابل پر مسلط کر دے۔ یہ لفظ بحث، مجادلہ اور گفتگو کے موقع سے مناسبت رکھتا ہے اور سرکوبی کرنے والی دلیل کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ ”متاع“۔

اس کا معنی ہے ”وہ چیز جس سے انسان فائدہ اٹھائے“ اس کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اس میں زندگی کے تمام وسائل اور مادی نعمات شامل ہیں۔ مفردات میں راغب کہتا ہے: ”کما ینفع بہ علی وجہ ما، فھو متاع و متعة“ ہر وہ چیز جس سے انسان فائدہ اٹھائے اسے ”متاع“ یا ”متعہ“ کہتے ہیں۔

۳۔ ”نذیقھم“

اس کا معنی ہے ”ہم انہیں چکھائیں گے“۔ یہ تعبیر جو عذاب الہی کے بارے میں استعمال ہوئی ہے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ سزا ان تک اس طرح پہنچتی ہے کہ گویا وہ اسے اپنی زبان سے چکھتے ہیں۔ یہ تعبیر مشاہدہ سے حتیٰ کہ عذاب کو مس کرنے سے بھی کہیں زیادہ مطلب دیتی ہے۔

آیات ۲۱، ۲۲، ۲۳

- ۷۱- ﴿وَإِنَّا عَلَيْهِمْ نَبَأٌ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَاقَوْمِ إِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذِكْرِي بآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَائَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنظِرُونِ﴾-
- ۷۲- ﴿فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجَرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَامِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾-
- ۷۳- ﴿فَكَذَّبُوهُ فَتَبَيَّنَا وَنُوحٍ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنَاهُمْ خَلَائِفَ وَأَعْرَفْنَا الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِنَا فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُتَكَبِّرِينَ﴾-

ترجمہ

- ۷۱- ان کے سامنے نوح کا قصہ پڑھو کہ جب اس نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! حیثیت اور میرا آیت الہی کا یاد دلانا تم پر گراں (اور قابل برداشت) ہے تو جو کچھ تم سے ہو سکے کرلو) میں نے خدا پر توکل کیا ہے اپنی فکر اور اپنے معبودوں کی قوت کو مجتمع کو لو اور کوئی چیز تم پر مخفی نہ ہو پھر میری زندگی کا خاتمہ کر دو (اور لمحہ بھر کے لئے) مجھے مہلت نہ دو (لیکن تم اس کی قدرت نہیں رکھتے)۔
- ۷۲- اور اگر تم میری دعوت قبول کرنے سے منہ موڑتے ہو تو (تم غلط کمرے ہو کیونکہ) میں تم سے کوئی مزدوری نہیں چاہتا۔ میرا اجر صرف خدا پر اور میرے ذمہ ہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں (کہ جو خدا کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں)۔

- ۷۳- لیکن انھوں نے اس کی تکذیب کی اور ہم نے اسے اور اس کے ساتھ جو کشتی میں تھے انھیں نجات دی اور انھیں (کافروں کی جگہ) جانشین قرار دیا اور جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی انھیں غرق کر دیا پس دیکھو کہ جو ڈرائے گئے تھے (لیکن انھوں نے اللہ کی طرف سے ڈرائے جانے کو اہمیت نہ دی) ان کا کیا انجام ہوا؟

حضرت نوح علیہ السلام کے جہاد کا ایک پہلو

زیر نظر آیات سے تاریخ انبیاء اور گزشتہ اقوام کی سرگزشت کے ایک حصے کا آغاز ہوتا ہے۔ مشرکوں اور مخالف گروہوں کی بیداری کے لئے خدا اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ مشرکین کے بارے میں جاری گفتگو کی تکمیل گزشتہ لوگوں کی عبرت انگیز تاریخ کے حوالے سے کریں۔

پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان کے سامنے نوح کی سرگزشت پڑھو، جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! تمہارے درمیان میرا توقف اور آیاتِ الہی کا یاد دلانا اگر تمہارے لئے گراں ہے اور ناقابلِ برداشت ہے تو پھر جو کچھ تم سے ہو سکے کر گزرو اور اس میں کوتاہی نہ کرو

﴿وَآتِلْ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَاقَوْمِ إِنَّ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذَكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ﴾۔ کیونکہ میں نے اس پر توکل کیا ہے “لہذا اس کے غیر سے نہیں ڈرتا اور نہ میں کسی سے ہراساں ہوں ﴿فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ﴾۔

اس کے بعد تاکید فرمایا گیا ہے: اب جب کہ ایسا ہے تو اپنی فکر مجتمع کر لو اور اپنے بتوں کو بھی دعوتِ عمل دو تاکہ وہ تمہارے ارادے میں تمہاری مدد کریں ﴿فَاجْمَعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ﴾۔ ”اس طرح سے کہ کوئی چیز تم پر مخفی نہ رہے اور نہ تمہارے دل میں کوئی غم رہے“ بلکہ پوری وضاحت سے میرے بارے میں پختہ ارادہ کر لو ﴿ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً﴾

﴿﴾۔

”غم“ ”غم“ کے مادہ سے کسی چیز کے چھپانے کے معنی میں ہے۔ یہ جو رنج و اندوہ اور حزن و ملال کو غم کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ انسان کے دل کو چھپا لیتا ہے۔

اس کے بعد کہا گیا ہے: اگر تم سے ہو سکے تو ”اٹھ کھڑے ہو اور میری زندگی کا خاتمہ کر دو اور مجھے لمحہ بھر کی مہلت نہ دو“ ﴿ثُمَّ أَفْضُوا إِلَيَّ وَلَا تَنْظُرُونِي﴾۔^(۱)

حضرت نوح علیہ السلام خدا کے عظیم رسول ہیں ان کے بہت تھوڑے سے ساتھی تھے اور دشمن نہایت سخت اور طاقت ور لیکن وہ پانے یقین کے ساتھ کہ جو اولو العزم پیغمبروں کا خاصہ ہے بڑی شجاعت اور پامردی سے دشمنوں کے مقابلے میں ڈٹ جاتے ہیں۔ ان کی قوت و طاقت کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کے سازشوں، افکار اور بتوں کے بارے میں اپنی بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے افکار و نظریات پر ایک شدید نفسیاتی ضرب لگاتے ہیں۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ آیات مکہ میں نازل ہوئیں اس زمانے میں کہ جب رسول اللہ بھی حضرت نوح علیہ السلام جیسے حالات سے دوچار تھے اور مومنین اقلیت میں تھے، قرآن چاہتا ہے کہ پیغمبر اکرم کو بھی یہی حکم دے کہ وہ دشمن کی طاقت کو اہمیت نہ دیں، بلکہ یقین اور شجاعت و شہامت کا مظاہرہ کریں کیونکہ ان کی پناہ گاہ خدا ہے اور اس کی قدرت کے سامنے طاقت نہیں ٹھہر سکتی۔

بعض مفسرین حضرت نوح علیہ السلام کے اس قیام کو یا تاریخ انبیاء میں ایسے واقعات کو اعجاز کی ایک قسم قرار دیتے ہیں کیونکہ انھوں نے ظاہری وسائل نہ ہونے کے باوجود دشمنوں کو شکست کی دھمکی دی اور انجام کار اپنی فتح کی خبر دی اور یہ چیز معجزے کے سوا ممکن نہیں۔

بہر حال یہ تمام اسلامی رہبروں کے لئے ایک درس ہے کہ وہ دشمنوں کی کثرت سے ہرگز ہراساں نہ ہوں بلکہ پروردگار پر بھروسہ اور توکل کرتے ہوئے، حتمی و قطعی فیصلے کے ساتھ جتنا زیادہ ہو سکے انھیں مقابلہ کی دعوت دیں اور ان کی طاقت کی تحقیر و تذلیل کریں کیونکہ یہ اسلام کی پیروکاروں کی روحانی تقویت اور دشمنوں کی روحانی شکست کے لئے ایک اہم عامل ہے۔

اگلی آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے اپنی حقانیت کے لئے اثبات کے لئے ایک اور بیان نقل ہوا ہے ارشاد ہوتا ہے: اگر تم میری دعوت سے روگردانی کرو گے تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہوگا کیونکہ میں نے تم سے کسی اجر یا مزدوری کا تو تقاضا نہیں کیا ﴿فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ﴾ (۲) کیونکہ میرا اجر اور جزا صرف خدا پر ہے ﴿إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ﴾۔

میں اس کام کے لئے کرتا ہوں اور اسی سے اجر و جزا چاہتا ہوں اور ”میں مامور ہوں کہ فقط فرمانِ خدا کے سامنے سر تسلیم خم کروں“ ﴿وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾۔

یہ جو حضرت نوح علیہ السلام کہتے ہیں کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا خدائی رہبروں کے لئے یہ ایک اور درس ہے کہ وہ اپنی دعوت اور تبلیغ میں لوگوں سے کسی قسم کی کوئی مادی اور معنوی جز کی توقع نہ رکھیں کیونکہ ایسی توقعات ایک قسم کی وابستگی پیدا کر دیتی ہیں اور ان کی صریح تبلیغات اور آزادانہ کارکردگی کی راہ میں دیوار بن جاتی ہیں لہذا فطرتاً ان کی تبلیغات اور دعوت کا اثر کم ہو جائے گا۔ اس بناء پر اسلام اور اس کی تبلیغ اور دعوت کے لئے صحیح راستہ بھی یہی ہے کہ مبلغین اسلام اپنی گزر بسر کرنے اور معاش کے لئے بیت المال کا سہارا لیں نہ کہ وہ لوگوں کے محتاج ہوں۔

زیر بحث آخری آیت میں حضرت نوح کے دشمنوں کے انجام اور آپ پیش گوئی کی صداقت کی یوں بیان کیا گیا ہے: انھوں نے نوح کی تکذیب کی لیکن ہم نے اسے اور ان تمام افراد کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دی ﴿فَكَذَّبُوهُ﴾

فَنَجَّيْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ﴾۔ (۳)

”ہم نے یہ صرف انھیں نجات دی بلکہ ستم گر قوم کی جگہ جانشین بنایا“ ﴿وَجَعَلْنَاهُمْ خَلَائِفَ﴾۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا تھا انھیں ہم نے غرق کر دیا“ ﴿وَأَعْرِضْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا﴾۔

آخر میں روئے سخن پیغمبر اکرم کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اب ان لوگوں کا انجام دیکھو جھنیں ڈرایا گیا تھا لیکن انھوں نے خدائی تنبیہوں کو نہ سمجھا اس طرح ہم تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں (تاکہ وہ کچھ نہ سمجھ سکیں)۔ ﴿فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِينَ﴾۔

۱۔ ”کان ان کبر علیکم“ کی جزاء شرط کیا ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے اس کے لئے جس قدر احتمالات ذکر ہوئے ہیں ان میں سے دو زیادہ قرین عقل ہیں۔ ایک یہ کہ ”فاجعوا امرکم“ جزائے شرط ہے اور ”فعلى الله توكلت“ شرط اور جزا کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ دوسرا یہ کہ جزا محذوف ہے اور بعد والے جملے اس پر دلالت کرتے ہیں اور تقدیر اس طرح ہے: فافعلوا ما تريد ون فانی متوکل علی اللہ۔ در حقیقت جملہ ”فعلى الله توكلت“ علت کے قبیل سے ہے جو معلول کی جانشین ہے اور بعد والے جملے میں ”شرکائکم“ بتوں کی طرف اشارہ ہے اور اس سے پہلے واو ہے وہ ”مع“ کے معنی میں ہے (غور کیجئے گا)۔

۲۔ اس شرط کا جواب بھی محذوف ہے۔ فان تولیتم فلا تضرونی۔ یا اس طرح ہے: فان تولیتم فانتم و شأنکم۔

۳۔ ”فلک“ کشتی کے معنی میں یہ لفظ ”سفینہ“ سے مختلف ہے۔ یہ فرق کہ ”سفینہ“ مفرد ہے اور اس کی جمع ”سفائن“ ہے، جبکہ ”فلک“ مفرد اور جمع دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔

آیت ۷۴

۷۴- ﴿ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِ رُسُلًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ فَجَاءُوهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ كَذَلِكَ نَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْمُعْتَدِينَ﴾ -

ترجمہ

۷۴- پھر ہم نے نوح ﷺ کے بعد کچھ رسول ان کی قوم کی طرف بھیجے وہ واضح دلائل لے کے ان کے پاس گئے لیکن وہ اس چیز پر ایمان نہ لائے جس کی پہلے تکذیب کر چکے تھے۔

حضرت نوح ﷺ کے بعد آنے والے انبیاء

حضرت نوح کی سرگزشت کے بارے میں اجمالی گفتگو کے بعد ان کے بعد لوگوں کی ہدایت کے لئے آنے والے انبیاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ ان انبیاء کا تذکرہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے آئے مثلاً ابراہیم ﷺ، ہود ﷺ، صالح ﷺ، لوط ﷺ اور یوسف ﷺ۔ ارشاد ہوتا ہے: پھر نوح کے بعد ہم نے کچھ رسول ان کی قوم اور جمیعت کی طرف بھیجے ﴿ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِ رُسُلًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ﴾ -

”وہ واضح، روشن اور آشکار دلائل لے کر اپنی اپنی قوم کی طرف آئے“ اور نوح کی طرف ح ان کے پاس بھی منطق و اعجاز کے تربیت کنندہ ہتھیار اور پروگرام تھے ﴿فَجَاءُوهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ﴾ -

”لیکن وہ لوگ جو عناد اور ہٹ دھرمی کی راہ چل رہے تھے اور گزشتہ انبیاء کی تکذیب کے لئے بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے ان انبیاء کی بھی تکذیب کی اور ان پر ایمان نہ لائے ﴿فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ﴾ -

اور یہ اس بناء پر تھا کہ گناہ اور حق دشمنی کی وجہ سے ان کے دلوں پر پردہ پڑا ہوا ہے ”جی ہاں ہم اس طرح تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں“ ﴿كَذَلِكَ نَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْمُعْتَدِينَ﴾ -

دو قابل توجہ نکات

۱۔ ہٹ دھرم گروہ:

”﴿فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ﴾“ یہ جملہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ امتوں میں کچھ ایسے گروہ بھی تھے جو کسی پیغمبر اور مصلح کی دعوت پر سر تسلیم خم نہیں کرتے تھے اور اسی طرح اپنی بات پر اڑے رہتے تھے انبیاء کی بار بار

کی دعوت سے ان پر ذرہ بھی اثر نہیں ہوتا تھا لہذا مذکورہ ایک ایسے گروہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جس نے دو مختلف گروہوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایک گروہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں تھا اور ان کی دعوت کی تکذیب کرتا تھا جب کہ دوسرا گروہ اس کے بعد آیا جو انبیاء کی تکذیب میں پہلے گروہ کا پیروکار تھا۔ اس بناء پر جملے کا معنی اس طرح ہوگا: دوسری قوموں کے تجاوز کرنے والوں نے اس چیز پر ایمان لانے سے منہ پھیر لیا کہ جس سے پہلی قوموں نے روگردانی کی تھی۔

البتہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کی مخالفت کرنے والے طوفان کے دوران ختم ہو گئے تھے دوسرا احتمال زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے بہر حال اس کا لازمہ یہ ہے کہ ہم جملے کی ضمیروں کے مرجع (کانوا، لیوؤمنوا، اور کذبوا، میں جمع کی واو) میں تفکیک اور الگ الگ ہونے کے قائل ہوں۔

۲۔ ”کَذَلِکَ نَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِ الْمُعْتَدِیْنَ“ جبر کی دلیل نہیں:

واضح ہے کہ یہ جملہ جبر کی دلیل نہیں ہے اور اس کی تفسیر خود اسی میں موجود ہے کیونکہ فرمایا گیا ہے کہ ہم تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں تاکہ وہ کسی چیز کا ادراک نہ کر سکیں۔ یعنی پہلے وہ احکام الہی اور حق و حقیقت کے بارے میں پے در پے تجاوز اور زیادتیوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ان کی یہ زیادہ تیاں تدریجاً ان کے دلوں پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ان سے حق کی تشخیص کی قدرت چھین لیتی ہیں ان کا معاملہ یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ سرکشی، نافرمانی اور گانہ ان کی عادت اور طبیعتِ ثانیہ بن جاتا ہے چنانچہ اب وہ کسی حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔^(۱)

۱۔ اس مطلب کی تفصیل ہم جلد اول میں سورہ بقرہ کی آیت ۸ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں۔

آیات ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸

- ۷۵۔ ﴿ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَىٰ وَهَارُونَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ بِآيَاتِنَا فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ﴾۔
- ۷۶۔ ﴿فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا إِنَّ هَذَا لَسِحْرٌ مُّبِينٌ﴾۔
- ۷۷۔ ﴿قَالَ مُوسَىٰ أَتَقُولُونَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَكُمْ أَسِحْرٌ هَذَا وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ﴾۔
- ۷۸۔ ﴿قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَلْفِتَنَّا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا وَتَكُونَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِينَ﴾۔

ترجمہ

- ۷۵۔ ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنی آیات دے کر فرعون اور اس کے آس پاس والوں کی طرف بھیجا لیکن انھوں نے تکبر کیا (اور حق قبول نہ کیا کیونکہ) وہ مجرم گروہ تھا۔
- ۷۶۔ اور جب ہماری طرف سے ان کے پاس حق آیا تو کہنے لگے یہ واضح جادو ہے۔
- ۷۷۔ (لیکن) موسیٰ نے کہا کیا اس حق کو تم جادو شمار کرتے ہو جو تمہاری طرف آیا ہے؟ کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادو گر تو رست گار (اور کامیاب) نہیں ہوں گے۔
- ۷۸۔ کہنے لگے کیا تو اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اس سے پھیر دے جس پر ہمارے آباؤ اجداد تھے اور تو روئے زمین کی بزرگی (اور حکومت حاصل کر لے) ہم تم دونوں پر ایمان نہیں لائیں گے۔

موسیٰ ﷺ اور ہارون ﷺ کے جہاد کا ایک پہلو

- گزشتہ انبیاء اور ان کی امتوں کے واقعات کو زندہ نمونہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت نوح ﷺ کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے پھر حضرت نوح ﷺ کے بعد کے پیغمبروں کا ذکر ہوا ہے۔
- اب زیر نظر آیات میں حضرت موسیٰ ﷺ اور حضرت ہارون ﷺ کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ یہاں فرعون اور اس کے ساتھیوں سے ان کے مسلسل مبارزات اور جہاد کا کچھ ذکر کیا گیا ہے۔
- پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: گزشتہ انبیاء کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کی جماعت کی طرف آیات و معجزات کے ساتھ بھیجا ﴿ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَىٰ وَهَارُونَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ بِآيَاتِنَا﴾۔^(۱)

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے ان زرق و برق اشraf کو ملاء کہا جاتا ہے کہ جن کا ظاہر آنکھ کو پرکردے اور اجماع میں ہوں تو نمایاں ہوں۔ زیر بحث آیت میں ایسی دیگر آیات میں یہ لفظ حواریوں، اطرافیوں اور مشیروں کے معنی میں آیا ہے۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ گفتگو صرف فرعونیوں کی طرف حضرت موسیٰ ﷺ کے مبعوث ہونے کے بارے میں ہے جب کہ حضرت موسیٰ تمام فرعونیوں اور بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرے کی بض بر سر اقتدار پارٹی اور ان کے خاندان کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہر اصطلاحی اور انقلابی پرگرام میں پہلے انھیں ہدف بنایا جائے۔ جیسا کہ سورہ توبہ کی آیہ ۱۲ میں بھی ہے: ﴿فَقَاتِلُوا أُمَّةَ الْكُفْرِ﴾ پس کفر کے حکمرانوں اور دالیوں سے جنگ کرو۔

لیکن فرعون اور فرعونیوں نے حضرت موسیٰ ﷺ کی دعوت سے روگردانی کی اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی بجائے اس سے تکبر کیا ﴿فَاسْتَكْبَرُوا﴾۔

انھوں نے تکبر کی وجہ سے اور انکساری کی روح نہ ہونے کے باعث حضرت موسیٰ کی دعوت کے واضح حقائق کی پرواہ نہ کی۔ اس طرح اس مجرم اور گنہ گار قوم نے اپنا جرم و گناہ جاری رکھا۔ ﴿وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ﴾۔

اگلی آیت میں حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی سے فرعونیوں کے بعض مبارزات کے بارے میں گفتگو ہے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ انھوں نے انکار، تکذیب اور افتراء کا راستہ اختیار کیا ان کی نیت کو بڑا قرار دیا۔ بڑوں کے طریقے کو درہم برہم کرنے کا الزام دیا اور اجتماعی نظام میں خلل ڈالنے کی تہمت لگائی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: جس وقت ہماری طرف سے حق ان کے پاس آیا (تو باوجودیکہ انھوں نے اس کے چہرے سے اسے پہچان لیا) کہنے لگے کہ یہ واضح جادو ہے

﴿فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا إِنَّ هَذَا لَسِحْرٌ مُّبِينٌ﴾۔

حضرت موسیٰ کی دعوت کی قوت جاذبہ ایک طرف، آنکھوں میں سما جانے والے معجزات دوسری طرف روز افزون اور حیران کن اثر نفوذ تیسری طرف بنے کہ فرعونی فکر میں پڑ گئے۔ انھیں اس سے بہتر کوئی بات نہ سوچھی کہ انھیں جادو گر کہیں اور ان کے کام کو جادو قرار دیں اور یہ ایسی تہمت ہے جو پوری تاریخ انبیاء میں اور خصوصاً پیغمبر اسلام کے بارے میں نظر آتی ہے لیکن حضرت موسیٰ ﷺ نے اپنے دفاع میں دو لیلوں سے نقاب الٹ دیئے اور ان کے جھوٹ اور تہمت کو آشکار کر دیا۔

آپ ﷺ نے پہلے ان سے کہا کہ کیا تم حق کی طرف جادو کی نسبت دیتے ہو کیا یہ جادو ہے اور اس کی جادو سے کوئی مشابہت ہے؟ ﴿قَالَ مُوسَىٰ أَتَقُولُونَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَكُمْ أَسِحْرٌ هَذَا﴾۔

مندرجہ بالا جملے میں محذوف مقدر ہے کہ جو پورے کلام سے سمجھا جاتا ہے، جو اصل میں اس طرح ہے:

﴿تَقُولُونَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَكُمْ سِحْرٌ، اسِحْرٌ هَذَا﴾

یعنی یہ درست ہے کہ سحر اور معجزہ دونوں ہی اثر رکھتے ہیں۔ یہ حق اور باطل ممکن ہے دونوں لوگوں کو متاثر کریں لیکن جادو کچھ کہ جو ایک باطل چیز ہے، معجزے سے کہ جو حق ہے بالکل جدا ہے۔ انبیاء کے اثر کو جادو گروں کے اثر پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ جادو گروں کے کام بے ہدف، محدود اور بے وقعت ہوتے ہیں۔ جب کہ انبیاء کے معجزات کے مقاصد روشن، اصلاحی، انقلابی اور تربیتی ہوتے ہیں علاوہ ازیں جادو گر بھی کامیاب نہیں ہوتے ﴿وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ﴾۔ یہ تعبیر دراصل انبیاء کے کام کے جادو سے ممتاز اور جدا ہونے پر ایک دلیل ہے پہلی دلیل میں جادو اور معجزے کا فرق بیان کیا گیا ہے ان دونوں کے مختلف رخ کی طرف اشارہ ہے اور ان کے ہدف اور مقصد کا اختلاف ثابت کیا گیا ہے لیکن یہاں جادو گر اور معجزہ لانے والے کے حالات و صفات کے اختلاف کے حوالے سے مطلب کے اثبات میں مدد لی گئی ہے۔

جادو گر کا کام اور فن انحراف پیدا کرنے اور غافل کرنے کا پہلو رکھتا ہے۔ جادو سے فائدہ اٹھانے والے افراد منحرف، لوگوں کو غافل کرنے والے اور دھوکا باز ہوتے ہیں۔ جبکہ پیغمبر حق طلب، دلسوز، پاک دل، باہدف، نیک، پارسا اور مادی امور کی پرواہ نہ کرنے والے جو اس مرد ہوتے ہیں۔

جادو گر بھی رست گاری اور فلاح کا چہرہ نہیں دیکھتے وہ دولت و ثروت، مقام اور منصب ذاتی مفادات کے سوا کسی چیز کے لئے کام نہیں کرتے۔ جبکہ انبیاء کا ہدف و مقصد ہدایت، خلق خدا کا مفاد اور انسانی معاشرے کے تمام معنوی اور مادی پہلوؤں کی اصلاح ہوتا ہے۔

پھر انھوں نے اپنی تہمتوں کی سیلاب کا رخ موسیٰ کی طرف کئے رکھا اور ان سے کھل کر کہنے لگے: کیا تو ہمارے آباؤ اجداد اور بزرگوں کے طور طریقے سے پھیر دینا چاہتا ہے ﴿قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَلْفِتَنَّا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَائُنَا﴾۔

در حقیقت انھوں نے بڑوں کے طور طریقے، رسومات، خیالی عظمت اور ان کے افسانوی بتوں کا سہارا لیا تاکہ عوام کو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہ السلام سے متفر کر سکیں اور انھیں یقین دلائیں کہ یہ تمہارے معاشرے اور ملک کے مقدسات اور عظمتوں کو پامال کرنا اور ان سے کھیلنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے اپنی پہلی بات کو جاری رکھا اور کہا کہ خدا کے دین کے بارے میں تمہاری دعوت جھوٹ سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ تو سب اس سرزمین پر حکومت کرنے کے لئے جال اور خاتمانہ سازشیں ہیں ﴿وَتَكُونُ لَكُمْ الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ﴾۔

در حقیقت چونکہ ان کی ہر کوشش لوگوں پر ظالمانہ حکومت کے لئے تھی لہذا دوسروں کو بھی ایسا ہی خیال کرتے تھے۔ وہ انبیاء کی مصلحانہ کوششوں کو بھی یہی معنی پہناتے تھے اور کہتے تھے کہ ”تم جان لو کہ ہم تم دو افراد پر کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔“ کیونکہ ہم تمہارے مقاصد سمجھ لیتے ہیں اور تمہارے تحزیبی پر گرام سے ہم آگاہ ہیں ﴿وَمَا نَحْنُ لَكُمْ بِمُؤْمِنِينَ﴾۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف ان کی جنگ کا یہ پہلا مرحلہ ہے۔

۱۔ ”آیات“ سے مراد وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعدد معجزات جو ابتداء میں اپنے ساتھ لائے تھے۔

آیات ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲

۷۹۔ ﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ اِثْنُوْنِیْ بِكُلِّ سَاحِرٍ عَلِیْمٍ﴾۔

۸۰۔ ﴿فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوسٰی اَلْقُوا مَا اَنْتُمْ مُّلقُوْنَ﴾۔

۸۱۔ ﴿فَلَمَّا اَلْقَوْا قَالَ مُّوسٰی مَا جِئْتُمْ بِهٖ السِّحْرِ اِنَّ اللّٰهَ سَیَبْطِلُھٗ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ﴾۔

۸۲۔ ﴿وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِہٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ﴾۔

ترجمہ

۷۹۔ فرعون نے کہا: ہر گاہ جادو گر (اور ساحر) کو میرے پاس لے آؤ۔

۸۰۔ جس وقت جادو گر آئے اور موسیٰ نے ان سے کہا: تم (جادو کے اسباب میں سے) جو کچھ ڈال سکتے ہو ڈال دو۔

۸۱۔ جب انھوں نے (جادو کے اسباب) ڈالے تو موسیٰ نے کہا کہ جو کچھ تم لائے ہو وہ جادو ہے جسے خدا جلدی باطل کر دے گا کیونکہ خدا فساد کرنے والوں کے عمل کی اصلاح نہیں کرتا۔

۸۲۔ اور حق کو وہ اپنے وعدہ سے ثابت کر دکھاتا ہے اگرچہ مجرم ناپسند کرتے ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف جنگ کا دوسرا مرحلہ

ان آیات میں مقابلے کا اگلا مرحلہ بیان کیا گیا ہے۔ ان میں حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی کے خلاف فرعون کے عملی اقدام کی بات کی گئی ہے۔

جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے کچھ معجزات مثلاً بیضا اور بہت بڑا اڑدہا کو حملہ کرتے دکھا اور اسے سر طیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا دعویٰ بلا دلیل نہیں اور یہ دلیل کم از کم اس کے اطرافیوں یا دوسروں میں سے بعض پر اثر انداز ہوگی تو اس نے عملی طور پر جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ قرآن کہتا ہے: فرعون نے پکارا کہ کہا کہ تم آگاہ جادو گروں کو میرے پاس لے آؤ تاکہ ان کے ذیعے میں موسیٰ والی مصیبت اپنے سے دور کر سکو ﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ اِثْنُوْنِیْ بِكُلِّ سَاحِرٍ عَلِیْمٍ﴾۔

وہ جانتا تھا کہ ہر کام میں اس کے راستے سے داخل ہونا چاہیے اور اس کے ماہروں سے مدد لینا چاہئے۔

کیا واقعاً حضرت موسیٰ کی دعوت کی حقانیت میں شک رکھتا تھا اور اس طریقے سے انھیں آزمانا چاہتا تھا یا وہ جانتا تھا کہ موسیٰ خدا کی طرف سے ہیں لیکن اس کا خیال تھا کہ جادو گروں کے شور و غل سے لوگوں کا مطمئن کیا جاسکتا ہے اور وقتی طور پر عامۃ الناس کے افکار کو موسیٰ کے اثر و نفوذ سے بچایا جاسکتا ہے کہ موسیٰ خارق عادت کام کا انجام دیتا ہے تو ہم

بھی اس جیسے کام کی انجام دہی سے عاجز نہیں ہیں اور اس خیال تھا کہ اگر اس کا ملوکانہ ارادہ اس طرح سے پورا ہو جائے تو یہ چیز سہل اور آسان ہے۔

دوسرا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں کھڑا ہوا تھا۔ بہر حال جب مقابلے کے معین تاریخی دن کہ جس دن کے لئے لوگوں کو شرکت کی عام دعوت دی گئی تھی، جادوگر اکٹھے ہوئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی طرف رخ کیا اور کہا: پہلے جو کچھ تم لاسکتے ہو میدان میں لے آؤ ﴿فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنْتُمْ مُلْقُونَ﴾۔

”الکو ما انتم ملقون“ کا اصلی معنی یہ ہے کہ جو کچھ تم پھینک سکتے ہو پھینکو اور یہ اشارہ ہے ان مخصوص رسیوں اور لاٹھیوں کی طرف جو اندر سے خالی تھیں اور انھوں نے ان میں خاص کیمیائی مواد ڈال رکھا تھا کہ جسے سورج کی روشنی میں رکھا جائے تو اس میں حرکت اور جوش پیدا ہوتا ہے۔ اس بات کی شاہد وہ آیات ہیں جو سورہ اعراف اور شعراء میں آئی ہیں۔ سورہ شعراء کی آیت ۴۳ اور ۴۴ میں ہے۔

﴿قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ الْقُوا مَا أَنْتُمْ مُلْقُونَ فَالْوَا حِبَالُهُمْ وَعَصِيَّهُمْ وَ قَالُوا بَعْزَةُ فِرْعَوْنَ اَنَا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ﴾۔

موسیٰ نے ان سے کہا جو پھینک سکتے ہو پھینکو، پھر انھوں نے میدان میں اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں اور کہنے لگے فرعون کی عزت کے صدقے، ہم کامیاب ہیں۔

بہر حال انھوں نے اپنی تمام قدرت مجتمع کی اور جو کچھ وہ اپنے ساتھ لائے تھے انھوں نے میدان کے بیچ میں ڈال دیئے ”تو اس وقت موسیٰ نے ان سے کہا کہ جو کچھ تم لے کر آئے ہو یہ جادو ہے اور خدا جلدی ہی اسے باطل کر دے گا ﴿فَلَمَّا أَلْقَوْا قَالَ مُوسَىٰ مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ﴾۔

تم فاسد اور مفسد افراد ہو کیونکہ ایک جابر، ظالم اور سرکش کی خدمت انجام دے رہے ہو اور تم نے اپنے علم کو اس خود غرض حکومت کی بنیادوں ک و مضبوط کرنے کے لئے فروخت کر دیا ہے اور یہ خود تمہارے مفسد ہونے پر ایک بہترین دلیل ہے اور خدا مفسدین کے عمل کی اصلاح نہیں کرتا ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ﴾۔

در حقیقت جو شخص بھی عقل ہوش اور دانش رکھتا تھا، حضرت موسیٰ کے جادو گروں پر غلبہ حاصل کرنے سے پہلے بھی اس حقیقت کو سمجھ سکتا تھا کہ ان کا عمل بے بنیاد ہے کیونکہ وہ ظلم کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لئے کام کر رہے تھے۔ کون نہیں جانتا تھا کہ فرعون غاصب، غارت گر، ظالم اور مفسد ہے ت و کیا ایسی طاقت کے خد مت گزار اس ظلم و فساد

میں شریک نہ تھے کیا ممکن تھا کہ ان کا عمل ایک صحیح اور خدائی عمل قرار پا سکے۔ ہر گز نہیں۔ لہذا واضح ہے کہ خدا ایسی مفسدانہ کوششوں کو باطل کر دے گا۔

کیا ”سیبطلہ“ (خدا نے جلد باطل کر دے گا) اس بات کا دلیل ہے کہ جادو ایک حقیقت ہے لیکن خدا اسے باطل کر سکتا ہے یا س جملے سے مراد یہ ہے کہ خدا اس کے باطل ہونے کو واضح کر دے گا۔

سورہ اعراف کی آیہ ۱۱۶ میں ہے:- ﴿فَلَمَّا الْقَوْا سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ﴾ -

یعنی۔ جادو گروں کے جادو نے لوگوں کی آنکھوں کو متاثر کیا اور انھیں وحشت میں ڈال دیا۔

لیکن یہ تعبیر اس بات کے منافی نہیں کہ ان کے پاس رموز و سائل تھے جیسا کہ ”سحر“ کے لغوی معنی میں پوشیدہ ہے۔ انھوں نے معنوی طور پر مختلف اجسام کے طبعی اور کیمیائی خواص سے استفادہ کیا اور اس سے ان رسیوں اور لاٹھیوں میں واقعا حرکات پیدا کر دیں البتہ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جیسا کہ ظاہراً معلوم ہوتا تھا معاملہ اس کے برعکس تھا یہ رسیاں اور لاٹھیاں زندہ موجودات نہیں بن گئی تھیں۔ جیسا کہ قرآن سورہ طہ کی آیت میں کہتا ہے:

﴿فَإِذَا جَآءَهُمْ وَعْصِيهِمْ يَخِيلُ إِلَيْهِمْ سَحَرَهُمْ أَنَّهُمْ اتَّبَعُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَهُمْ﴾

اس وقت رسیاں اور لاٹھیاں جادو گروں کے جادو کی وجہ سے یوں لگتی تھیں جیسے وہ زندہ موجودات ہیں جو دوڑ رہی ہیں۔ لہذا جادو جا ایک حصہ تو حقیقت پر مبنی ہے اور دوسرا وہم و خیال ہے۔

زیر نظر آخری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ موسیٰ نے اس سے کہا کہ اس مقابلے میں ہمیں اعتماد ہے کہ کامیابی ہماری ہے کیونکہ خدا کا وعدہ ہے کہ وہ حق کو آشکار کرے گا اور شکست دینے والی منطق اور غالب آنے والے معجزات کے ذریعے اپنے پیغمبروں کی مدد کرے گا اور یوں ایل فساد و باطل کو رسوا اور ذلیل کرے گا اگرچہ مفسد فرعون اور اس کے حواری اسے ناپسند کرتے ہیں ﴿وَيُحَقِّقُ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ﴾ -

”بکلمات“ سے مراد یا تو انبیاء برحق کی کامیابی کے لئے خدائی وعدہ ہے یا اس کے قاہر اور قوی معجزات ہیں۔^(۱)

۱۔ حضرت موسیٰ کے فرعون اور فرعونوں سے مقابلے کے بارے میں تفصیلات اور اس سلسلے میں کئی اہم نکات پر ہم جلد شش میں سورہ اعراف کی آیہ ۱۱۳ کے بعد سے تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ نیز جادو اور اس کی حقیقت کے بارے میں ہم پہلی جلد میں سورہ بقرہ کی آیہ ۱۰۲ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔ رجوع کیجئے۔

آیات ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳

۸۳- ﴿فَمَا آمَنَ لِمُوسَىٰ إِلَّا ذُرِّيَّتُهُ مِنْ قَوْمِهِ عَلَىٰ خَوْفٍ مِنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِمْ أَنْ يَفْتِنَهُمْ وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الْمُسْرِفِينَ﴾ -

۸۴- ﴿وَقَالَ مُوسَىٰ يَأْقُومُ إِنَّ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوا إِن كُنْتُمْ مُّسْلِمِينَ﴾ -

۸۵- ﴿فَقَالُوا عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾ -

۸۶- ﴿وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾ -

ترجمہ

۸۳- (شروع میں) کوئی شخص موسیٰ پر ایمان نہ لایا اور مگر صرف اس کی قوم کی اولاد میں سے ایک گروہ - (وہ بھی) فرعون اور اس کے حواریوں کے خوف سے کہیں وہ (انھیں دباوی اگرہ کن پرپیگنڈہ سے) ان کے دین سے منحرف نہ کر دیں - فرعون زمین میں بالادستی اور طغیان کے لئے کوشاں تھا اور وہ زیادتی کرنے والوں میں سے تھا -

۸۴- موسیٰ نے کہا: اے میری قوم! اگر تم ایمان لائے ہو تو اس پر توکل کرو اگر اس کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہو -

۸۵- انھوں نے کہا ہم صرف خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں - پروردگار! ہمیں ظالم گروہ کے زیر اثر قرار نہ دے -

۸۶- اور ہمیں اپنی رحمت سے کافر گروہ (کے ہاتھ) سے نجات دے -

طاغوتِ مصر سے حضرت موسیٰ ﷺ کے جہاد کا تیسرا مرحلہ

ان آیات میں فرعون سے حضرت موسیٰ ﷺ کے انقلابی مقابلوں میں سے ایک اور واقعہ بیان کیا گیا ہے -

ابتداء میں حضرت موسیٰ ﷺ پر ایمان لانے والے کی کیفیت بیان کی گئی ہے - ارشاد ہوتا ہے: اس واقعہ کے بعد

موسیٰ پر ایمان لانے والے صرف ان کی قوم کے فرزند تھے ﴿فَمَا آمَنَ لِمُوسَىٰ إِلَّا ذُرِّيَّتُهُ مِنْ قَوْمِهِ﴾ -

یہ چھوٹا اور مختصر سا گروہ تھا - لفظ ”ذریۃ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی زیادہ تر جوان اور نوجوان تھے - وہ

فرعون اور اس کے حواریوں کی طرف ست سخت دباو کا شکار تھے - انھیں ہر وقت یہی خوف رہتا تھا کہ فرعون حکومت

کہیں شدید دباو کے ذریعے کہ جو اہل ایمان پر روارکتھی ہے، انھیں موسیٰ کا دین ترک کرنے پر مجبور نہ کرے ﴿عَلَىٰ خَوْفٍ

مِنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُمْ أَنْ يَفْتِنَهُمْ﴾۔ کیونکہ فرعون ایک ایسا شخص تھا جو زمین پر بالادستی چاہتا تھا ﴿وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ﴾۔ وہ اسراف کرنے والا تجاوز کرنے والا تھا اور کسی حد کو قانونی نہیں سمجھتا تھا ﴿وَإِنَّهُ لَمِنَ الْمُفْسِرِينَ﴾۔

اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ موسیٰ پر ایمان لانے والی ”ذریہ“ کون سی تھی اور یہ کہ ”مِنْ قَوْمِ“ کی ضمیر موسیٰ کی لوٹی ہے یا فرعون کی طرف۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ فرعون کی قوم اور قبیلوں میں سے چند افراد تھے جیسے مومن آل فرعون، فرعون کی بیوی، اس کی مشاطہ ۱

اور اس کی کنیز ظاہر اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے اکثر افراد ایمان لا چکے تھے لہذا یہ صورت ”ذریہ من قوم“ سے مناسبت نہیں رکھتی۔ کیونکہ یہ تو ایک چھوٹے سے گروہ کا ذکر ہے۔

بعض دوسرے مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ گروہ بنی اسرائیل میں سے تھا اور ”بہ“ کی ضمیر موسیٰ کی طرف لوٹی ہے کیونکہ اس سے پہلے موسیٰ کا نام آیا ہے لہذا ادبی قواعد کے مطابق اس ضمیر کا تعلق موسیٰ ہی سے ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دوسرا معنی ظاہر آیت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے نیز والی آیت میں اس کے لئے ایک شاہد ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔ ﴿وَقَالَ مُوسَىٰ يَأْقُوم﴾

موسیٰ نے مومنین سے کہا: اے میری قوم یعنی مومنین کو اپنی قوم قرار دیا ہے۔

ایک ہی اعتراض ہے جو اس تفسیر پر باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل تو تمام حضرت موسیٰ پر ایمان لائے تھے نہ کہ ان کا ایک چھوٹا سا گروہ ایمان لایا تھا۔ البتہ ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے یہ اعتراض دور ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ہم جانتے ہیں کہ ہر انقلاب کی طرف جذب ہونے والا پہلا گروہ نوجوان کا ہوتا ہے۔ نوجوان زیادہ پاکیزہ دل اور صاف و شفاف افکار رکھتے ہیں۔

مزید برآں ان میں انقلابہ جوش و خروش زیادہ ہوتا ہے۔ مادی وابستگیوں جو بڑے بوڑھوں کا احتیاط اور مصلحت کوشی کی طرف دعوت دیتی ہیں ان میں نہیں ہوتیں نہ ان کے پاس مال و دولت ہوتا ہے کہ جس کے ضائع ہونے کا انھیں ڈر ہو اور نہ ہی مقام و منصب کہ جس کے خطرے میں پڑ جانے پر وہ مضطرب ہوں لہذا یہ بات فطری ہے کہ گروہ حضرت موسیٰ کی طرف بہت جلد جذب ہو گیا، اور ”ذریہ“ کی تعبیر اس معنی سے بہت زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

اس کے علاوہ بڑے بوڑھے بھی بعد میں اس گروہ سے ملحق ہو گئے تھے کیونکہ وہ اس وقت کے معاشرے میں کوئی مقام نہیں رکھتے تھے اور ضعیف و ناتواں تھے۔ جیسا کہ ابن عباس سے منقول ہے یہ تعبیر ان کے لئے کوئی بعید نہیں ہے۔ یہ بالکل اس طرح ہے جیسے اپنے تمام دوستوں کو دعوت دیتے ہوئے ہم کہتے ہیں ”آگے چلو جوانو! دعوت ہے“ اگرچہ بڑے بوڑھے ہوں اور اگر اس تعبیر کو ہم بعید سمجھیں تو پہلا احتمال پوری طرح سے باقی ہے۔

مزید برآں ’ذریۃ‘ اگرچہ عام طور پر اولاد کے لئے بولا جاتا ہے لیکن اصل لغت کے اعتبار سے جیسا کہ مفردات راغب میں راغب نے کہا ہے، چھوٹے اور بڑے دونوں کا مفہوم لئے ہوئے ہے۔

ایک اور نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ لفظ ”فتنۃ“ کہ جو ”ان یتنہم“ میں ہے سے مراد ڈرانے، دھمکانے اور تکلیف پہنچانے کے ذریعہ منحرف کرنا یا ہر طرح سے پریشانی اور درد سر پیدا کرنا چاہے وہ دینی حوالے سے ہو یا غیر دینی حوالے سے۔

بہر حال حضرت موسیٰ نے ان کی فکر اور روح کی تسکین کے لئے محبت آمیز لہجے میں ان سے کہا: اے میری قوم! اگت تم لوگ خدا پر ایمان لائے ہو اور اور اپنی گفتار میں اور ایمان و اسلام کے اظہار میں سچے ہو تو تمہیں اس پر توکل اور بھروسہ کرنا چاہیے۔ امواج و طوفان بلا سے نہ ڈرو۔ کیونکہ ایمان توکل سے جدا نہیں ہے

﴿وَقَالَ مُوسَىٰ يَا قَوْمِ إِن كُنتُمْ آمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوا إِن كُنتُمْ مُّسْلِمِينَ﴾ -

”توکل“ کا مفہوم ہے کام کسی کے سپرد کرنا اور اسے وکالت کے لئے منتخب کرن۔ ”توکل“ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کوشش کرنا چھوڑ دے، گوشہ تنہائی میں جا بیٹھے اور کہے کہ میرا سہارا خدا ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب انسان کام کے لئے اپنی پوری کوشش کر چکے اور مشکل حل نہ ہو اور راہ سے رکاوٹیں نہ ہٹیں تو پھر اضطراب اور وحشت کو اپنی طرف نہ آنے دے بلکہ لطف الہی پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کی ذات پاک اور قدرت بے پایاں سے مدد چاہتے ہوئے مامردی کا مظاہرہ کرے۔ مسلسل جہاد جاری رکھے یہاں تک کہ اگر اس میں طاقت بھی ہو تو اپنے آپ کو لطفِ خدا سے بے نیاز نہ سمجھے کیونکہ جو طاقت بھی ہے اسکی کی طرف سے ہے۔

یہ ہے توکل کا مفہوم کہ جو ایمان و اسلام سے جدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک مومن کہ جس کا سر فرمان پروردگار کے سامنے خم ہے وہ اسے ہر چیز پر قادر توانا سمجھتا ہے۔ ہر مشکل کو اس کے ارادے کے سامنے سہل اور آسان سمجھتا ہے اور اس کے کامیابی کے وعدوں پر اعتقاد رکھتا ہے۔

ان سچے مومنین نے موسیٰ کی دعوت کو توکل کے ساتھ قبول کیا اور کہا کہ ہم صرف خدا پر توکل کرتے ہیں ﴿فَقَالُوا عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا﴾ -

اس کے بعد انھوں نے بارگاہِ قدس سے تقاضا کیا کہ وہ انھیں دشمنوں کے شر، وسوسوں اور دباؤ سے امان میں رکھے اور عرض کیا: اے پروردگار ہمیں فتنہ کا ذریعہ اور ظالموں کے زیر اثر قرار نہ دے ﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾ - پروردگار ہمیں اپنی رحمت سے بے ایمان قوم سے نجات دے ﴿وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِّنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾ -

یہ امر جاذبِ توجہ ہے کہ پہلی آیت میں فرعون کو مسرفین میں سے قرار دیا گیا ہے - تیسری آیت میں فرعون اور اس کے حواریوں کو ظالم کہا گیا ہے اور آخری آیت میں انھیں کافر قرار دے دیا گیا ہے - تعبیروں کا یہ فرق شاید اس بناء پر ہو کہ انسان گناہ کے راستے میں پہلے اسراف کرتا ہے - یعنی حدود سے تجاوز کرتا ہے، پھر ظلم و ستم کی بنیاد رکھتا ہے اور آخر کار معاملہ کفر و انکار پر جا کر ختم ہو جاتا ہے -

۱- مشاطہ پرانے زمانے میں اس عورت کو کہتے تھے جو امیر کبیر گھرانوں کی عورتوں کی آرائش و زیبائش کرتی تھی (مترجم) -

آیات ۸۷، ۸۸، ۸۹

۸۷- ﴿وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَنْ تَبَوَّأَ لِقَوْمِكَ مِمَّصْرَ بُيُوتًا وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ﴾۔

۸۸- ﴿وَقَالَ مُوسَىٰ رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوْا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ﴾۔

۸۹- ﴿قَالَ قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيمَا وَلَا تَتَّبِعَانِ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾۔

ترجمہ

۸۷- اور موسیٰ اور اس کے بھائی کو ہم نے وحی کی کہ اپنی قوم کے لئے سرزمین مصر میں گھروں کا انتخاب کرو اور اپنے گھروں کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے (اور قریب) رکھو اور نماز قائم کرو اور مومنین کو بشارت دو (کہ آخر کار وہ کامیاب ہو جائیں گے)۔

۸۸- موسیٰ نے کہا: پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے اطرافیوں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور (بھرپور) اموال دینے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ (تیرے بندوں کو) تیری راہ سے گمراہ کرتے ہیں۔ پروردگار! ان کے اموال نابود کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کیونکہ جن تک دردناک عذاب نہ دیکھیں گے ایمان نہ لائیں گے۔

۸۹- فرمایا: تم دونوں کی دعا قبول ہو گئی ہے۔ تم استقامت دکھاؤ اور ان لوگوں کے طور طریقے کی پیروی نہ کرو جو نہیں جانتے۔

چوتھا مرحلہ انقلاب کی تیاری

ان آیات میں فرعون کے خلاف بنی اسرائیل کے قیام اور انقلاب کا ایک اور مرحلہ بیان کیا گیا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ خدا فرماتا ہے: ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ سرزمین مصر میں اپنی قوم کے لئے گھروں کا انتخاب کرو ﴿وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَنْ تَبَوَّأَ لِقَوْمِكَ مِمَّصْرَ بُيُوتًا﴾۔ اور خصوصیت کے ساتھ ”ان گھروں کو ایک دوسرے کے قریب اور آمنے سامنے بناؤ۔ ﴿وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً﴾۔ پھر روحانی طور پر اپنی خود سازی اور اصلاح کرو ”اور نماز قائم کرو“۔ اس طرح سے اپنے نفس کو پاک اور قوی کرو ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ﴾۔

اس لئے کہ خوف اور وحشت کے آثار ان کے دل سے نکل جائیں اور وہ روحانی و انقلابی قوت پالیں ”مومنین کو بشارت دو“ کامیابی اور خدا کے لطف و رحمت کی بشارت ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ -

ان آیات کے مجموعی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانے میں بنی اسرائیل منتشر، شکست خوردہ، وابستہ، طفیلی، آلودہ اور خوف زدہ گروہ کی شکل میں تھے، نہ انکے پاس گھر تھے نہ کوئی مرکز تھا۔ نہ ان کے پاس معنوی اصلاح کا کوئی پر گرام تھا اور نہ ہی ان میں اس قدر شجاعت، عزم اور حوصلہ تھا جو شکست دینے والے انقلاب کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ لہذا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو حکم ملا کہ وہ بنی اسرائیل کی مرکزیت کے لئے خصوصاً روحانی حوالے سے، چند امور پر مشتمل پروگرام شروع کریں۔

۱۔ مکان کی تعمیر کریں اور اپنے مکانات فرعونوں سے الگ بنائیں۔ اس میں متعدد فائدے تھے۔

ایک یہ کہ سرزمین مصر میں ان کے مکانات ہوں گے تو وہ اس کا دفاع زیادہ لگاؤ سے کریں گے۔

دوسرا یہ کہ قبیلوں کے گھروں میں طفیلی زندگی گزارنے کی بجائے وہ اپنی ایک مستقل زندگی شروع کر سکیں گے۔

تیسرا یہ کہ ان کے معاملات اور تدابیر کے راز دشمنوں کے ہاتھ نہیں لگے گے۔

۲۔ اپنے گھر دوسرے کے آمنے سامنے اور قریب قریب بنائیں کیونکہ دراصل ”قبلہ“ حالتِ تقابل کے تقابل میں ہے

۔ آج کل لفظ ”قبلہ“ کا جو معنی مشہور ہے وہ اس کا ثانوی معنی ہے۔ ۱

بنی اسرائیل کی مرکزیت کے لئے یہ ایک موثر کام تھا اس طرح وہ اجتماعی مسائل پر مل کر غور و فکر کر سکتے تھے اور

مراسم مذہبی کے حوالے سے جمع ہو کر اپنی آزادی کے لئے ضروری پروگرام بنا سکتے تھے۔

۳۔ عبادت کی طرف متوجہ ہوں، خصوصاً نماز کی طرف کہ جو انسان کو بندوں کی بندگی سے جدا کرتی ہے اور اس کا

تعلق تمام قدرتوں کے خالق سے قائم کر دیتی ہے۔ اس کے دل اور روح کو گناہ کی آلودگی سے پاک کرتی ہے اپنے آپ پر

بھروسہ کرنے کا احساس زندہ کرتی ہے اور قدرت پروردگار کا سہارا لے کر انسانی جس میں ایک تازہ روح پھونک دیتی ہے

-

۴۔ ایک رہبر کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی روحوں میں موجود طویل غلامی اور

ذلت کے دور کا خوف و وحشت نکلا باہر پھینکیں اور حتمی فتح و نصرت و کامیابی اور پروردگار کے لطف و کرم کی بشارت

دے کر مومنین کے ارادے کو مضبوط کریں اور ان میں شہامت و شجاعت کی پرورش کریں۔

یہ امر جاذبِ توجہ ہے کہ بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ فطرتاً ان میں سے ایک گروہ حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے اور وہ اور وہ ان کے بھائی سا لہا سال تک مصر پر حکومت کرتے رہے ہیں۔ اس طرح اس سر زمین کی آبادی اور تعمیر میں کوشاں رہے ہیں لیکن خدا کی نافرمانی، غفلت اور داخلی اختلاف کی وجہ سے انکی زندگی اس وقت بار کیفیت تک پہنچ گئی تھی ضروری تھا کہ اس مصیبت زدہ فرسودہ معاشرے کی تعمیر نو ہو۔ اس کے منفی پہلوؤں کی اصلاح ہو اور ان کی بجائے ان میں تعمیری اور اصلاحی، روحانی خصائل پیدا ہوں تاکہ ان کی عظمت - رفتہ پلٹ آئے۔

اس کے بعد فرعون اور فرعونوں کی سرکشی کے ایک سبب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت موسیٰ کی زبانی فرمایا گیا ہے: پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے حواریوں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور مال بخشا ہے ﴿وَقَالَ مُوسَىٰ رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾۔ لیکن اس ثروت و زینت کا انجام یہ ہوا کہ وہ تیرے بندوں کو تیری راہ سے منحرف اور گمراہ کرتے ہیں ﴿رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِكَ﴾۔

”لیضلوا“ میں لام اصطلاح کے مطابق لام عاقبت ہے یعنی اشراف کی دولت مند تحمل پرست قوم لوگوں کو راہِ خدا سے گمراہ کرنے کی خواہ مخواہ کوشش کرے گی۔ اس سے آخر کار اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔ کیونکہ انبیاء کی دعوت اور خدائی پروگرام لوگوں کی بیدار، ہوشیار، متحد اور مجتمع کردیں گے ان حالات میں غارتگروں اور لیٹروں کے لئے حلقہ تنگ ہو جائے گا اور ان کے لئے زندگی سیاہ ہو جائے گی، وہ ردِ عمل کا مظاہرہ کریں گے اور انبیاء کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوں گے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ درگاہِ الہی میں تقاضا کرتے ہوئے کہتے ہیں: پروردگار! ان کے اموال کو محو اور بے اثر کر دے تاکہ وہ اس سے بہرہ ور نہ ہو سکیں ﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰی أَمْوَالِهِمْ﴾۔ لغت میں ”طمس“ کسی چیز کو محو اور بے اثر کرنے کے معنی میں ہے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ اس نفرین اور بددعا کے بعد فرعونوں کا مال پتھر اور راکھ میں تبدیل ہو گیا۔ شاید یہ اس امر اشارہ ہو کہ وہ اس طرح سے اقتصادی بحیران کا شکار ہوئے کہ ان کی ثروت بے وقعت ہو گئی اور راکھ کی طرح بے قیمت ہو گئی۔

حضرت موسیٰ مزید عرض کرتے ہیں: پروردگار! اس کے علاوہ ان سے غور و فکر کی، سوچنے کی قدرت بھی لے لے لے ﴿وَأَشَدُّ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ﴾۔ کیونکہ یہ دو سرمائے گنوا کر وہ زوال اور تباہی کے قریب پہنچ جائیں گے۔ اس طرح انقلاب کی طرف اور ان پر آخری ضرب لگانے کے لئے راستہ کھل جائے گا۔ خداوند! یہ جو میں فرعونوں کے بارے میں ایسی خواہش رکھتا ہوں تو یہ جذبہ انتقال اور کینے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس بناء پر ہے کہ اب ان میں ایمان کے لئے کسی قسم کی کوئی آمادگی نہیں ہے۔ جب تک تیرا دردناک عذاب نہ پہنچ جائے وہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرْوُوا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ﴾۔

البتہ واضح ہے کہ عذاب کو دیکھ کر ایمان لانا ان کے لئے فائدہ مند نہیں ہوگا جیسا کہ عنقریب آئے گا۔ خدا نے حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی سے کہا کہ اب جبکہ تم بنی اسرائیل کی تربیت اور اصلاح کے لئے تیار ہو گئے ہو ”تمہارے دشمنوں کے بارے میں تمہاری دعا قبول کوئی“ ﴿قَالَ قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمَا﴾۔ پس مضبوطی سے اپنی راہ پر کھڑے ہو جاؤ اور استقامت و پامردی دکھاؤ، کثرتِ مشکلات سے نہ ڈرو اور اپنے کام کے بارے میں حتمی فیصلہ کرو ﴿فَاسْتَقِيمَا﴾۔ اور نادان اور بے خبر افراد کی تجاویز کے سامنے ہرگز سر تسلیم خم نہ کرو اور جاہلوں کے راستے پر فی چلو بلکہ مکمل آگاہی کے ساتھ اپنے انقلابی پروگرام کو جاری رکھو ﴿وَلَا تَتَّبِعَانِ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾۔

۱۔ البتہ بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت میں ”قلہ“ کو آمنے سامنے کے معنی میں نہیں لیا بلکہ اسی قبلہ نماز کے معنی میں لیا ہے اور ”واقموا الصلوٰۃ“ کے جملہ کو اس کا قرینہ سمجھا ہے لیکن پہلا اس لفظ کے اصلی لغوی معنی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں دونوں معانی مراد لینے میں بھی کوئی اشکال نہیں اس کی بہت سی نظیریں موجود ہیں۔

آیات ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳

- ۹۰۔ ﴿وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا وَعَدُوًّا حَتَّىٰ إِذَا أَذْرَكَهُ الْعَرَقُ قَالَ آمَنْتُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا الَّذِي آمَنْتَ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾۔
- ۹۱۔ ﴿الْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ﴾۔
- ۹۲۔ ﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بَدَنِكَ لَتَكُونَ لِمَنْ خَلَقَكَ آيَةً وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَغَافِلُونَ﴾۔
- ۹۳۔ ﴿وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مَبَوَّأً صِدْقٍ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ فَمَا اخْتَلَفُوا حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْعِلْمُ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ﴾۔

ترجمہ

- ۹۰۔ ہم نے بنی اسرائیل کو (نیل کے عظیم) دریا سے گزرا اور فرعون اور اس کا لشکر ظلم و تجاوز کرتے ہوئے ان کے پیچھے گیا۔ جب وہ غرقاب ہونے لگا تو اس نے کہا کہ میں ایمان لایا کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمان میں سے ہوں۔
- ۹۱۔ (لیکن اسے کہا گیا) اب؟ حالانکہ پہلے تو نے نافرمانی کی اور تو مفسدین میں سے تھا۔
- ۹۲۔ لیکن آج ہم تیرے بدن کو (پانی سے) بچالیں گے تاکہ تو آنے والوں کے لئے عبرت بن جائے اور بہت سے لوگ ہماری آیات سے غافل ہیں۔
- ۹۳۔ ہم نے بنی اسرائیل کو صدق (اور سچائی) کی منزل میں جگہ دی اور انھیں پاکیزہ رزق میں سے عطا کیا (لیکن وہ نزاع و اختلاف میں پڑ گئے) اور انھوں نے اختلاف نہ کیا مگر اس کے بعد کہ علم و آگہی حاصل کر چکے تھے۔ تیرا پروردگار قیامت کے روز اس چیز کا فیصلہ کرے گا جس کے بارے میں وہ اختلاف کرتے تھے۔

ظالموں سے مقابلے کا آخری مرحلہ

ان آیات میں فرعونوں سے بنی اسرائیل کے مقابلے کے آخری مرحلے کی منظر کشی کی گئی ہے۔ فرعونوں کے انجام کی مختصر لیکن دقیق اور واضح عبارتوں کے ذریعے تصویر پیش کی گئی ہے اور ان میں قرآن نے اپنی روش کے مطابق اضافی مطالب ترک کر دیے ہیں جنہیں پہلے اور بعد کے جملوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جب کہ بنی اسرائیل دباو میں تھے اور فرعون بنی ان کا تعاقب کر رہے تھے ہم نے انہیں دریا پار کروادیا ﴿وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ﴾۔ دریائے نیل اتنا بڑا تھا کہ اس کے لئے لفظ ”بحر“ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کا معنی ”سمندر“ ہے۔

فرعون اور اس کا لشکر بنی اسرائیل کی سرکوبی کے لئے اور ان پر ظلم و تجاوز کرتے ہوئے ان کے تعاقب میں آیا لیکن جلد ہی وہ سب کے سب نیل کی موجوں میں غرق ہو گئے ﴿فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا وَعَدُوًّا﴾۔ ”بغی“ کا معنی ہے ”ظلم و ستم“ اور ”عدو“ کا مطلب ہے ”تجاوز“ یعنی انہوں نے ظلم اور تجاوز کرتے ہوئے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔

”لفظ“ فاتبعہم ”نشان دہی کرتا ہے کہ فرعون اور اس کے لشکر نے اپنے اختیار اور ارادے سے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔ بعض روایات بھی اس معنی کی تاکید کرتی ہیں۔ بعض دوسری روایات اس سے زیادہ مناسبت رکھتیں بہر حال جو کچھ ظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے وہی ہمارے لئے مددگار ہے۔ باقی رہا یہ کہ بنی اسرائیل دریا سے کیسے گزرے اور اس موقع پر کون سا معجزہ وقوع پذیر ہوا اس کی تفصیل انشاء اللہ سورہ شعراء کی آیہ ۶۳ کے ذیل میں آئے گی۔

بہر کیف یہ معاملہ چل رہا تھا ”یہاں تک کہ فرعون غرقاب ہونے لگا اور وہ عظیم دریائے نیل کی موجوں میں تنکے کی طرح غوطے کھانے لگا تو اس وقت غرور و تکبر اور جہالت و بے خبری کے پردے اس کی آنکھوں سے ہٹ گئے اور فطری نور توحید چمکنے لگا۔ وہ پکار اٹھا: ”میں ایمان لئے آیا کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں“ ﴿حَتَّىٰ إِذَا أَدْرَكَهُ الْعَرْقُ قَالَ آمَنْتُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا الَّذِي آمَنْتُ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ﴾۔ کہنے لگا کہ نہ صرف میں اپنے دل سے ایمان لایا ہوں بلکہ عملی طور پر بھی ایسے توانا پروردگار کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں ﴿وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾۔

در حقیقت جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشین گوئیاں یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہوئیں اور فرعون اس عظیم پیغمبر کی گفتگو کی صداقت سے آگاہ ہوا اور اس کی قدرت نمائی کا مشاہدہ کیا تو اس نے مجبوراً اظہار ایمان کیا، اسے امید تھی کہ جیسے ”بنی اسرائیل کے خدا“ نے انہیں کوہ پیکر موجوں سے نجات بخشی ہے اسے بھی نجات دے گا۔ لہذا وہ کہنے لگا میں اسی بنی اسرائیل کے خدا پر ایمان لایا ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا ایمان جو فزول بلا اور موت کے چنگل میں گرفتار ہونے کے وقت ظاہر کیا جائے در حقیقت ایک قسم کا اضطرابی ایمان ہے جس کا اظہار سب مجرم اور گنہگار کرتے ہیں۔ ایسے ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی اور نہ یہ حسن نیت اور صدق گفتار کی دلیل ہو سکتا ہے۔

اسی بناء پر خدا تعالیٰ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے: اب ایمان لایا ہے؟ حالانکہ اس سے پہلے تو نا فرمانی اور طغیان کرنے والوں، مفسدین فی الارض اور تباہ کاروں کی صف میں موجود تھا ﴿اَلْاَنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ﴾۔

پہلے بھی ہم نے سورہ نساء کی آیہ ۱۸ میں پڑھا ہے۔

﴿وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْاَنَ﴾۔

ان کی کوئی توبہ نہیں جو برے کام کرتے ہیں اور جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچے تو کہنے لگے کہ اب میری توبہ ہے۔

اسی بناء پر بہت مرتبہ دیکھا گیا ہے کہ اگر مصیبت کا وقت ٹل جائے اور وہ موت کے چنگل سے نجات پالیں تو دوبارہ پہلے سے کاموں کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔

اس تعبیر کی نظیر کہ جو ہم نے سطور بالا میں پڑھی ہے عرب و عجم کے ادباء کے کلام اور گفتگو میں بھی آئی ہے، مثلاً:

اتت وحياض الموت بيني و بينها

وجادت بوصل حين لا ينفع الوصل

وہ مری طرف آئی جب کہ میرے اور اس کے درمیان موت موجزن تھی وہ آمادہ وصال تھی جب کہ وصال کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

لیکن آج ہم تیرے بدن کی موجوں سے بچالیں گے تاکہ تو نے آنے والوں کے لئے درس عبرت ہو، ہر سر اقتدار مستکبرین کے لئے، تمام ظالموں اور مفسدوں کے لئے اور مستضعف گروہوں کے لئے بھی ﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِدَنِكَ

لَتَكُونَ لِمَنْ خَلَقَكَ آيَةً﴾۔

یہ کہ ”بدن“ سے مراد یہاں کیا ہے اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ ان میں سے اکثر کا نظریہ ہے کہ اس سے مراد فرعون کا بے جان جسم ہے کیونکہ اس ماحول کے لوگوں کے ذہن میں فرعون کی اس قدر عظمت تھی کہ اگر اس کے بدن کو پانی سے باہر نہ اچھالا جاتا تو بہت سے لوگ یقین ہی نہ کرتے کہ اس کا غرق ہونا بھی ممکن ہے اور ہو سکتا تھا کہ اس ماجرے کے بعد فرعون کی زندگی کے بارے میں افسانے تراش لیے جاتے۔

یہ نکتہ توجہ طلب ہے کہ بعض نے ”نخیک“ سے اس طرح استفادہ کیا ہے کہ خدا نے حکم دیا کہ موجیں اس کے بدن کو ساحل کی ایک اونچی جگہ پھینک دیں کیونکہ ”نحوہ“ کا مادہ مرتفع اور بلند جگہ کے معنی میں ہے۔

دوسرا نکتہ جو آیت میں نظر آتا ہے یہ ہے کہ ”فالیوم نجیک“ کا آغاز تفریع کے ساتھ ہوا ہے ممکن ہے یہ اس طرف اشارہ ہو کہ نامیدی کے عالم میں اور موت کے چنگل میں گرفتاری کے وقت فرعون کے بے روح ایمان نے جو جسم بے جان کی طرح تھا یہ اثر کیا کہ خدا نے فرعون کے بے جان جس کو پانی سے نجات دی تاکہ وہ در کی مچھلیوں کی غذا نہ بنے اور آنے والے لوگوں کے لئے عبرت کا باعث بھی ہو۔

اب بھی مصر اور برطانیہ کے عجائب گھروں میں فرعون کے مومیائے ہوئے بدن موجود ہیں۔ کیا ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہم عصر فرعون کا بدن بھی موجود ہے کہ جسے بعد میں حفاظت کے لئے مومیایا گیا ہو یا نہیں۔ اس سلسلے میں کوئی صحیح دلیل ہمارے پاس نہیں ہے لیکن ”لمن خلفک“ کی تعبیر ہو سکتا ہے اس احتمال کو تقویت دے کہ اس فرعون کا بدن بھی ان میں ہوتا کہ آنے والوں کے لئے باعث عبرت ہو کیونکہ آیت کی تعبیر مطلب ہے اور اس میں تمام آیات، نشانیوں اور عبرت انگیز در سوں کے ہوتے ہوئے کہ جن سے تاریخ انسانی بھری پڑی ہے بہت سے لوگ ہماری آیات اور نشانیوں سے غافل ہیں ﴿وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَغَافِلُونَ﴾۔

زیر بحث آخری آیت میں بنی اسرائیل کی آخری کامیابی اور فرعونوں کے چنگل سے نجات پانے کے بعد ان کی مقدس سر زمینوں کی طرف واپسی کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے بنی اسرائیل کو صدق اور سچائی کے مقام پر جگہ دی ﴿وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مُبَوَّأً صِدْقٍ﴾۔

”مبوء صدق“ (سچی منزل) ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ خدا نے بنی اسرائیل سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دیا اور انھیں اس سر زمین میں پہنچا دیا جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ ”صدق“ اس سر زمین کی پاکی اور نیکی کی طرف اشارہ ہو۔ اس طرح پھر یہ بات شام و فلسطین کی سر زمین سے مناسبت رکھتی ہے جو انبیاء خدا کی جائے سکونت ہے۔

ایک گروہ نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد سر زمین مر ہے کیونکہ قرآن جیسے سورہ دخان میں کہتا ہے: کم ترکوا من جنّات و عیون و زروع و مقام کریم و نعمة کانوا فیہا فاکھین کذلک و اورثنا ہا قوماً آخرین۔ فرعونوں کی نابودی کے بعد باغ، چشمے، زمینیں، محلات اور ان کی جو نعمتیں رہ گئی تھیں ہم نے دوسرے گروہ (یعنی بنی اسرائیل کو دے دیں (دخان ۲۵-۲۸)

یہی مضمون سورہ شعراء کی آیہ ۵۷ سے ۵۹ تک آیا ہے اور اس کے آخر میں ہے: ﴿و اورثنا ہا بنی اسرائیل﴾۔

ہم نے یہ باغ،۔ چشمے، خزانے اور محل بنی اسرائیل کو ذمے دیئے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سرزمین کی طرف ہجرت سے پہلے کچھ مدت مصر میں بھی رہے اور اس زر خیز سرزمین کی برکات سے بھی بہر مند ہوئے ہیں۔ البتہ کوئی مانع نہیں کہ سرزمین مصر، شام اور فلسطین سب مراد ہوں۔ اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: ہم نے انھیں پاکیزہ رزق سے بہرہ مند کیا ﴿وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ﴾۔ لیکن انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی اور ایک دوسرے سے اختلاف اور فزع میں پڑ گئے۔ وہ بھی لاعلمی کی وجہ سے نہیں بلکہ جانتے بوجھتے ہوئے اور حضرت موسیٰ کے ان معجزات اور ان کی صداقت کے دلائل کا مشاہدہ کرنے باوجود ﴿فَمَا اخْتَلَفُوا حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْعِلْمُ﴾۔ لیکن ”تیرا پروردگار آخر کار روز قیامت ان میں اس چیز کے بارے میں فیصلہ کرے گا“ اور اگر آج وہ اختلاف کی سزا نہ پائیں تو کل اس کا مزہ چکھیں گے۔ ﴿إِنَّ رَيْبَكَ يُقْضَىٰ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ﴾۔

مندرجہ بالا آیت کے بارے میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اختلاف سے مراد پیغمبر اسلام کے ہم عصر یہودیوں کا اختلاف ہے کہ جو آنحضرت کی دعوت قبول کرنے کے بارے میں ان میں موجود تھا یعنی اگرچہ انھوں نے اپنی آسمانی کتب کی نشانیوں کے مطابق آپ کی صداقت جان لی تھی پھر بھی اختلاف کیا تھوڑے سے لوگ ایمان لائے اور زیادہ تر نے آپ کی دعوت قبول کرنے سے روگردانی کی اور خدا قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔

یہ تھا بنی اسرائیل کی عبرت انگیز سرگزشت کا ایک حصہ جو اس سورہ کی کئی آیات میں بیان ہوا ہے ان کی حالت آج مسلمانوں سے کس قدر مشابہت رکھتی ہے۔ خدا اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کا کامیابیاں عطا کرتا ہے اور ان کے طاقتور دشمن کو معجزانہ طور پر شکست دیتا ہے اور اس مستضعف اور پس ماندہ قوم کو اپنے فضل و رحمت سے فتح دیتا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کامیابی کو دین اسلام کی عالمگیر فتح کے حصول کا ذریعہ بنا لیتے ہیں اس طرح ان کی ساری کامیابیاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ خدا تعالیٰ ہمیں اس کفرانِ نعمت سے نجات بخشنے۔

آیات ۹۲، ۹۶، ۹۵، ۹۳

۹۴۔ ﴿فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِّمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يُقْرَأُونَ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُ مِّنَ الْمُمْتَرِينَ﴾۔

۹۵۔ ﴿وَلَا تَكُ مِّنَ الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونُوا مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾۔

۹۶۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ﴾۔

۹۷۔ ﴿وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّى يَرَوْا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ﴾۔

ترجمہ

۴۹۔ جو کچھ ہم نے تجھ پر نازل کیا ہے اگر اس میں تجھے شک و شبہ ہے تو ان سے جو تجھ سے پہلے آسمانی کتب پڑتے ہیں سوال کرو، (جان لو) قطعی طور پر ”حق“ تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ تک پہنچا ہے لہذا شک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ ہو جا (البتہ وہ اس میں ہرگز شک نہیں کرتا جسے وہ شہود کے ذریعے جانتا ہے، یہ لوگوں کے لئے ایک درس تھا)

۹۵۔ اور ان میں سے نہ ہو جا و جنہوں نے آیاتِ خدا کی تذبذب کی ہے ورنہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائے گا

۹۶۔ (اور جان لو کہ) جن پر خدا ثابت ہو چکا ہے وہ ایمان نہیں لائے گے۔

۹۷۔ اگرچہ (اللہ کی) تمام آیات (اور اس کی نشانیاں) ان تک پہنچ جائیں، یہاں تک کہ وہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں (کیونکہ ان کے دلوں پر گناہ کی تاریکی چھائی ہوئی ہے اور روشنی ان تک پہنچنے کے لئے ان کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے)

شک کو اپنے قریب نہ آنے دو

گزشتہ آیات میں چونکہ انبیاء اور اقوام کی سرگذشت کے کچھ حصے بیان کئے گئے ہیں لہذا ممکن تھا کہ بعض مشرکین اور دعوتِ پیغمبر کے منکران کی صداقت میں شک کرتے۔ قرآن ان سے چاہتا ہے کہ ان کہی ہوئی باتوں کی صداقت سمجھنے کے لئے اہل کتاب کی طرف رجوع کریں اور ان کے بارے میں ان سے معلوم کریں کیونکہ ان کی کتب میں اس قسم کے بہت سے مسائل آئے ہیں لیکن مخالفین کی طرف روئے سخن کرنے کی بجائے پیغمبر کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن کہتا

ہے: جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے اگر تجھے اس کے بارے میں شک و تردد ہے تو ان سے جو تجھ سے پہلے آسمانی کتب پڑھتے ہیں پوچھ لے ﴿فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِّمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يُقْرَأُونَ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكَ﴾۔

تاکہ اس طرح سے یہ ثابت ہو جائے کہ ”ج و کچھ ہم نے تجھ پر نازل کیا ہے وہ تیرے پروردگار کی طرف سے حق ہے (لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ)۔ لہذا کسی قسم کے شک و شبہ کو ہرگز اپنے قریب نہ آنے دے (فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ)۔ یہ احتمال بھی ہے کہ مندرجہ بالا دعوت پیغمبر کی صداقت کے بارے میں ایک نئی اور مستقبل بحث شروع کر رہی ہو اور مخالفین سے کہتی ہو کہ اھر اس کی حقانیت کے بارے میں انھیں کوئی شک و تردد ہے تو اس کی نشانیاں جو گزشتہ کتب مثلاً تورات اور انجیل میں ہیں اہل کتاب سے پوچھ لیں۔

ایک شان نزول جو بعض کتب تفسیر (تفسیر الفتوح رازی، ج ۶، ص ۲۲۷، مذکورہ آیت کے ذیل میں)۔ میں نقل ہوئی ہے وہ بھی اس معنی کی تائید کرتی ہے۔ اور وہ یہ ہے: کفار قریش کا ایک گروہ کہتا تھا کہ یہ قرآن خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوا بلکہ (معاذ اللہ) محمد پر شیطان القاء کرتا ہے۔ ان کی اس گفتگو کی وجہ سے بعض لوگ شک و تردد کا شکار ہو گئے اس آیت کے ذریعے اللہ نے انھیں جواب دیا۔

کیا رسول اللہ کو شک تھا؟

ہو سکتا ہے کہ ابتدائی نظریوں میں یوں لگے کہ آیت کہہ رہی ہے کہ پیغمبر خدا ان آیات کی حقانیت کے بارے میں شک رکھتے تھے کہ جو ان پر نازل ہوتی تھیں اور خدا نے اس طریقے سے ان کا شک و شبہ رد کر دیا۔ لیکن اس طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ پیغمبر خدا نے تو وحی کو شہود اور مشاہدہ سے پایا تھا۔ جیسا کہ آیات قرآنی اس بات کی حکایت کرتی ہیں لہذا اس صورت میں شک اور تردد کوئی مفہوم ہی نہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات مروج ہے کہ دور کے لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لئے نزدیک کے افراد کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ جیسے عربوں میں مثل مشہور ہے:

ایاک اعنی و اسمعی یا جارة

اس کی نظیر فارسی میں بھی ہے ایسی گفتگو بہت سے مواقع پر صریح خطاب سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ مزید برآں جملہ شرطیہ ہمیشہ احتمال وجود شرط کی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایک بات کی تاکید کے لئے ایک عمومی قانون بیان کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۲۳ میں ہے:

﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا يَٰهٖ وَ بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَ أَمَّا يَبْلُغُنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا

اِفٍ﴾۔

تمہارے پروردگار نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو اور ماں باپ کی ساتھ نیکی کرو۔ جب ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے کبھی تھوڑی سی بھی دکھ دینے والی اور ناراحت کرنے والی بات نہ کہو۔

توجہ رہے کہ اس جملے میں ظاہراً مخاطب صرف رسول اللہ ہیں جبکہ ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہ کے والد کی ولادت سے قبل ہی اوقات پاپکے تھے ابھی آپ پچپن ہی میں تھے کہ والدہ بھی چل بسیں تو اس حالت میں ماں باپ کے احترام کا حکم ایک عمومی قانون کے طور پر بیان ہوا ہے اگرچہ ظاہراً مخاطب پیغمبر خدا ہی ہوں۔

نیز سورہ طلاق میں ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ﴾

اے پیغمبر! جس وقت تم لوگ عورتوں کو طلاق دو۔

یہ تعبیر اس امر کی دلیل نہیں کہ پیغمبر خدا نے اپنی زندگی میں کسی بیوی کو طلاق دی ہے بلکہ یہاں ایک عمومی قانون بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات جاذب نظر ہے کہ اس جملے کی ابتداء میں رسول اللہ مخاطب ہیں اور جملے کے آخر میں سب لوگ مخاطب ہیں۔

بہت سے قرائن جو تائید کرتے ہیں کہ آیت میں اصلی مقصود مشرکین اور کفار ہیں ان میں سے ایک اس آیت کے بعد کی آیات ہیں جو انکے کفر اور بے ایمانی کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اس کی نظیر حضرت عیسیٰ ﷺ سے مربوط آیات میں دکھائی دیتی ہیں کہ جس وقت خدا اس سے قیامت کے دن پوچھے گا کہ کیا تو نے لوگوں کو اپنی اور اپنی ماں کی عبادت کی دعوت دی تھی وہ صراحت سے اس کا انکار کرتے ہیں اور مزید کہتے ہیں: ﴿إِنْ كُنْتَ قُلْتَهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ﴾۔

اگر میں نے یہ بات کی ہوتی تو تیرے علم میں ہوتا۔ (مانندہ - ۱۱۶)۔

بعد والی آیت میں مزید ارشاد ہوتا ہے: اب جبکہ آیات پروردگار اور اس دعوت کی حقانیت تجھ پر واضح ہو چکی ہے تو ان لوگوں کی صف میں کھڑا نہ ہو جنہوں نے آیات الہی کی تکذیب کی ہے ورنہ زیاں کاروں میں سے ہو جائے گا ﴿وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ

الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونُ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾۔

در حقیقت قرآن پہلی آیت میں کہتا ہے کہ اگر شک و تردد رکھتے ہو تو ان سے پوچھو جو آگاہی اور علم رکھتے ہیں اور اس آیت میں کہتا ہے کہ اب جبکہ تردد کے عوامل برطرف ہو چکے ہیں تو ان آیات کے سامنے تجھے سر تسلیم خم کرنا چاہیے ورنہ حق کی مخالفت کا نتیجہ خسارے اور نقصان کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔

یہ آیت اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ گزشتہ آیت میں میں حقیقی مقصود عام لوگ تھے اگرچہ روئے سخن پیغمبر خدا کی طرف تھا کیونکہ واضح نقصان ہے کہ پیغمبر ہرگز آیات الہی کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ وہ تو سختی سے اپنے دین کی حمایت اور دفاع کرتے ہیں۔

اس کے بعد رسول اللہ کو بتایا گیا کہ تیرے مخالفین میں تعصب اور ہٹ دھرم لوگ موجود ہیں جن کے ایمان لانے کی تقویٰ عبث ہے۔ وہ فکری لحاظ سے اس قدر مسخ ہو چکے ہیں اور وہ باطل راستے اس قدر جڑ چکے ہیں کہ ان کا بیدار انسانی وجدان کھو چکا ہے وہ ناقابل اثر وجود میں تبدیل ہو چکے ہیں البتہ قرآن اس بات کو یوں بیان کرتا ہے: وہ لوگ کہ جن پر تیرے پروردگار کا فرمان ثابت ہو چکا ہے وہ ایمان نہیں لائے گے ﴿إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ﴾۔

یہاں تک کہ اگر خدا کی تمام آیات اور نشانیاں ان کے پاس آجائیں وہ تب بھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ وہ خدا کے دردناک عذاب کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیں۔ جبکہ اس وقت کے ایمان کا انھیں کوئی فائدہ نہیں ﴿وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّى يَرَوْا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ﴾۔

در حقیقت زیر بحث پہلی آیت تمام لوگوں کو مطالعہ، تحقیق اور باخبر لوگوں سے سوال کرنے کی دعوت دیتی ہے اور پھر تقاضا کرتی ہے کہ حق واضح ہو جانے پر اس کی حمایت اور دفاع کے لئے کھڑے ہو جائیں لیکن آخری آیات میں فرمایا گیا ہے کہ تمہیں سب کے ایمان لانے کی توقع نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ کچھ لوگ تو اس قدر فاسد ہو چکے ہیں کہ اب وہ اصلاح کے قابل نہیں رہے لہذا نہ تو ان کے ایمان نہ لانے پر دل سردا ہو اور نہ ہی ان کی ہدایت کے صرف ہونے والی توانائی کو رایگان سمجھ بلکہ ان لوگوں کی طرف توجہ دے جو زیادہ تعداد میں ہیں اور قابل ہدایت ہیں۔

جیسا کہ ہم بارہا تکرار کر چکے ہیں کہ ایسی آیات ہرگز کسی ”جبر“ پر دلالت نہیں کرتیں بلکہ یہ تو عمل انسانی کے آثار بیان کئے گئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ چونکہ ہر چیز کا اثر حکم خدا سے ہے اس لئے بعض اوقات ان امور کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قبل کی چند آیات میں ہم نے فرعون کے بارے میں پڑھا ہے کہ اس نے نزولِ عذاب اور طوفان میں پھنسنے کے بعد اظہارِ ایمان کیا لیکن ایسا چونکہ اضطراری پہلو رکھتا ہے اس لئے اسے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ لیکن زیر بحث آیات میں فرمایا گیا ہے: یہ صرف فرعون کا طریقہ تھا بلکہ تمام ہٹ دھرم، خوددار، مستکبر اور سیاہ دل افراد کہ جو طغیان و سرکشی کی آخری منزل پر پہنچے ہوئے ہیں ان کی بھی یہ حالت ہے وہ بھی دردناک عذاب کو دیکھے بغیر ایمان نہیں لاتے۔ وہی ایمان جو ان کے لئے بالکل بے اثر ہے۔

آیت ۹۸

۹۸- ﴿فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمٌ يُّؤُسُّ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ﴾ -

ترجمہ

۹۸- تمام آبادیاں اور شہر کیوں ایمان نہیں لائے کہ (جن کا ایمان بر محل ہو اور) ان کی حالت کے لئے مفید ہو، مگر یونس کی قوم کہ جب وہ ایمان لائی تو ان کی زندگی سے ہم نے رسوا کن دنیاوی عذاب بر طرف کر دیا اور ہم نے مدت معین (زندگی کے اختتام اور ان کی اجل) تک انھیں بہرہ مند کیا۔

صرف ایک گروہ بر محل ایمان لایا

گزشتہ آیات میں فرعون اور فرعونوں کے متعلق خصوصاً اور دوسری اقوال کے متعلق عموماً یہ نکتہ بیان ہوا ہے کہ انھوں نے اختیار اور سلامتی کے عالم میں خدا پر ایمان لانے سے اعراض کیا لیکن جب موت اور خدا کی سزا نے انھیں آلیا تو انھوں نے اظہار ایمان کیا کہ جو ان کے لئے سودم، ند نہیں ہوا۔ زیر نظر آیت میں یہ بات ایک عمومی قانون کے طور پر بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: گزشتہ قویں بر محل اور بر موقع ایمان کیوں نہیں لائیں کہ ان کا ایمان ان کے لئے فائدہ مند ہوتا ﴿فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا﴾ -

اس کے بعد حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کو مستثنیٰ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: سوائے یونس کی قوم کے کہ جب وہ ایمان لائے تو ان کی زندگی سے ہم نے رسوا کن دنیاوی عذاب بر طرف کر دیا ﴿إِلَّا قَوْمٌ يُّؤُسُّ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ - ”اور انھیں معین مدت (ان کی زندگی کے اختتام) تک ہم نے بہرہ مند کیا ﴿وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ﴾ -

لفظ ”لَوْلَا“ بعض مفسرین کے مطابق یہاں نفی کے معنی میں ہے لہذا ”الا“ کے ذریعے اس سے استثناء ہوا ہے۔ اس بناء پر جملے کا معنی اس طرح ہوگا: کوئی قوم و ملت جو گزشتہ زمانے میں شہروں اور آبادیوں میں زندگی بسر کرتی تھی اکٹھے مل کر خدائی پیغمبر پر ایمان نہیں لائی سوائے قوم یونس کے۔

بعض دوسرے مفسرین کا نظریہ ہے کہ ”لولا“ نفی کے لئے نہیں آیا بلکہ ہمیشہ یہ ”تخصیض“ کے معنی میں ہوتا ہے۔ ”تخصیض“، اس سوال کو کہتے ہیں جس میں تحریک اور سرزنش پائی جاتی ہے (لیکن ایسے موقع پر اس کا مفہوم لازمی طور پر نفی ہی ہوتا ہے۔ اسی بناء پر ”الا“ کہہ کر کسی چیز کا ہم استثناء کرتے ہیں۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ دوسری قوموں میں بھی بہت سے لوگ ایمان لائے تھے لیکن جو بات قوم یونس کو دوسری اقوام سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ سب کے سب مل کر ایمان لائے اور وہ بھی عذاب الہی کے قطعی اور یقینی طور پر آجانے سے پہلے جبکہ دوسری قوموں میں سے بہت سے لوگ سختی سے مخالفت پر ڈٹے رہے۔ یہاں تک کہ پروردگار کا قطعی عذاب صادر ہوا۔ عام طور پر ایسے لوگوں نے عذاب الہی کو دیکھ کر اظہار ایمان کیا۔ ان کا ایمان اسی دلیل کی بناء پر جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں سودمند نہ ہوا۔

قوم یونس کے ایمان لانے کا واقعہ

جیسا کہ تواریخ میں آیا ہے کہ ان کا ماجرہ کچھ یوں ہے:

حضرت یونس ؑ کی قوم ینوا (عراق) میں زندگی بسر کرتی تھی جب آپ ﷺ اس سے مایوس ہو گئے تو ایک عابد کی درخواست پر کہ جو ان میں رہتا تھا ان کے لئے بد دعا کی جبکہ انہی میں ایک عالم بھی تھا جو حضرت یونس ؑ سے درخواست کرتا تھا کہ آپ قوم کے بارے میں دوبارہ دعائے خیر کریں، ان کے لئے پھر ارشاد و ہدایت شروع کریں اور مایوس نہ ہوں۔

لیکن حضرت یونس اس واقعے کے بعد اپنی قوم سے باہر چلے گئے، ان کی قوم کہ جس نے آپ کی سچائی کو بارہا آزمایا ہوا تھا، اس عالم کے گرد جمع ہو گئی جب کہ فزول عذاب کا فرمان صادر نہیں ہوا تھا لیکن اس کی نشانیاں کم و بیش نظر آتی تھیں۔ ان لوگوں نے موقع غنیمت جانا اور اس عالم کی راہنمائی میں شہر سے باہر نکل آئے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ دعا و تضرع کر رہے تھے ہاتھ اٹھا رکھے تھے، اظہار ایمان کر رہے تھے، توبہ کناں تھے، انھوں نے ماؤں کو بچوں سے جدا کر دیا تھا تاکہ ان کی روح میں زیادہ انقلاب برپا ہو اور انھوں نے معمولی قسم کا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ اپنے پیغمبر کی تلاش میں نکل پڑے مگر ان کا تو کہیں کوئی نشان نظر نہ آیا۔ لیکن ان کی یہ توبہ، ایمان اور پروردگار کی طرف بازگشت چونکہ بر محل تھی اور علم، آگاہی اور خلوص کی بنیاد پر تھی لہذا وہ اپنا کام کر گئی۔ عذاب کی نشانیاں ہر طرف ہو گئیں۔ آرام و سکون

کی طرف پلٹ آیا۔ ایک طویل واقعے کے جب حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم کی طرف پلٹ آئے تو دل و جان سے قوم نے ان کی پذیرائی کی۔

خود حضرت یونس علیہ السلام کی زندگی کی تفصیل انشاء اللہ سورہ صافات کی آیات ۳۴ تا ۴۸ کے ذیل میں بیان کی جائے گی۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے قوم یونس علیہ السلام کو خدا کے عذاب کا ہر گز سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ورنہ ان کی قوم کی توبہ بھی قبول نہ ہوتی بلکہ خطرے کے الارم اور نشانیاں جو عام طور پر حقیقی عذاب سے پہلے نمایاں ہوتی ہیں ان کی بیداری کے لئے کافی ثابت ہو گئیں حالانکہ فرعونى خطرے کے ایسے الارم بارہا سن چکا تھا۔ خطرے کی نشانیاں ان کے لئے نمایاں ہو چکی تھیں۔ مثلاً طوفان، ٹڈی دل کا حملہ اور نیل کے پانی کا دگرگوں ہو جانا وغیرہ ایسے واقعات رونما ہو چکے تھے لیکن انھوں نے خطرے کی ان گھنٹیوں کو کبھی کوئی اہمیت نہ دی اور ہر مصیبت پر صرف حضرت موسیٰ سے خواہش کی کہ اس تکلیف اور مصیبت کو خدا ان سے ہر طرف کمر دے تو ایمان لے آئیں گے لیکن وہ کبھی ایمان نہیں لائے۔

مندرجہ بالا واقعہ ضمنی طور پر نشان دہی کرتا ہے کہ آگاہ اور دلسوز رہبر کا وجود ایک قوم کے درمیان کس قدر موثر اور حیات بخش ہے جب کہ وہ عابد جو کافی علم نہ رکھتا ہو وہ زیادہ سختی اور خشونت ہی کا سہارا لیتا ہے۔ عدم آگہی سے عبادت اور علم جو اس ذمہ داری کے ساتھ ہو میں اسلام جس کا فرق قائل ہے، اس کی منطق بھی اس روایت سے سمجھ میں آتی ہے۔

آیات ۹۹، ۱۰۰

۹۹۔ ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلَّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾۔

۱۰۰۔ ﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَجْعَلُ الرَّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ﴾۔

ترجمہ

۹۹۔ اور اگر تیرا پروردگار چاہتا تو روئے زمین کے تمام رہنے والے (جبری طور پر) ایمان لے آتے۔ کیا تو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایمان لے آئیں (جبری ایمان کا کیا فائدہ ہے)۔
۱۰۰۔ (لیکن) کوئی شخص خدا کے (اس کی توفیق، مدد اور ہدایت) کے بغیر ایمان نہیں لاسکتا اور (کفر و گناہ کی) کی ناپاکی وہ ان کے لئے قرار دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

جبری ایمان بے کار ہے

گزشتہ آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ اضطراری ایمان کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسی بناء پر زیر بحث پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: اگر اضطراری اور اجباری ایمان کا کوئی فائدہ ہوتا اور تیرا پروردگار چاہتا تو روئے زمین کے تمام لوگ ایمان لے آتے ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلَّهُمْ جَمِيعًا﴾۔

لہذا ان میں سے ایک گروہ کے ایمان نہ لانے سے دلگیر اور پریشان نہ ہو۔ ارادہ و اختیار کی بنیادی آزادی کا لازمہ ہے کہ کچھ لوگ مومن ہوں گے اور کچھ غیر مومن ”ان حالات میں تو چاہتا ہے کہ لوگوں کو ایمان لانے کے لئے مجبور کرے“ ﴿أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾۔

آیت اس تہمت کی دوبارہ نفی کرتی ہے جو اسلام کے دشمن بارہا لگاتے رہے ہیں اور لگاتے رہتے ہیں اور وہ یہ کہ اسلام تلوار کا دین ہے اور زبردستی اور جبری طور پر دنیا کے لوگوں پر ٹھونسنا جاتا ہے۔

زیر بحث آیت قرآن کی دیگر بہت سی آیات کی طرح کہتی ہے کہ جبری ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور اصولی دین و ایمان ایسی چیز ہے جو روح کے اندر سے اٹھے نہ کہ باہر سے اور تلوار کے ذریعے سے ہو، خصوصاً خدا تعالیٰ پیغمبر اسلام کو ایمان و اسلام کے لئے لوگوں پر جبر و اکراہ کرنے سے ڈر رہا ہے اور منع کر رہا ہے اس کے باوجود بعد والی آیت میں اس حقیقت کی یاد دہانی کروائی گئی ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ انسان مختار اور آزاد ہے پھر بھی جب تک لطفِ الہی اور حکم پر وردگار شامل حال نہ ہو تو کوئی شخص ایمان نہیں لاتا ﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾۔ لہذا وہ جہالت اور بے

عقلی کی راہ میں قدم رکھتے ہیں اور اپنی عقل و خرد کے سرمائے سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار نہیں خدا ان کے لئے رجس اور ناپاکی قرار دیتا ہے اس طرح سے کہ انھیں ایمان کی توفیق نہیں ہوتی ﴿وَيَجْعَلُ الرَّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ﴾۔

دو قابل توجہ نکات

۱۔ ایک وضاحت:

ہو سکتا ہے کہ ابتدائی نظر سے یوں معلوم ہو کہ پہلی اور دوسری آیت آپس میں ایک دوسرے کی نفی کرتی ہیں۔ کیونکہ پہلی آیت کہتی ہے کہ خدا کسی کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کرتا جبکہ دوسری آیت کہتی ہے کہ جب تک پروردگار کا فرمان اور ارادہ نہ ہو کوئی شخص ایمان نہیں لاتا۔

ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے ظاہری اختلاف برطرف ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ ہم عقیدہ رکھتے ہیں کہ نہ ”جبر“ صحیح ہے اور نہ ہی ”تفویض“ درست ہے یعنی نہ اس طرح ہے کہ لوگ اپنے افعال میں مجبور اور بے اختیار ہیں اور نہ اس طرح ہے کہ وہ تمام معنی میں اور ہر لحاظ سے اپنے حالت میں آزاد ہیں بلکہ ارادے کی آزادی ہوتے ہوئے بھی وہ خدائی امداد کے محتاج ہیں کیونکہ ارادے کی یہ آزادی خدا دیتا ہے عقل اور وجدان پاک اس انعامات اور عنایات میں سے ہے ، انبیاء کی راہنمائی اور کتب آسمانی کی ہدایت بھی اس جانب سے ہے۔ اس بناء پر ارادے کی آزادی کے باوجود اس نعمت و عنایت کا سرچشمہ اور اس کا ماحصہ سبھی خدا کی طرف سے ہے (غور کیجئے گا)۔

۲۔ ایک اشکام اور اس کی توضیح:

آخری آیت آخری جملہ ”﴿وَيَجْعَلُ الرَّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ﴾“ ہرگز جبر کی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ ”لا یعقلون“ ان کے اختیار کی دلیل ہے یعنی پہلے افراد تعقل و تفکر اور غور و فکر سے منہ موڑ لیتے ہیں جس کے انجام کے طور پر اس عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ رجس، شک و تردد کی ناپاکی، دل کی تاریکی اور غلط نظر ان پر غالب آجاتی ہے۔ یہاں تک کہ قوت ایمان ان سے سلب ہو جاتی ہے۔ لیکن توجہ رہے کہ اس کے مقدمات خود انھوں نے فراہم کئے ہیں۔ درحقیقت ایسے مواقع پر ایمان کے لئے اللہ کا اذن اور فرمان نہیں ہوتا۔

دوسرے لفظوں میں یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا کا اذن اور فرمان بلاوجہ اور بغیر کسی حساب کتاب کے نہیں ہے جو اس لائق ہیں ان کے لئے ہو گا اور جو اس کے لائق نہیں وہ اس سے محروم رہیں گے۔

آیات ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳

۱۰۱۔ ﴿قُلْ انظُرُوا مَاذَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا تُغْنِي الْآيَاتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ﴾۔

۱۰۲۔ ﴿فَهَلْ يَنْتَظِرُونَ إِلَّا مِثْلَ أَيَّامِ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ قُلْ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ﴾۔

۱۰۳۔ ﴿ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا كَذَلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنَجِّ الْمُؤْمِنِينَ﴾۔

ترجمہ

۱۰۱۔ کہہ دو: دیکھو! ان (خدا کی آیات اور توحید کی نشانیوں) کو جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہی لیکن یہ نشانیاں

اور تنبیہیں ان لوگوں کے لئے مفید نہیں ہوگی جو ایمان نہیں لائے (اور ہٹ دھرم ہیں)۔

۱۰۲۔ کیا یہ گزشتہ لوگوں کے سے دنوں (اور ویسی بلاؤں، مصیبتوں اور سزاؤں) کا انتظار کرتے ہیں کہہ دو: تم انتظار

کر، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کروں گا۔

۱۰۳۔ پھر (نزول اور سزا و عذاب کے وقت) ہم اپنے رسولوں کو اور ان پر ایمان لانے والوں کو نجات دیتے تھے اور

اس طرح ہم پر حق ہے کہ (تجھ پر) ایمان لانے والوں کو نجات بخشیں۔

تربیت اور وعظ و نصیحت

گزشتہ آیات میں اس بارے میں گفتگو تھی کہ ایمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اختیاری ہو نہ کہ اضطراری اور اجباری

۔ اسی مناسبت سے زیر نظر پہلی آیت میں اختیاری ایمان کے حصول کا راستہ بتایا گیا ہے اور پیغمبر اکرم سے فرمایا گیا

ہے: ان سے کہہ دو: صحیح طور پر غور و فکر کر لیں اور آسمان و زمین میں دیکھیں کہ کیسا عجیب و غریب اور حیرت انگیز

نظام ہے کہ جس کا ہر گوشہ پیدا کرنے والے کی عظمت۔ قدرت، علم اور حکمت کی دین میں ہے ﴿قُلْ انظُرُوا مَاذَا فِي

السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾۔ یہ سب درخشان ستارے اور مختلف آسمانی کرات کہ جن میں سے ہر ایک اپنے محور اور مدار میں

گردش کر رہا ہے، یہ عظیم نظام ہائے شمسی اور یہ غول پیکر کہکشائیں اور ان پر کار فرما ایک دقیق، نظام، اسی طرح یہ کمرہ

زمین اپنے تمام عجائب و اسرار کے ساتھ اور یہ سب طرح کے زندہ موجودات ان سب کی ساخت پر داخست میں غور کرو

اور ان کے مطالعہ سے جہاں، ہستی کے مبداء و موجد سے زیادہ آشنائی پیدا کرو اور اس سے زیادہ قریب ہو جاؤ۔

یہ جملہ وضاحت کے ساتھ جبر اور سلب اختیار کی نفی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ایمان جہان آفرینش کے مطالعے کا نتیجہ

ہے یعنی یہ کام خود تمہارے ہی ہاتھ میں ہے۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: لیکن ان سب آیات اور نشانیوں کے باوجود تعجب کا مقام نہیں کہ ایک گروہ ایمان نہ لائے کیونکہ آیات، نشانیاں، کے المارم، ڈرانے کے اسباب صرف ان لوگوں کے کام آتے ہیں جو حق کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن جنہوں نے پختہ ارادہ کر لیا ہے ہرگز ایمان نہیں لائیں گے ان پر ان امور کا کوئی اثر نہیں ہوتا ﴿وَمَا

تُغْنِي الْآيَاتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ - (۱)

لفظ ”ما“ کو ”ما تغنی الایات“ میں بعض علماء ماء نافیہ سمجھتے ہیں، بعض استفہام انکاری، نتیجہ کے لحاظ سے دونوں ایک ہی ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ ماء نافیہ ہونا چاہیے۔

یہ جملہ ایک حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو بارہا قرآن میں آئی اور وہ یہ کہ دلائل، حق باتیں، و نصائح تنہا کافی نہیں ہیں بلکہ مہیا اور آمادہ اسباب بھی نتیجہ حاصل کرنے کی شرط ہیں۔

اس کے بعد قرآن تہدید آمیز لہجے میں لیکن سوال کے انداز میں کہتا ہے کیا یہ ہٹ دھرم اور بے ایمان لوگ سوائے اس کے کوئی توقع رکھتے ہیں کہ جو انجام گزشتہ سرکش قوموں کا ہوا تھا اور جو دردناک خدائی عذاب میں گرفتار ہوئے تھے، اس سے دوچار ہوں۔ جیسا کہ انجام، فراعنہ نمرود، شداد اور ان کے اعوان و انصار کا ہوا

﴿فَهَلْ يَنْتَظِرُونَ إِلَّا مِثْلَ أَيَّامِ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ -

آیت کے آخر میں انہیں خطرے سے خبردار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ”اے پیغمبر! ان سے کہہ دو: اب جبکہ تم اس راستے پر چل رہے ہو اور تجدید نظر کے لئے تیار نہیں ہو تو تم انتظار میں رہو اور ہم تمہارے برے اور دردناک انجام کے انتظار میں ہیں جیسا کہ انجام گزشتہ مستکبر قوموں کا ہوا ﴿قُلْ فَأَنْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظَرِينَ﴾ -

توجہ رہے کہ ”فهل ينظرون“ میں استفہام انکاری ہے یعنی ان کا طرز عمل ہی ایسا ہے کہ گویا وہ ایک برے انجام کے پہنچنے کے علاوہ کسی کا انتظار نہیں کر رہے۔

لفظ ”ایام“ اگرچہ لغت میں ”یوم“ کی جمع ہے جس کا معنی ہے دن لیکن دردناک حوادث کے معنی میں ہے، کہ جو گزشتہ اقوام کی زندگی میں واقع ہوئے۔

اس کے بعد اس بناء پر کہ یہ تو ہم نہ ہو کہ خدا سزا دیتے وقت خشک کے ساتھ ترکو بھی جلا دیتا ہے یہاں تک کہ ایک مومن جو کسی بڑے سرکش باغی گروہ میں ہو اسے نظر انداز کر دیتا ہے مزید فرمایا گیا ہے: گزشتہ اقوام کے عذاب کے اسباب فراہم ہونے کے بعد ہم اپنے رسولوں اور ان لوگوں پر ایمان لائے نجات دیتے رہے

﴿ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾۔

آخر میں فرمایا گیا ہے کہ یہ چیز گزشتہ اقوام، رسل اور مومنین کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ ہم اس طرح تجھے اور تجھ پر ایمان لانے والوں کو نجات دیں گے اور یہ ہم پر حق ہے ایک مسلم اور تخلف ناپذیر حق ﴿كَذَلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنَجِّ

الْمُؤْمِنِينَ﴾۔ (۲)

۱۔ ”نذر“ نذر کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے ڈرانے والا۔ یہ انبیاء اور خدائی راہنماؤں کے لئے کنایہ ہے یا پھر یہ انذار کی جمع ہے۔ یعنی غافلین اور مجرّمین کو ڈرانا دھمکانا جو ان بادیان الہی کا پروگرام ہے۔

۲۔ ”كَذَلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنَجِّ الْمُؤْمِنِينَ“ کا جملہ معنوی لحاظ سے تھا: ”كَذَلِكَ نُنَجِّ الْمُؤْمِنِينَ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا“ یعنی جملہ ”حَقًّا عَلَيْنَا“ ایک جملہ معترضہ ہے کہ جو ”كَذَلِكَ“ اور ”نُنَجِّ الْمُؤْمِنِينَ“ کے درمیان آیا ہے یہ احتمال بھی ہے کہ ”كَذَلِكَ“ کا تعلق گزشتہ جملے سے ہو یعنی ”نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا“۔

آیات ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷

۱۰۴۔ ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْ دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾۔

۱۰۵۔ ﴿وَأَنْ أَقِمَّ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾۔

۱۰۶۔ ﴿وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذَا مِنَ الظَّالِمِينَ﴾۔

۱۰۷۔ ﴿وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ يُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾

ترجمہ

۱۰۴۔ کہہ دو! اے لوگو! اگر میرے دین اور عقیدے کے بارے میں تمہیں شک ہے تو میں ان کی پرستش نہیں کرتا کہ خدا کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو، میں صرف خدا کی عبادت کرتا ہوں کہ جو تمہیں مارے گا اور مجھے حکم دیا گیا اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنین میں سے ہوں۔

۱۰۵۔ اور (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ) اپنا رخم اس دین کے طرف کمر کہ جو ہر قسم کے شرک سے خالی ہے اور مشرکین میں سے نہ ہو۔

۱۰۶۔ اور سوائے خدا کے کسی چیز کو نہ پیکار کہ جو نہ نفع دے سکتی ہے اور نہ نقصان۔ اگر ایسا کرو گے تو ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

۱۰۷۔ اور اگر خدا (امتحان کے لئے یا گناہ کی سزا کے طور پر) تجھے کوئی نقصان پہنچائے تو اس کے علاوہ کوئی اسے بر طرف نہیں کر سکتا اور اگر وہ تیرے لئے بھلائی کا راہ کرے تو کوئی بھی اس کے فضل کو نہیں روک سکتا اپنے بندوں میں سے جسے چاہے نوازتا ہے اور وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

مشرکین کے بارے میں حتمی فیصلہ

یہ آیات اور بعد کی چند آیات سب کی سب توحید سے مربوط شرک کے خلاف جنگ اور حق کی طرف دعوت دینے کے بارے میں ہیں۔ یہ آیات اس سورہ کی آخری آیات میں سے ہیں اور درحقیقت یہ اس سورہ کی توحیدی مباحث کی فہرست یا خلاصہ ہیں اور بت پرستی کے خلاف جنگ کے لئے تاکید ہیں، جس کا ذکر اس سورہ میں بارہا آیا ہے۔

آیات کا لب و لہجہ نشاندہی کرتا ہے کہ مشرکین بعض اوقات اس وہم میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ پیغمبر اپنے عقائد میں بتوں کے بارے میں نرمی سے کام لیں، کسی طرح سے انھیں قبول کرنے کے قائل ہو جائیں اور خدا کے عقیدہ کے ساتھ کسی طرح سے انھیں بھی تسلیم کر لیں۔ قرآن اس قدر حتمی اور قطعی فیصلے کے ساتھ کہ جتنا فرض کیا جاسکتا ہے اس بنیاد تو ہم کو ختم کرتا ہے اور ان کی فکر کو ہمیشہ کے لئے راحت پہنچاتا ہے کہ بتوں کے بارے میں کسی قسم کی صلح اور نرمی کا کوئی معنی نہیں ہے اور اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں ہے۔ صرف اللہ، نہ ایک لفظ کم نہ ایک لفظ زیادہ۔

پہلے پیغمبر اکرم کو حکم دیا گیا ہے کہ تمام لوگوں کو مخاطب کر کے: ”کہہ دو! اے لوگو! تم میرے عقیدے کے بارے میں کوئی شک و تردد رکھتے ہو تو آگاہ رہو کہ میں ان کی کبھی عبادت قبول نہیں کروں گا جن کی خدا نے علاوہ تم عبادت کرتے ہو ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْ دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾۔

صرف ان کے معبودوں کی نفی پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ مزید تاکید کے لئے ہر قسم کی عبادت خدا کے لئے ثابت کرتے ہوئے بات جاری ہے: لیکن میں ایسے خدا کی عبادت کرتا ہوں کہ جو تمہیں موت دے گا ﴿وَلَكِنْ أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ﴾۔

پھر تاکید مزید ہے: یہ صرف میری چاہت نہیں ہے بلکہ ”یہ خدا کا فرمان ہے جو اس نے مجھے دیا ہے کہ میں اللہ پر ایمان لانے والوں میں سے رہوں“ ﴿وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾۔

یہ جو خدا کی صفات میں سے صرف قبض روح اور مارنے کا ذکر ہوا ہے تو یہ یا تو اس بناء پر ہے کہ انسان جس چیز پر چاہے شک کرے لیکن وہ موت پر شک نہیں کر سکتا اور یا اس وجہ سے ہے کہ انھیں سزا اور ہلاکت خیز عذاب کی طرف متوجہ کیا جائے کہ جس کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے۔ اس طرح سے پھر یہ کنایہ خدا کے غضب کی ایک دھمکی ہے۔

شرک و بت پرستی کی نفی کے بارے میں اپنا عقیدہ قطعی طور پر بیان کرنے کے بعد اب اس کے لئے دو دلیلیں پیش کی گئی ہیں ایک دلیل فطرت کے حوالے سے ہے اور دوسری عقل و خرد کے حوالے سے۔

”کہہ دو: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اپنا رخ مستقیم اور سیدھے دین کی طرف رکھو کہ جو ہر لحاظ سے خالص اور پاک ہو ﴿وَأَنْ أَقِمَّ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا﴾۔

یہاں بھی صرف اثباتی پہلو پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ تاکید کے لئے نفی کا پہلو بھی بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: اور ہرگز مشرکین میں سے نہ ہونا ﴿وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے ”حنیف“ اس شخص کو کہتے ہیں جو انحراف اور ٹیڑھے پن سے راستی، استقامت اور سیدھے پن کی طرف جھکے یا دوسرے لفظوں میں انحراف اور ٹیڑھے دینوں اور طور طریقوں سے آنکھیں بند کر لے اور خدا کے سیدھے اور مستقیم دین کی طرف متوجہ ہو وہی دین جو فطرت کے مطابق ہے اور فطرت سے اسی مطابقت کی وجہ سے صاف ستھرا اور مستقیم ہے، اس بناء پر توحید کے فطری ہونے کی طرف اشارہ اس میں پنہاں ہے کیونکہ انحراف وہ چیز ہے جو فطرت کے خلاف ہو (غور کیجئے گا)۔

فطرت کے راستے شرک کے بطلان کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ایک واضح عقلی دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا گیا ہے کہ ”خدا کو چھوڑ کر ان چیزوں کی عبادت نہ کر جو نہ فائدہ پہنچا سکتی ہیں اور نہ نقصان۔ کیونکہ اگر تو نے ایسا کام کیا تو ظالموں میں سے ہو جائے گا“ اپنے اوپر ظلم کرے گا اور اس معاشرے پر بھی جس سے تیرا تعلق ہے۔ ﴿وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذَا مِنَ الظَّالِمِينَ﴾۔

کون سی عقل اجازت دیتی ہے کہ انسان ایسی چیزوں اور موجودات کی عبادت کرے کہ جو کسی قسم کا فائدہ اور نقصان نہیں پہنچا سکتیں اور انسانی تقدیر میں جن کا تھوڑا سا بھی اثر نہیں ہے۔

یہاں بھی صرف نفی کے پہلو پر بس نہیں کیا گئی بلکہ مثبت پہلو کے حوالے سے ارشاد ہوتا ہے: اگر تمہیں خدا کی طرف سے ناراحتی اور نقصان پہنچے (چاہے سزا کے طور پر)، اس کے علاوہ کوئی بھی اسے ہر طرف نہیں کر سکتا ﴿وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ﴾۔ اسی طرح ”اگر خدا چاہے کہ تجھے بھلائی پہنچے تو کوئی بھی اس کے فضل و رحمت کو روک نہیں سکتا“ ﴿وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ﴾۔

”وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے (اور اہل سمجھے) خیر اور نیکی تک پہنچاتا ہے ﴿يُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ﴾۔ کیونکہ اس کی بخشش اور رحمت سب پر محیط ہے اور وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے ﴿وَهُوَ الْعَفُورُ الرَّحِيمُ﴾۔

آیات ۱۰۸، ۱۰۹

۱۰۸۔ ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّٰ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ﴾۔

۱۰۹۔ ﴿وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَخُذَكَ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ﴾۔

ترجمہ

۱۰۸۔ کہہ دو: اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے حق تمہاری جانب آیا ہے (اس کے زیر سایہ) ہدایت یافتہ اپنے لئے ہدایت پاتا ہے اور جو شخص گمراہ ہو جائے تو وہ اپنے نقصان میں گمراہ ہوا ہے اور میں تم پر (مجبور کرنے کے لئے) مامور نہیں ہوں۔

۱۰۹۔ اور جو کچھ تم پر وحی ہوتی ہے اس کی پیروی کرو اور صبر کرو (اور استقامت دکھا) تاکہ خدا (کامیابی کا) حکم صادر کرے اور وہ بہترین حکم کرنے والا ہے۔

آخری بات

ان دو آیات میں سے ایک تو تمام لوگوں کے لئے پسند و نصیحت ہے اور دوسری پیغمبر اکرم کے لئے مخصوص ہے یہ آیات ان احکام کی تکمیل کرتی ہیں جو اس پوری سورت میں بیان ہوئے اور یہیں پر سورہ یونس اختتام کو پہنچتی ہے۔ پہلے ایک عمومی حکم کے طور پر فرمایا گیا ہے: تمام لوگوں سے کہہ دو کہ تمہارے پروردگار کی جانب سے حق تمہاری جانب آیا ہے۔ یہ تعلیمات، یہ آسمانی کتاب، یہ پرگرام اور یہ پیغمبر سب حق ہیں اور ان کے حق ہونے کی نشانیاں واضح ہیں ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ﴾۔ اور اس حقیقت کی طرف توجہ کرتے ہوئے ”جو شخص اس حق کے زیر سایہ ہدایت حاصل کرے اس نے اپنے فائدے کی طرف ہدایت پائی ہے اور جو شخص اس کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرتے ہوئے منتخب کرے اس نے اپنے نقصان میں قدم اٹھایا ہے ﴿فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّٰ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا﴾۔ اور میں تمہارا مامور، وکیل اور نگہبان نہیں ہوں ﴿وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ﴾۔

یعنی یہ میری ذمہ داری نہیں ہے کہ تمہیں حق قبول کرنے پر مجبور کروں کیونکہ حق قبول کرنے کے لئے مجبور کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ ہی اگر تم نے حق قبول نہ کیا تو تمہیں خدائی عذاب سے محفوظ رکھ سکتا ہوں بلکہ میری ذمہ داری تو

دعوت دینا، تبلیغ کرنا، رشد و ہدایت کرنا اور رہبری کرنا ہے اور باقی امور خود تمہارے ذمہ ہیں کہ تم اپنے اختیار سے اپنی راہ منتخب کرو۔

یہ آیت دوبارہ مسئلہ اختیار اور ارادے کی آزادی کا ذکر کرنے کے علاوہ اس امر پر تاکید کرتی ہے کہ حق کو قبول کرنا پہلے مرحلے میں خود انسان کے لئے فائدے میں ہے جیسا کہ اس کی مخالفت کرنا بھی خود اسی کے نقصان میں ہے۔
در حقیقت خدائی بہروں کی تعلیمات اور آسمانی کتب انسانوں کی تربیت، تکامل اور ارتقاء کی کلاسیں ہیں نہ ان کی موافقت کرنا عظمت الہی میں اضافے کا باعث ہے اور نہ ہی ان کی مخالفت سے اس کے جلال میں کوئی کمی آتی ہے۔
اس کے بعد پیغمبر کی ذمہ داری کا تعین دو جملوں میں کیا گیا ہے۔ پہلا یہ کہ جو کچھ تم پر وحی ہوتی ہے تجھے صرف اس کی پیروی کرنا چاہیے ﴿وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ﴾۔ تیرا راستہ خدا نے وحی کے ذریعے معین کیا ہے اور تو نے اس سے معمولی سے انحراف کا بھی مجاز نہیں۔

دوسرا یہ کہ اس راستے میں تجھے طاقت فرسا مشکلات، بہت زیادہ ناراحتیاں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا لہذا انہوہ مشکلات میں تجھے چاہیے کہ خوف و ہراس کو اپنے قریب نہ آنے دے۔ صبر، استقامت اور مردی اختیار کر۔ یہاں تک کہ خدا دشمنوں پر تیری فتح و کامرانی کا حکم صادر کرے ﴿وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَخْضَمَ اللَّهُ﴾۔ کیونکہ وہ بہترین حکم کرنے والا ہے۔ اس کا فرمان حق ہے، اس کا حکم عدل ہے اور اس کے وعدے کی خلاف ورزی نہیں ہوتی ﴿وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ﴾۔
پروردگار! تیرے بندے جو تیری راہ میں جہاد کرتے ہیں۔

وہ جہاد جس میں خلوص اور ایمان کا رفا ہے۔

تیرے بندے جو تیری راہ میں صبر، استقامت اور پامردی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

تو نے ان سے کامیابی اور فتح و نصرت کا وعدہ کیا ہے۔

خداوند! ان لمحات میں اور حکومت اسلامی کی تشکیل کے مرحلے میں بہت زیادہ مشکلات نے ہمیں گھیر رکھا ہے اور رہم تیری توفیق و عنایت سے جہاد اور استقامت سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔

بار الہا! تو بھی اپنے لطف و کرم سے مشکلات کے سیاہ بادل برطرف کر دے اور ہمیں حق و عدالت کی حیات بخش شعاعوں سے نواز۔

آمین یا رب العالمین۔

فہرست

۳	 مصارفِ زکوٰۃ اور اس کی تفصیلات
۶	 چند اہم نکات
۶	۱۔ ”فقیر“ اور ”مسکین“ میں فرق :.....
۷	۲۔ کیا زکوٰۃ آٹھ حصوں میں برابر تقسیم کی جائے گی؟.....
۸	۳۔ زکوٰۃ کس وقت وجب ہوئی تھی؟.....
۸	۴۔ ”﴿مَوْلَۃٌ قَلْبِہُمْ﴾“ سے مراد کون لوگ ہیں؟.....
۹	۵۔ اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت اور اثر:-.....
۱۲	 آیت ۶۱
۱۲	 یہ خوبی ہے عیب نہیں
۱۲	 تفسیر
۱۶	 آیات ۶۲، ۶۳
۱۶	 شانِ نزول
۱۶	 منافقین کی ایک نشانی
۱۹	 آیات ۶۳، ۶۵، ۶۶
۱۹	 شانِ نزول
۲۰	 منافقین کا خطرناک پرگرام
۲۳	 آیات ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰
۲۵	 منافقوں کی نشانیاں

آیات ۴۱، ۴۲.....	۳۰
سچے مومنوں کی نشانیاں.....	۳۰
آیت ۴۳.....	۳۵
کافروں اور منافقوں سے جنگ.....	۳۵
آیت ۴۳.....	۳۶
شانِ نزول.....	۳۶
خطرناک سازش.....	۳۹
آیات ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸.....	۳۲
شانِ نزول.....	۳۲
منافق کم ظرف ہوتے ہیں.....	۳۳
چند اہم نکات.....	۳۳
آیات ۴۹، ۵۰.....	۳۸
شانِ نزول.....	۳۸
منافقین کی ایک اور غلط حرکت.....	۵۰
چند اہم نکات.....	۵۱
۱۔ کام کی اہمیت کیفیت سے ہے کمیت سے نہیں :-.....	۵۱
۲۔ منافقین کی صفات ہر دور میں ایک جیسی ہیں :-.....	۵۲
۳۔ ”﴿سخر الله منهم﴾“ کا مفہوم :-.....	۵۲
۴۔ ”سبعین“ سے مراد :-.....	۵۲
آیات ۸۱، ۸۲، ۸۳.....	۵۵

۵۵	 منافقین کی ایک اور غلط حرکت
۵۸	 چند توجہ طلب نکات
۵۸	 ۱۔ دوسرے جہاد میں شرکت کی حقیقت:
۵۸	 ۲۔ لفظ ”خالف“ کا مفہوم:
۵۸	 ۳۔ دور حاضر میں ہماری ذمہ داری اور منافقین کی روش:
۵۹	 آیات ۸۳، ۸۵
۵۹	 منافقین کے بارے میں زیادہ اقدام
۶۱	 چند قابل توجہ نکات
۶۱	 ۱۔ شان نزول کی اختلافی روایات:
۶۲	 ۲۔ مومنین کی قبروں کے پاس کھڑے ہونا اور دعا کرنا:
۶۳	 آیات ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹
۶۳	 پست ہمت افراد اور سچے مومنین
۶۶	 آیت ۹۰
۶۶	 تفسیر
۶۸	 آیات ۹۱، ۹۲، ۹۳
۶۸	 شان نزول
۶۹	 وہ معذور جو عشق جہاد میں آنسو بہاتے تھے
۷۳	 چند قابل توجہ نکات
۷۳	 ۱۔ مجاہدین کا جذبہ و شہادت:
۷۳	 ۲۔ جہا کے کئی مراحل ہیں:

۴۳	۳۔ ایک وسیع قانون کا سرچشمہ:
۷۵	آیات ۹۳، ۹۵، ۹۶
۷۵	شانِ نزول
۷۶	تفسیر
۷۹	آیات ۹۷، ۹۸، ۹۹
۷۹	سنگِ دل اور صاحبِ ایمانِ بادیہ نشین
۸۳	چند اہم نکات
۸۳	۱۔ آبادی کے بڑے مراکز:
۸۳	۲۔ بادیہ نشین شہری:
۸۳	۳۔ قربِ الہی کا مفہوم:
۸۵	آیت ۱۰۰
۸۵	سابقینِ اسلام
۸۷	چند اہم نکات
۸۷	۱۔ سابقین کا مرتبہ اور اہمیت:
۸۷	۲۔ تابعین کون لوگ تھے؟:
۸۸	۳۔ پہلا مسلمان کون تھا؟:
۹۱	۴۔ کیا تمام صحابہ نیک اور صالح تھے؟:
۹۵	آیت ۱۰۱
۹۵	تفسیر
۹۸	آیت ۱۰۲

- ۹۸ شانِ نزول
- ۱۰۰ توبہ کرنے والے
- ۱۰۱ آیات ۱۰۵، ۱۰۳، ۱۰۳
- ۱۰۱ زکوٰۃ فرد اور معاشرے کو پاک کرتی ہے
- ۱۰۲ چند اہم نکات
- ۱۰۲ ۱۔ قبول کی گئی زکوٰۃ:
- ۱۰۳ ۲۔ ”خذ“ کا مفہوم:
- ۱۰۳ ۳۔ ”صل علیہم“ کے حکم کی عمومیت:
- ۱۰۸ ایک اور گروہ فرمانِ خدا سے نکل گیا۔
- ۱۱۲ آیت ۱۰۶
- ۱۱۲ شانِ نزول
- ۱۱۲ تفسیر
- ۱۱۳ ایک سوال اور اس کا جواب
- ۱۱۵ آیات ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷
- ۱۱۶ شانِ نزول
- ۱۱۹ مسجد کے روپ میں بت خانہ
- ۱۲۳ چند اہم نکات
- ۱۲۳ ۱۔ عظیم درس:
- ۱۲۵ ۲۔ صرف نفی کافی نہیں:
- ۱۲۶ ۳۔ دو بنیادی شرطیں:

آیات ۱۱۱، ۱۱۲.....	۱۲۷
ایک بے مثال تجارت.....	۱۲۷
آیات ۱۱۳، ۱۱۴.....	۱۳۳
شان نزول.....	۱۳۳
دشمنوں سے لا تعلقی ضروری ہے.....	۱۳۳
چند اہم نکات.....	۱۳۵
۱۔ ایک جعلی روایت :.....	۱۳۵
۲۔ حضرت ابراہیم ؑ نے آزر سے استغفار کا وعدہ کیوں کیا؟.....	۱۳۸
۳۔ دشمنوں سے ہر قسم کا تعلق توڑ لینا چاہیے :.....	۱۳۹
آیات ۱۱۵، ۱۱۶.....	۱۴۰
شان نزول.....	۱۴۰
واضح حکم کے بعد سزا.....	۱۴۱
ایک سوال اور اس کا جواب.....	۱۴۲
آیات ۱۱۷، ۱۱۸.....	۱۴۳
شان نزول.....	۱۴۳
ایک عظیم درس.....	۱۴۳
گنہ گاروں کے لئے معاشرتی دباو.....	۱۴۶
چند اہم نکات.....	۱۴۸
۱۔ ﴿تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ﴾ سے کیا مراد ہے؟ :.....	۱۴۸
۲۔ جنگ تبوک کو ”ساعة العسرة“ کیوں کہا گیا؟ :.....	۱۴۹

- ۳۔ تین افراد کے لئے ”خلفوا“ کی تعبیر: ۱۵۰
- ۴۔ ایک دائمی اور عظیم سبق: ۱۵۰
- ۵۔ جنگ تبوک سے مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی: ۱۵۱
- آیت ۱۱۹ ۱۵۳
- سچوں کا ساتھ دو ۱۵۳
- کیا صادقین سے مراد صرف معصومین ہیں؟ ۱۵۵
- آیات ۱۲۰، ۱۲۱ ۱۵۹
- مجاہدین کو مشکلات پر جزا ضرور ملے گی ۱۵۹
- چند قابل توجہ نکات ۱۶۱
- ۱۔ ﴿لَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوِّ نِيْلًا﴾ کا مفہوم: ۱۶۱
- ۲۔ ﴿اَحْسَنَ مَآكِنًا يَّعْلُونَ﴾ سے کیا مراد ہے؟ ۱۶۱
- ۳۔ یہ آیت ہر دور کے مسلمانوں کے لئے ہے: ۱۶۱
- آیت ۱۲۲ ۱۶۳
- شان نزول ۱۶۳
- جہالت اور دشمن کے خلاف جہاد ۱۶۳
- چند قابل توجہ امور ۱۶۳
- ۱۔ آیت کی تفسیر میں مختلف احتمالات: ۱۶۳
- ۲۔ ایک اشکال اور اس کا جواب: ۱۶۵
- ۳۔ ”تفقه فی الدین“ کا وسیع مفہوم: ۱۶۵
- ۴۔ اجتہاد اور تقلید کے جواز پر استدلال: ۱۶۶

آیت ۱۲۳.....	۱۶۹
قریب کے دشمن کی خبر.....	۱۶۹
آیات ۱۲۳، ۱۲۵.....	۱۷۲
آیات قرآنی کی تاثیر۔ پاک اور ناپاک دلوں پر.....	۱۷۲
چند قابل توجہ نکات.....	۱۷۳
۱۔ قرآنی آیا کے مختلف لوگوں پر مختلف اثرات:.....	۱۷۳
۲۔ ”رجس“ کا مفہوم:.....	۱۷۳
۳۔ ”﴿وہم یستبشرون﴾“ کا مطلب:.....	۱۷۳
۴۔ دل کی بیماری:.....	۱۷۳
۵۔ ایک درس:.....	۱۷۳
آیات ۱۲۶، ۱۲۷.....	۱۷۶
تفسیر.....	۱۷۶
آیات ۱۲۸، ۱۲۹.....	۱۷۹
نازل ہونے والی آخری آیات.....	۱۷۹
سورہ یونس.....	۱۸۳
اس سورہ کے مضامین اور فضیلت.....	۱۸۳
آیات ۱، ۲.....	۱۸۵
تفسیر.....	۱۸۵
آیات ۳، ۴.....	۱۸۸
خدا شناسی اور قیامت.....	۱۸۸

۱۹۱	دو قابل توجہ نکات
۱۹۱	۱۔ ”الیہ مرجعکم جیمعا“ کا مفہوم:
۱۹۲	۲۔ ”قسط“ کا مفہوم:
۱۹۳	آیات ۵، ۶
۱۹۳	عظمت الہی کی نشانیاں
۱۹۶	چند اہم نکات
۱۹۶	۱۔ ضیا اور نور میں فرق:
۱۹۶	۲۔ ”ضیاء“ جمع ہے یا مفرد:
۱۹۷	۳۔ ”قدرہ منازل“ کی ضمیر:
۱۹۸	۴۔ رات دن کا آنا جانا:
۱۹۸	۵۔ تقویم اور تاریخ کا مسئلہ:
۲۰۱	آیات ۷، ۸، ۹، ۱۰
۲۰۱	جنتی اور دوزخی
۲۰۳	چند اہم نکات
۲۰۳	۱۔ پروردگار سے ملاقات:
۲۰۳	۲۔ ﴿یہدیہم ربہم بإیمانہم﴾ کے بارے میں کچھ گفتگو:
۲۰۳	۳۔ ﴿تجری من تحتہم الانہار﴾ کا مفہوم:
۲۰۶	آیات ۱۱، ۱۲
۲۰۶	خود غرض انسان
۲۰۸	انسان قرآن کریم کی نظر میں

- آیات ۱۳، ۱۴ ۲۱۱
- پہلے ظالم اور تم ۲۱۱
- چند قابل توجہ نکات ۲۱۱
- ۱۔ ”قرون“ کا مطلب : ۲۱۱
- ۲۔ قوموں کی بربادی کی وجہ ؟ ۲۱۲
- ۳۔ ”﴿وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا﴾“ کا مفہوم : ۲۱۲
- ۴۔ ”﴿لَنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْلَمُونَ﴾“ کا مطلب : ۲۱۲
- آیات ۱۵، ۱۶، ۱۷ ۲۱۳
- شان نزول ۲۱۳
- تفسیر ۲۱۳
- چند اہم نکات ۲۱۵
- ۱۔ مشرکین کی دو متبادل خواہشوں میں فرق : ۲۱۵
- ۲۔ پیغمبر اکرم کے جواب پر ایک نظر : ۲۱۵
- ۳۔ ایک اشکال اور اس کی وضاحت : ۲۱۶
- ۴۔ سب سے زیادہ ظالم کون ہے ؟ : ۲۱۶
- آیت ۱۸ ۲۱۸
- بے اثر معبود ۲۱۸
- آیت ۱۹ ۲۲۰
- تفسیر ۲۲۰
- آیت ۲۰ ۲۲۲

۲۲۲	 من پسند معجزات
۲۲۳	 دو اہم نکات
۲۲۳	۱۔ آیت میں معجزے سے مراد کیا ہے:
۲۲۳	۲۔ ﴿انما الغیب للہ﴾ ”میں غیب“ کا مفہوم:
۲۲۵	آیات ۲۱، ۲۲، ۲۳
۲۲۵	تفسیر
۲۲۸	چند اہم نکات
۲۲۸	۱۔ لوگ عموماً ایسا کرتے ہیں:
۲۲۸	۲۔ ”ضراء“ کے مقابلے میں ”رحمت“:
۲۲۹	۳۔ ضمیروں کا فرق کیوں ہے؟
۲۳۰	آیات ۲۳، ۲۵
۲۳۰	دنیاوی زندگی کی دور نمائی
۲۳۲	دو قابل تو وجہ نکات
۲۳۲	۱۔ دنیا کی ناپائیداری کے لئے مثال:
۲۳۳	۲۔ ”اختلط بہ نبات الارض“ کا مفہوم:
۲۳۳	آیات ۲۶، ۲۷
۲۳۳	سفید اور سیاہ چہروں والے
۲۳۷	آیات ۲۸، ۲۹، ۳۰
۲۳۷	قیامت میں بت پرستوں کا ایک منظر
۲۳۱	آیات ۳۱، ۳۲، ۳۳

۲۳۱	تفسیر.....
۲۳۶	آیات ۳۳، ۳۵، ۳۶.....
۲۳۶	حق و باطل کی ایک پہچان.....
۲۳۸	چند اہم نکات.....
۲۳۸	۱۔ ”خدا ہی حق کی طرف ہدایت کرتا ہے“.....
۲۳۸	۲۔ مشرکین کے معبود خود ہدایت کے محتاج ہیں:.....
۲۳۸	۳۔ بت پرست گمان کی پیروی کرتے ہیں:.....
۲۳۹	۴۔ علماء اصول کی ایک بحث:.....
۲۵۰	آیات ۳۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷.....
۲۵۰	دعوت قرآن کی عظمت اور حقانیت.....
۲۵۳	اعجاز قرآن کا ایک نیا جلوہ.....
۲۵۹	جہالت اور انکار.....
۲۶۰	آیات ۳۳، ۳۲، ۳۱.....
۲۶۰	اندھے اور بہرے.....
۲۶۳	دو قابل توجہ نکات.....
۲۶۳	۱۔ ”﴿من یستمعون﴾“ اور ”﴿من ینتظر﴾“ سے کیا مراد ہے:.....
۲۶۳	۲۔ ”﴿ولو کانوا لایعقلون﴾“ اور ”﴿ولو کانوا لایبصرون﴾“ کا مفہوم:.....
۲۶۳	آیات ۳۷، ۳۶، ۳۵.....
۲۶۳	تفسیر.....
۲۶۷	آیات ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۳۹، ۳۸.....

- ۲۶۷ خدائی سزا میرے ہاتھ میں نہیں ہے
- ۲۷۰ چند اہم نکات
- ۲۷۰ ۱۔ قرآنی آیت سے غلط استدلال :
- ۲۷۱ ۲۔ دنیا میں مسلمانوں کے لئے سزا :
- ۲۷۱ ۳۔ نزولِ اعذاب کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی :
- ۲۷۲ آیات ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶
- ۲۷۲ خدائی سزا میں شک نہ کرو
- ۲۷۳ دو اہم نکات
- ۲۷۳ ایک سوال اور اس کا جواب :
- ۲۷۵ ۲۔ ”ندامت“ کا مفہوم :
- ۲۷۶ آیات ۵۷، ۵۸
- ۲۷۶ قرآن خدا کی عظیم رحمت ہے
- ۲۷۸ دو قابلِ توجہ نکات
- ۲۷۸ ۱۔ کیا دل احساسات کا مرکز ہے ؟
- ۲۷۹ ۲۔ ”فضل“ اور ”رحمت“ میں کیا فرق ہے ؟
- ۲۸۱ آیات ۵۹، ۶۰، ۶۱
- ۲۸۱ خدا ہر جگہ ناظر ہے
- ۲۸۳ چند اہم نکات
- ۲۸۳ ۱۔ قانون بنانے کا حق صرف خدا کو ہے :
- ۲۸۳ ۲۔ رزق کا نزول :

- ۳۔ علماء علم اصول کا ایک استدلال: ۲۸۳
- ۴۔ ایک درس: ۲۸۵
- ۵۔ علم الہی کے تین پہلو: ۲۸۵
- ۶۔ ہماری ہر کیفیت کی نگرانی ہو رہی ہے: ۲۸۶
- آیات ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵ ۲۸۸
- روحانی سکون ایمان کے زیر سائی ہے ۲۸۸
- دو اہم نکات ۲۹۳
- ۱۔ ”بشارت سے کیا مراد ہے؟ ۲۹۳
- ۲۔ آئمہ ہدای کی چند روایات: ۲۹۳
- آیات ۶۶، ۶۷ ۲۹۷
- عظمت الہی کی کچھ نشانیاں ۲۹۷
- چند قابل توجہ نکات ۲۹۹
- ۱۔ رات آرام و سکون کے لئے ہے: ۲۹۹
- ۲۔ ”﴿وَالنَّهَارُ مَبْصُرًا﴾“ کا مفہوم: ۲۹۹
- ۳۔ کیا آیت ہر طرح کے ظن کی نفی کرتی ہے: ۲۹۹
- آیات ۶۸، ۶۹، ۷۰ ۳۰۰
- تفسیر ۳۰۰
- چند الفاظ کا مفہوم ۳۰۲
- ۱۔ ”سلطان“: ۳۰۲
- ۲۔ ”متاع“ ۳۰۲

- ۳۔ ”نذیقھم“ ۳۰۲
- آیات ۴۱، ۴۲، ۴۳ ۳۰۳
- حضرت نوح ؑ کے جہاد کا ایک پہلو ۳۰۳
- آیت ۴۳ ۳۰۴
- حضرت نوح ؑ کے بعد آنے والے انبیاء ۳۰۴
- دو قابل توجہ نکات ۳۰۴
- ۱۔ ہٹ دھرم گروہ: ۳۰۴
- ۲۔ ”﴿کَذٰلِکَ نَطْبِعُ عَلٰی قُلُوْبِ الْمُعْتَدِیْنَ﴾“ جبر کی دلیل نہیں: ۳۰۸
- آیات ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸ ۳۰۹
- موسیٰ ؑ اور ہارون ؑ کے جہاد کا ایک پہلو ۳۰۹
- آیات ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲ ۳۱۳
- حضرت موسیٰ ؑ کے خلاف جنگ کا دوسرا مرحلہ ۳۱۳
- آیات ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶ ۳۱۶
- طاغوتِ مصر سے حضرت موسیٰ ؑ کے جہاد کا تیسرا مرحلہ ۳۱۶
- آیات ۸۷، ۸۸، ۸۹ ۳۲۰
- چوتھا مرحلہ انقلاب کی تیاری ۳۲۰
- آیات ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳ ۳۲۳
- ظالموں سے مقابلے کا آخری مرحلہ ۳۲۳
- آیات ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷ ۳۲۹
- شک کو اپنے قریب نہ آنے دو ۳۲۹

- کیا رسول اللہ کو شک تھا؟ ۳۳۰
- آیت ۹۸ ۳۳۳
- صرف ایک گروہ بر محل ایمان لایا ۳۳۳
- قوم یونس کے ایمان لانے کا واقعہ ۳۳۵
- آیات ۹۹، ۱۰۰ ۳۳۷
- جبری ایمان بے کار ہے ۳۳۷
- دو قابل توجہ نکات ۳۳۸
- ۱۔ ایک وضاحت : ۳۳۸
- ۲۔ ایک اشکام اور اس کی توضیح : ۳۳۸
- آیات ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۳۳۹
- تربیت اور وعظ و نصیحت ۳۳۹
- آیات ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴ ۳۴۲
- مشرکین کے بارے میں حتمی فیصلہ ۳۴۲
- آیات ۱۰۸، ۱۰۹ ۳۴۵
- آخری بات ۳۴۵